

Gandhi Ji Badshan Khan ke Des mein (Pyary Laal)

گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں

پیارے لال

ترجمہ: ڈاکٹر سید عابد حسین

گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں

گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیں میں

مہاتما جی کے سکریٹری شری پیارے لال کے قلم سے
ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

مکتبہ جامعہ ملیٹری
جامعہ نگر دہلی

قیمت سے

تعداد طبع ۱۰۰۰

بار اول

۱۰۰۰

شاخ بکئی

مکتبہ جامعہ ملیہ

پرنس بلڈنگ جوجی ہسپتال

بکئی نمبر ۳

شاخ دہلی

مکتبہ جامعہ ملیہ

اردو بازار

دہلی نمبر ۶

اکتوبر ۱۹۵۰ء

جید برقی پریس، دہلی

فہرست مضامین

۳	تقریب
۵	خدائی خدمت گار اور بادشاہ خاں
۱۹	پیش لفظ
۲۱	تمہید
۳۳	پہلا باب تضاد کا قانون
۴۷	دوسرا باب تاریخی جائزہ
۶۰	تیسرا باب سرطکیں اور رحلے
۷۳	چوتھا باب ایک عجیب و غریب منظر
۱۰۵	پانچواں باب دہلی سے ایک خط
۱۱۳	چھٹا باب سرحدی گاندھی کے گاؤں میں

- ۱۴۰ سائواں باب پٹھانوں کے درمیان
- ۱۴۱ آٹھواں باب گاندھی جی اور بادشاہ خاں
- ۱۴۲ نواں باب رمضان میں
- ۱۹۳ وسواں باب بنوں
- ۲۱۰ گیارھواں باب تشدد اور روحانیت
- ۲۲۷ بارھواں باب آزاد قبائل میں
- ۲۲۸ تیرھواں باب عدم تشدد کی وضاحت
- ۳۵۷ چودھواں باب جدائی
- ۲۶۶ پندرھواں باب پشاور کی کھادی کی نمائش
- ۲۷۵ سو گھواں باب ٹیکسلا (نمبر ۱)
- ۲۸۹ سترھواں باب ٹیکسلا (نمبر ۲)
- ۲۹۷ اٹھارھواں باب خاتمہ (مطلع پر بادل پھاگئے)

تقریب

گاندھی جی کی روحانی فتوحات میں صوبہ سرحد کی فتح بڑی حیرت انگیز سمجھی جاتی ہے۔ ناواقف لوگوں کو بڑا اچھٹا ہوتا ہے کہ ان کی اہنسا کی تعلیم نے جنگ جو پٹھانوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر کیسے ڈالا۔ لیکن جو لوگ اہنسا کی حقیقت سے واقف ہیں اور سرحدی پٹھانوں کو بھی جانتے ہیں ان کو اس میں کوئی تعجب کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اہنسا بہادروں کا ہتھیار ہے پٹھان صرف جنگ جو ہی نہیں بلکہ سچے معنی میں سپاہی اور اچھے ہتھیاروں کے قدرواں ہیں۔ پھر بھلا انھیں اہنسا کی شیخ جو ہر دار جس کا لہا دنیا کی سب سے بڑی سلطنت نے مانا ہے، کیوں نہ پسند آتی۔

سرحد میں گاندھی جی کی کامیابی کی ایک اور وجہ بھی ہے وہاں انھیں ستہ گرہ کی لڑائی میں ایک ایسا سپہ سالار مل گیا جس کی کھری سچائی میں کھوٹ کا نام تک نہ تھا۔ خان عبدالغفار خاں جو سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہیں چند گنتی کے آدمیوں میں سے ہیں جنھوں نے عدم تشدد کو وقتی غرض کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے قلب اور روح کے تقلضے سے اختیار کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کی آب و تاب کو سیاسی مصلحت کا رنگ

نہیں لگنے دیا۔ اور اس سے اسی طرح کام لیا جیسے گاندھی جی چاہتے تھے شاید کہنے والے یہ کہیں کہ سرحد میں اہنسا کا ظہور محض ایک وقتی چیز تھی۔ آج اہنسا کہاں ہے؟ اور ایک سرحد ہی پر کیا موقوف ہو سکتا ہے میں بھی تو کہیں نظر نہیں آتی۔

مگر یہ نظروں کی کوتاہی ہے۔ اہنسا آج بھی اس بصر میں جو کل تک ہندوستان کہلاتا تھا اس سرے سے اس سرے تک موجود ہے۔ مگر کہاں وہیں جہاں پہلے تھی۔ خدا کے چند نیک بندوں کے دلوں میں صرف اتنی بات ہے کہ ارباب سیاست جنہوں نے اسے عارضی مصلحت سے اختیار کیا تھا آج اس کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس لئے وہ ایک عام تحریک کی حیثیت سے دکھائی نہیں دیتی۔ مگر اب بھی وہ ایک قوت ہے اور جھوٹا نفرت، تعصب، ظلم کی قوتوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔

بہر حال بٹھانوں کو اہنسا کا پیام پہنچانے کی یہ داستان جو پیار لالہ جی نے لکھی ہے بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پڑھنے والے اس سے صرف لطف ہی نہیں بلکہ فائدہ بھی اٹھائیں گے۔

ذاکر حسین

جامعہ نگر
۲۲ ستمبر ۱۹۵۷ء

معرفت کرے بگاڑ دیا گیا ہے۔ وہ ہمیں چاہتے کہ پٹھان سماج کا غنڈہ بنے۔ وہ مانتے ہیں کہ پٹھان کو جاہل رکھا گیا ہے، اور اُس کی جہالت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ پٹھان اور بھی زیادہ بہادر بنے اور اس کے ساتھ ساتھ سچا گیان (علم) بھی حاصل کرے اور ان کے نزدیک یہ چیز صرف عدم تشدد سے حاصل ہو سکتی ہے۔

چونکہ بادشاہ خاں میری اہنسا پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس لیے اُن کی خواہش تھی کہ جتنے دن ہو سکے میں خدائی خدمتگاروں میں رہوں وہاں جانے کے لیے مجھے کوئی لالچ دینے کی تو ضرورت تھی ہی نہیں کیوں کہ میری تو خود ہی یہ خواہش تھی کہ خدائی خدمتگاروں کو جان لوں۔ میں ان کے دلوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں اس میں کامیاب ہو گیا۔ ہاں اس کی کوشش ضرور کی ہے۔

یہ بیان کرنے سے پہلے کہ میں نے اپنا کام کس طرح شروع کیا اور کیا کیا کام کیے، مجھے چند لفظ بادشاہ خاں کے بارے میں کہنے چاہئیں۔ میرے میزبان کی حیثیت سے سارے دؤرے میں ان کو ایک ہی فکر رہی اور وہ یہ

اہنسا یا خیراندہی ہمیں صرف انگریزوں کے ساتھ لڑنے ہی
 میں نہیں برتنی چاہیے بلکہ آپس کے برتاؤ میں بھی اس کا
 پورا پورا استعمال کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں کے
 مقابلے میں اہنسا سے کام لینا ایک لاچارمی کی خوبی ہو۔ لوگ
 آسانی سے اسے اپنی بزدلی یا کم زوری کا پردہ بنا سکتے ہیں
 یا محض مصلحت کی خاطر اختیار کر سکتے ہیں، اور اکثر ایسا ہی
 ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں ہنسا اور اہنسا میں سے کسی ایک
 کو پسند کرنے کا یکساں موقع ملے اور ہم اہنسا کو چنیں تو
 اسے محض ایک کام چلانے کی ترکیب سمجھ کر استعمال نہیں
 کر سکتے۔ ایسے موقع خانگی زندگی میں، آپس کے برتاؤ میں
 سماجی اور سیاسی تعلقات میں اکثر آتے ہیں۔ نہ صرف ایک
 مذہب کے دو فرقے بلکہ مختلف مذہبوں کے لوگ بھی ایک
 دوسرے کے ساتھ اہنسا کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے
 ہمسایوں اور برابر کے لوگوں کی بات کو برداشت نہ کر سکیں
 تو انگریزوں کے ساتھ بھی سچی رواداری نہیں برت سکتے۔
 اس لئے اگر ہمارے اندر دوسروں کی خیراندہی کا راسا
 بھی مادہ ہو تو اس کا روزمرہ امتحان ہوتا رہے گا۔ اور اگر

ہم اس پر عمل کرنے کے عادی ہو گئے تو اس سے وسیع تر میدانِ عمل میں بھی ہمیں اس کے استعمال کی عادت پڑ جائے گی یہاں تک کہ یہ ہماری فطرتِ ثانیہ بن جائے گی۔

بادشاہِ خان نے انھیں خدائی خدمت گاروں کا جو نام دے رکھا ہے، اسی سے ظاہر ہے کہ ان کا کام بنی نوعِ انسان کی خدمت کرنا ہے، انھیں نقصان پہنچانا نہیں۔ کیونکہ خدا تو نہ اپنے لیے کسی خدمت کا خواہاں ہے اور نہ کوئی ذاتی کام لیتا ہے۔ وہ خود اپنے بندوں کی خدمت کرتا ہے اور اس کے عوض کچھ مانگتا نہیں۔ اس کی ہستی اور چیزوں کی طرح اس معاملے میں بھی بے مثل ہے۔ اس لیے خدائی خدمت گار کی بھی سچی آزمائش اسی سے ہوگی کہ وہ خدا کے بندوں کی کتنی خدمت کرتا ہے۔

خدائی خدمت گاروں کی اہنسا اُن کے روزمرہ کے کاموں میں جھلکنی چاہیے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اُن کے قول، خیال اور عمل میں اہنسا ہی اہنسا بھری ہو۔ جیسے اُس شخص کو، جو اپنے روزمرہ کے کاموں میں تشدد کی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے، فوجی ٹریننگ لینی پڑتی ہے،

اسی طرح ایک خدائی خدمت گار کو ایک خاص قسم کی تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ اس کا انتظام سنہ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے خاص اجلاس میں ایک تجویز کے ذریعے کیا تھا۔ آگے چل کر اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ ضابطہ کبھی کم زور نہیں ہوا۔ ہماری خیراندیشی جیتی جاگتی ہے کہ ہمیں اس کے امتحان کے لیے چار خاص چیزیں رکھی گئیں :- فرقہ وارانہ اتحاد، ہندوؤں میں چھوٹ جھات کا مٹانا، کروڑوں انسانوں کے ساتھ اتحاد کی سچی نشانی کے طور پر گھروں میں ہاتھ سے کتے ہوئے سوت کی کھاوی بنانا اور اُس کو استعمال کرنا اور شراب بندی۔ اس چار پہلوؤں پر وگرام کو تہذیب نفس اور ملک کی حقیقی آزادی کے حصول کا یقینی طریقہ بتایا گیا تھا۔ کانگریسی اور عام لوگ اس پروگرام کو بے دلی سے چلا رہے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو انہیں اہنسا پر سچا عقیدہ نہیں یا جو طریقہ اس پر عمل کرنے کا رکھا گیا ہے اس پر بھروسہ نہیں یا دونوں کو نہیں مانتے۔ لیکن خدائی خدمت گاروں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

اس لیے ان سے یہ توقع ہو کہ اپنی صفائی قلب کے لئے
 کانگریس کے بنائے ہوئے تعمیری پروگرام پر پورا پورا عمل
 کریں گے۔ میں نے اس میں گاؤں کی صفائی، حفظانِ صحت
 اور فرسٹ ایڈ کو بھی شامل کر دیا ہے۔ ایک خدائی خدمتگار
 اپنے کاموں سے پہچانا جائے گا۔ اگر وہ کسی گاؤں میں ہو
 تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کی صفائی نہ کرے اور گاؤں
 والوں کو عام بیماریوں سے بچنے میں مدد نہ دے ہسپتال
 وغیرہ تو امیروں کے کھلونے ہیں اور صرف شہر والوں
 کے لئے ہوتے ہیں۔ بے شک کوشش کی جا رہی ہے کہ
 ملک میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے دواخانے قائم ہو جائیں
 لیکن ان کے اخراجات ہماری حیثیت سے زیادہ ہیں۔
 خدائی خدمتگار حقوڑی سی لیکن ٹھوس ٹریننگ کے بعد
 بڑی آسانی سے گاؤں کے زیادہ تر مریضوں کو عام طور پر
 مدد پہنچا سکے گا۔

میں نے خدائی خدمتگاروں کو بتایا کہ سول نافرمانی
 عدم تشدد کا پہلا قدم ہے آخری نہیں۔ یہ جانتے ہوئے
 بھی میں نے سلاطین میں اس ملک میں غلط مقام سے

کام شروع کیا۔ میں حالات سے مجبور ہو گیا تھا۔ مگر اس سے ملک کو نقصان نہیں ہوا کیوں کہ عدم تشدد کے طریق عمل کے ایک ماہر کی حیثیت سے میں جانتا تھا کہ کب اور کیسے ہمیں اپنے قدم پیچھے ہٹا لینے چاہئیں۔ پٹنہ میں سول نافرمانی کو بند کرنا اس طریق عمل کا ایک جزو تھا۔ مجھے پٹنہ میں بنائے ہوئے تعمیری پروگرام پر اب بھی اتنا ہی اعتقاد ہے، جتنا کہ اس وقت تھا۔ میں مکمل آزادی کے لئے سول نافرمانی کر ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ ہم تعمیری پروگرام پر جیسا چاہیے عمل نہ کریں۔ سول نافرمانی کا حق انھیں کو مل سکتا ہے جو اپنے یا دوسروں کے بنائے ہوئے قاعدوں پر عمل کرنا فرض سمجھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ قواعد کی پابندی خلاف ورزی کی سزا کے خوف سے نہ ہونی چاہیے نہ محض عادت کے طور پر بلکہ دل سے اور فرض سمجھ کر ہونی چاہیے۔ جب تک یہ پہلی شرط پوری نہ ہو، سول نافرمانی محض نام کی 'سول' ہوگی۔ وہ طاقت ور کا ہتھیار نہیں بلکہ کم زور کی مصلحت یا حکمت عملی ہوگی۔ اس میں اہنسا یا خیراندیشی نام کو بھی نہ ہوگی۔ خدائی خدمت گاروں نے سول نافرمانی

کی تحریک میں دوسرے صوبوں کے ہزار ہا لوگوں کی طرح
 سختیاں برداشت کر کے اپنی بہادری کا وہ ثبوت دیا، جو
 جس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ دلی خیر اندیشی کا
 یقینی اور پختہ ثبوت نہیں ہے۔ اور یہ تو ایک پٹھان کے
 لئے ذلت کی بات ہوگی کہ اس میں صرف ظاہری عدم تشدد
 ہو۔ اس لیے پٹھان میں تو کم زور ہی آتی ہی نہیں چاہیے۔

جو کچھ میں نے کہا خدائی خدمت گاروں نے بڑے
 غور سے سنا۔ یہ صحیح ہے کہ عدم تشدد پر اُن کا عقیدہ بادشاہ
 خان کی وجہ سے ہے، اور انھیں سے حاصل کیا گیا ہے، تاہم
 جب تک وہ اپنے رہنما پر کامل اعتماد رکھتے ہیں، اور
 وہ اُن کے دلوں پر پوری پوری حکمرانی کرتا ہے تب تک
 اُن کے عدم تشدد کو ادھورا یا بے جان نہیں کہا جاسکتا
 اور بادشاہ خان کا عقیدہ کوئی زبانی چیز نہیں ان کا تو
 سارا دل اسی میں لگا ہے۔ جن کو شک ہو وہ اُن کے ساتھ
 رہ کر دیکھیں جنے میں ان پانچ قیمتی ہفتوں میں رہا ہوں اُن
 کے شکوک اس طرح دور ہو جائیں گے جیسے آفتاب کے
 نکلنے سے غبار چھنٹ جاتا ہے۔

دوڑے کے آخری دنوں میں مجھے ایک پٹھان ملے۔
 ان پر میرے سارے دوڑے کا جو اثر ہوا اُس کا اظہار انہوں
 نے ان الفاظ میں کیا: "جو کچھ آپ کر رہے ہیں، مجھے پسند ہے۔
 آپ بہت چالاک ہیں (شاید "مکار" کا لفظ ان کے مطلب
 کو زیادہ صحیح طور پر ادا کرتا ہو) آپ ہماری قوم کے لوگوں
 کو زیادہ بہادر بنارہے ہیں۔ آپ انہیں اپنی طاعت کو بچا
 کر رکھنا سکھا رہے ہیں۔ بے شک یہ اچھا ہے کہ کچھ حد تک
 آدمی عدم تشدد پر قائم رہے۔ آپ کی تعلیم سے وہ ایسا کریں گے
 تشدد کے استعمال کے بغیر تشدد سے کیونکر فائدہ اٹھایا جاسکتا
 ہے، اس فن کو ہٹلر نے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن آپ ہٹلر
 کے بھی استاد بن گئے۔ آپ ہماری قوم کو عدم تشدد کی تعلیم دے
 رہے ہیں۔ مارے بغیر مرجانا، تاکہ جب کبھی تشدد کے استعمال
 کا موقع آئے تو وہ اُسے پہلے سے کہیں زیادہ زور کے ساتھ
 استعمال کر سکیں اور یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ اسے دوسروں
 سے زیادہ قابلیت سے استعمال کریں گے۔ میں آپ کو مبارکباد
 دیتا ہوں۔"

میں خاموش رہا۔ مجھے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس کا جواب

دے کر اُن کے اس وہم کو دُور کر دوں۔ میں صرف مسکرا دیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے یہ تو اچھا لگا کہ پٹھان میری تعلیم کی وجہ سے پہلے سے زیادہ بہادر ہو جائیں گے۔ ایسے کسی شخص سے میں واقف نہیں جو میرے اثر کی وجہ سے بزدل بن گیا ہو۔ لیکن ان دوست نے اس سے جو نتیجہ نکالا وہ بہت نہر ملا ہے۔ اگر آخری آزمائش میں خدائی خدمت گار اس عقیدے کو بھول گئے، جس کے ماننے کا وہ اقرار کرتے ہیں تو یقینی بات ہے کہ وہ اپنا کُودل سے نہیں مانتے، اس کا ثبوت جلد ہی مل جائے گا۔ اگر وہ تعمیری پروگرام پر جوش اور صداقت کے ساتھ عمل کریں گے تو ان پٹھان دوست نے جس خطرے کا اظہار کیا ہے وہ کبھی پیش نہیں آ سکتا۔ اس کے برعکس آزمائش کے وقت وہ سب سے بڑے بہادروں کی صف میں نظر آئیں گے۔

موہن داس کرم چند گاندھی

ابر نومبر ۱۹۳۸ء

پیش لفظ

پچھلے سال گاندھی جی کی اَلْم ناک وفات کے بعد ہمارے کئی محترم نیتاؤں اور عزیز دوستوں اور ساتھیوں نے جن کو گاندھی جی کا خاندان کہا جاسکتا ہو مجھ سے کہا کہ میں ان کی مکمل اور مستند سوانح عمری لکھنے کا مقدس فرض ادا کروں۔ اس کتاب کا خاکہ ۶ مارچ ۱۹۸۷ء کے ہر تبجن میں شائع ہوا تھا۔ مگر نو اکھالی میں گاندھی جی نے جو کام میرے اور دوسرے ساتھیوں کے سپرد کیا تھا اس کو پورا کرنے میں مجھے دس مہینے لگ گئے۔ اس کے بعد دوسرے ضروری ابتدائی کاموں میں کچھ اور وقت لگ گیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ سب مجتہدات کے مکمل ہونے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ نو جیون ٹرسٹ کی سرپرستی میں جو اس سوانح عمری کو چھاپے گا کام شروع کر دیا جائے۔

مکمل سوانح عمری شائع کرنے سے پہلے جو وقت ملا وہ میں نے گاندھی جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرنے میں صرف کیا۔ خصوصاً ایسی کتابیں جو اُن کے آخری دنوں کے واقعات سے تعلق رکھتی ہوں۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ دوسری اُن کے

”کردیا مرد“ والی مشن کے بارے میں ہوگی جس کے ذریعے وہ نواکھالی میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ تیسری کتاب میری بہن ڈاکٹر سوشیلا کی ڈائری ہے جو انھوں نے آغا خان پبلیس میں گاندھی جی کے ساتھ اکیس مہینے کی نظر بندی کے زمانے میں لکھی۔ اس کو سستا ساہت منڈل کنٹاٹ سرکس۔ نئی دہلی شائع کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بحرائی ترجمہ نوجیون پریس۔ احمد آباد سے شائع ہوگا۔

ان کتابوں کو پہلے شائع کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ دنیا کو جوہری قوت نے چیلنج دیا ہے اس کا گاندھی جی کی طرف سے جواب ان کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے سامنے یہ اسٹاک کے نظریے اور عمل کو جن کو پائیکیل تک پہنچانے کے لیے گاندھی جی نے خاص طور سے اپنی زندگی کا آخری حصہ وقف کر دیا تھا تفصیل سے پیش کرتی ہیں۔ ان کا لب لباب گاندھی جی کی مکمل سوانح عمری میں شامل کر دیا جائے گا۔

میں خاص طور سے مسٹر آر تھرمور اور مسٹر ہوس انگلینڈر کا مشکور ہوں جنہوں نے نہایت خوشی سے اس مسودہ پر نظر ثانی کرنا منظور کیا۔ میں ان فوٹو گرافروں کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب میں اپنے فوٹو شامل کرنے کی اجازت دی اور آخر میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مدد کے بغیر شاید یہ کتاب کبھی شائع نہ ہو پاتی۔

پیارے لال

ہریجن کاوٹی
کنگس وے۔ دہلی
یکم جنوری ۱۹۵۷ء

تہیہ

سندھ ۱۹۳۸ء کے موسم خزاں میں گاندھی جی ایک عرصے تک صوبہ سرحد میں ٹھہرے اور خان عبدالغفار خاں صاحب کے ساتھ صوبے کا کاؤڈرہ کیا۔ یہ گاندھی جی کے لیے ایک پرانی آرزو کی تکمیل تھی۔ اس یادگار سفر میں روض کا جو اہم ترین گاندھی جی سے ظاہر ہوتا تھا اسے میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ اس کے مشاہدہ کا شرف بڑا ہی قیمتی شرف تھا۔ میں نے اس زمانے میں اس دورہ کی داستان اخبار ہری جن کے ایک سلسلہ مضامین میں شائع کی تھی لیکن خاں صاحب کی خواہش تھی کہ اس دورے میں گاندھی جی نے جو کچھ فرمایا ہو خصوصاً خدائے خدنگاروں کے سامنے انھوں نے عدم تشدد پر جو کچھ کہا ہو وہ سب کا سب اصل صورت میں پبلک تک پہنچ جائے۔ لیکن میں دوسرے کاموں میں پھنسا رہا اور ان بابرکت اور پوسٹریٹ ایام کی کیفیت کو اس پس منظر سے دور جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، پھر اپنے اوپر طاری نہ کر سکا۔ لیکن دو مرتبہ جیل جانے کے بیچ میں خرابی صحت کی وجہ سے جو مختصر سا وقفہ ملا اس میں اس کام کی تکمیل کا موقع نکل آیا اور مجھے بڑی خوشی ہو کہ اس

فرض کو جس کے ادا کرنے کا بوجھ مجھ پر عرصے سے تھا اب ادا کر رہا ہوں۔
یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ (پہلے حصے میں "ہرزجن" کے بارے
مضمون تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ درج ہیں ان سے پس منظر سمجھ
میں آجائے گا۔ دوسرے حصے میں گاندھی جی کے اپنے ارشادات ہیں)
اس کتاب کی اشاعت کے لیے یہ زمانہ کچھ ناموزوں نہیں ہے۔
میں جو دو مرتبہ ناگپور جیل میں کانگریس کی جنگ میں شرکت نہ کرنے
والی شریک کے سلسلے میں قید رہا تو مجھے سی، پی کے کسی قومی کام
کرنے والوں اور سیاسی رہنماؤں سے قریبی میل جول کا موقع ملا۔ یہ
سب تہیہ گرمی ہی تھے، اس لیے سب کے سب عدم تشدد کی نظری اور
عملی حیثیت دونوں میں خاص دل چسپی رکھتے تھے، بار بار انتہائی
سوال اٹھتے تھے اور وہ جواب چاہتے تھے، بحثیں اور مناظرے ہوتے
تھے، جو کبھی کبھی تو ہفتوں چلتے تھے، مجھے بڑا اچنبھا ہوا یہ دیکھ کر
کہ تقریباً سب ان سوالوں کا خیال گاندھی جی نے پہلے سے کر لیا تھا اور
خدائی خدمت گاروں سے جو گفتگوئیں انھوں نے کی تھیں ان میں
ان سب کا جواب دے دیا تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ عدم تشدد کے
طریق کار پر ان گفتگوؤں سے زیادہ مکمل اور کوئی کتاب نہ ملے گی۔
لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ صوبہ سرحد میں گاندھی جی
کو عدم تشدد کا مسلک ایسے لوگوں کے سامنے پیش کرنا تھا جن
میں یہی نہیں کہ عدم تشدد کی روایات موجود نہیں بلکہ جن کی پچھلے دو

ہزار سال کی تاریخ اس مسلک کے بالکل خلاف ہے۔ ایسے لوگ جن کے لیے عدم تشدد کسی ایسی چیز کی تو سیج کا نام نہ تھا جو ان میں پہلے سے پائی جاتی تھی، بلکہ اب تک جو کچھ ان کے پاس تھا اور جیسا کچھ ان کا عمل تھا وہ اکثر و بیشتر اس اصول کی ضد تھا۔ اس لئے انہیں اس مسئلے کی الف۔ بے سے شروع کرنا ضروری تھا اور اپنے دلائل کو ایسی سادہ سے سادہ شکل میں پیش کرنا تھا کہ بچہ بھی انہیں سمجھ سکے۔ گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے جو کچھ کہا تھا اور جو ان تقریروں کا مغز ہی، اس میں انہوں نے ایک تشریح اعضا کے ماہر کی طرح عدم تشدد کی ماہیت اور اس کی بناوٹ کی تفصیلوں کو وہاں تک پرت پرت کھول کر سامنے رکھ دیا ہے کہ آخر میں آپ ان روحانی سرخیشوں تک پہنچ جاتے ہیں جو اس الہی قوت سے پھوٹتے ہیں جو روح انسانی میں پوشیدہ ہیں۔

گاندھی جی کا یہ دورہ اس وقت ہوا جب دنیا پر سیونک کے واقعہ کا سایہ پڑ رہا تھا۔ پڑھنے والے دیکھیں گے کہ اپنے ارشادات میں گاندھی جی نے بہیمی قوت کے مقابلے کے لیے جس کا ایک منظر یہ واقعہ بھی تھا) اپنے پیام کی عالمی اہمیت کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اور باتوں سے قطع نظر عدم تشدد کا ہتھیار اسی وقت کام دے سکتا ہے جب کہ وہ قوت جو مقابلہ میں ہو اخلاقی اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، لیکن

اگر کسی طاقت نے اپنی ہر شبہ زندگی میں جاری و ساری بے رحمی و
سفاکی اور پردہ پیگند اسے اپنے آپ کو تمام و کمال دنیا کی رائے
کے اثر یا اور ہر اخلاقی اثر سے "مامون" کر لیا ہو تو پھر یہ ہتھیار
کسی کام نہیں آتا۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جرمن یہودیوں کی مثال
بتائی ہے کہ اگر وہ ستیہ گرہ کرتے تو موجودہ نازی حکمرانوں کو اس میں
ذرا تاثر نہ ہوتا کہ وہ چند لاکھ یہودیوں کو مشین گن سے اس طرح
مار کر کھپا دیتے جیسے کیڑے مکوڑوں کو مارا جاتا ہے اور ہر ساری شورش اور
شورش کرنے والوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جاتا۔

یہ نکتہ چیں بھول جاتے ہیں کہ عدم تشدد اپنے عمل اور اپنی
کامیابی کے لئے کسی شکل میں بھی ظالم کی تائید کا محتاج نہیں ہوتا۔
یہ تو تمام خارجی اثرات سے بے نیاز ہوتا ہے۔ مثلاً اس میں نیرو
۱۹۴۵ء کی قوت امدادی کی کمزوری نہ تھی نہ خود اعتمادی کی کمی کہ
وہ اس "تاریکس، حقیر، توہم پرست ارتداد" کو۔ جیسا کہ اس
وقت عیسائیت کو سمجھا جاتا تھا۔ ایک قلم مٹا سکتا ہے، جس
نے اس کے ہاتھ کو اس وقت روکا تھا جب اس نے روم کے
شہینہ کھیلوں میں روشنی کے لئے عیسائیوں کو زندہ جلانے کا کام
شروع کیا تھا یا روم کے چھٹیوں والے، جھوموں کی تفریح کی
غرض سے عیسائیوں کو خونی پہلوانوں اور بھوکے شیروں کے
سامنے کو لوسیم میں پھینکا جاتا تھا۔ عیسائیوں کو وبا کے کیڑوں کی

طرح فنا کر دینا ایک بڑا قابل تعریف اور نیک کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کہ عوام کے تخیل میں یہ لوگ خود اپنی ذات سے ناپاک بغاوت کے پتلے تھے، ریاست کے بھی دشمن اور سچے دین کے بھی۔ یہودیوں کے خلاف گوئے بلز اور اشتراکشر کی کوئی استعمال انگیر تقریر شدت میں اور نفرت میں مندرجہ ذیل الفاظ سے زیادہ تو نہیں ہو سکتی جو اناطول فرانس نے پانیٹس پائلیٹ PONTIUS PILATE کی زبان سے ادا کرائے ہیں جن سے ابتدائی عیسائیوں کے ساتھ رومی حکام کے تاریخی رویہ کی سچی تصویر سامنے آ جاتی ہے :-

”ہم اُن پر حکومت نہیں کر سکتے، لہذا ہم مجبور ہوں گے کہ انہیں تباہ کر دیں اور اس میں کوئی ذرا شک نہ کرے۔ یہ ہر دم ایک نافرمانی کی سی حالت میں رہتے ہیں، ان کے مشتعل دماغوں میں ہمیشہ بغاوت کا سودا پکارتا رہتا ہے، یہ ایک دن ہم پر اس شدت سے بھٹ پڑیں گے کہ اس کے سامنے نومیدوں NUMIDIANS کا غصہ اور پارٹھینوں PARTHINS کا بلبلا نا بچوں کا کھیل معلوم ہو گا۔ یہ لوگ چھپے چھپے موبہوم امیدوں کی پرورش کر رہے ہیں اور اپنے جنوں میں ہماری تباہی کے خواب دیکھ رہے ہیں، اور کیوں نہ ہو جب کہ ایک غیبی آواز کے بھروسے پر یہ اس توقع میں زندگی کاٹتے ہیں کہ خود ان کا ایک خون شریک شہزادہ آئے گا اور اس کی حکومت سارے سنسار میں ہوگی۔ ان جلیسوں

کے ساتھ کوئی ادھوری بات تو چل ہی نہیں سکتی۔ انھیں تو بس نیست و نابود ہی کر دینا چاہیے، بیت المقدس کو بنیادوں سے مسمار کر دینا چاہیے۔ میں ہوں تو بوڑھا مگر کیا عجب ہو کہ مجھے بھی وہ دن دیکھنا نصیب ہو جب اس کی دیواریں گریں اور اس کے گھروں سے آگ کے شعلے اٹھتے ہوں، اس کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتر رہے ہوں اور جہاں کبھی عبادت گاہ تھی وہاں ہل چلا کر نمک کی کھاد بکھیری جاتی ہو۔ اس دن میں سمجھ لوں گا کہ میں حق پر تھا۔

یہ بھی نہ تھا کہ ان ابتدائی عیسائیوں کی تعداد اتنی کثیر ہو یا اور کسی حیثیت سے اتنی اہمیت رکھتے ہوں کہ رومی ظالموں کے خلاف ”تنگ کرنے والی تدبیریں“ اختیار کر سکتے ہوں۔ اور رومیوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم بھی تھی۔ اگر انھوں نے واقعی فیصلہ کر لیا ہوتا کہ عیسائیوں کو فنا ہی کر دیں تو کوئی چیز انھیں اس سے باز رکھنے والی نہ تھی۔ مگر پھر بھی انھوں نے ایسا نہیں کیا، نہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ انا طول فرانس نے، جس کے شاہکار سے ہم اوپر بھی ایک عبارت نقل کر چکے ہیں، بڑی خوبی سے رومی شہنشاہی دماغ کی اس گتھی کا خلاصہ پیش کیا ہے جو اس زنجیر کو دینے والے منظر نے اس کے اندر پیدا کر دی تھی، لکھتا ہے :-

اصیانتی اس اتم نے تو خود اپنے سپاہیوں کی ضروروں سے سیدھے
سادے انسانوں کو مرتے دیکھا ہی جو کسی ایسے مقصد کے لئے جان
دیتے ہیں جسے وہ حق جانتے ہیں۔ یہ مرجاتے ہیں اور اپنے نام تک
نہیں بتاتے۔ ایسے انسان ہماری حقارت کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ
میں اس لئے کہتا ہوں کہ ہر معاملے میں میانہ روی اور توازن دماغی
قائم رکھنا پسندیدہ چیز ہے۔ لیکن یہ اقرار ضرور کرتا ہوں کہ میرے
دل میں یہودیوں کے ساتھ کبھی بھی ہمدردی کا کوئی خاص جذبہ پیدا
نہیں ہوا۔

اس وقت جو قوت ان کے مقابلے میں تھی وہ اپنی نوعیت میں
ایسی نرالی تھی، اور جس قوت کو وہ ہمیشہ سے جانتے اور مانتے تھے
اس سے اس قدر مختلف تھی کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کیساتھ
کریں تو کیا کریں۔ انھیں خبر ہوتے ہوتے یہ ایک پوشیدہ خمیر کی
طرح سارے میں سرایت کر گئی تھی، اور اس نے سب کی ماہیت
پلٹ دی تھی۔ زندہ جلنے کے لئے خاموشی کے ساتھ جاتے وقت
عیسائی شہید کے چہرہ کی فائنٹ مسکراہٹ پہلے ان لوگوں کو حیرت میں
ڈالتی تھی، پھر انھیں سراسیمہ کرنے لگی اور آخر میں تو اس نے
ان پر خود غلط آرا کی خود اعتمادی کو کھوکھلا کر کے بالکل ہی ختم
کر دیا تھا، رومی فوج کا فولادی لباس تیرا اور نیزہ سے محفوظ
تھا مگر اس نازک قوت سے ہرگز محفوظ نہ تھا۔ یہ دھیرے دھیرے

چھپے چھپے امراء اور اشراف کے خاندانوں میں داخل ہوئی اور آخر
ایوان شاہی تک میں اس نے اپنے قدم جمائے۔

ذرا اپنے زمانے سے قریب آئیے تو جسمانی زور اور مکاری پر
عدم تشدد اور امداد باہمی کی فوقیت کے ثبوت اس مشہور عالم شہزادہ
کر و پونگن نے اپنی معرکہ الآراء کتاب "امداد باہمی بہ حیثیت ایک
عنصر ارتقاء" میں پیش کئے ہیں، قطرت کے وحشت زار میں بھی
جہان جنگل کا آئین چلتا ہی اور طاقت ور کے تباہ کن رجحانات پر
کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی "باقی رہنے کی سب سے زیادہ
صلاحیت ان میں نہیں ہوتی جو جسمانی حیثیت سے سب سے طاقتور
ہیں، یا سب سے زیادہ چالاک اور مکار ہیں، بلکہ ان میں ہوتی ہی
جو اس طرح ملنا سیکھ جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کو بدد اور سہارا
دے سکیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات بتلانے کے لیے میں نے کافی نقل کر دیا
ہی کہ عدم تشدد کے خلاف یہ جو دلیل ہی کہ جدید منظم اور کل زندگی
پر حاوی استبدادوں کی بے ضمیری اور سفاکی کے سامنے عدم تشدد
نہیں چل سکتا اس میں بڑی خامی اس وجہ سے ہے کہ ہم چیزوں کو
ان کے وسیع پس منظر کے ساتھ نہیں دیکھتے اور جماعتی مظاہر کے
ان رجحانوں پر نظر نہیں رکھتے جو اپنا اثر ذرا زیادہ دلوں میں دکھاتے ہیں۔
لیکن شک کرنے والا یہ دلیل دے گا کہ چاہے ایک مکمل خیالی

دنیا میں عدم تشدد ٹھیک سہی اور چاہیے آج بہتیرے لوگ "اٹلانٹک چارٹر" کے اس مجرد اعلان کی تصدیق کر دیں کہ "روحانی اور مادی دونوں وجوہ سے آخر کار تشدد کا ترک کرنا لازم ہے۔" پھر بھی انسانی ارتقاء کا موجودہ جھکاؤ اس کے خلاف ہی جیسا کہ ساری زندگی پر حاوی ڈکٹیٹروں کے عروج سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دلیل تبدیلی و تغیر کے اس عمل کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہے جس سے کسی صورت حال سے اس کو ضد پیدا ہوا کرتی ہے۔ قدرت کے مظاہر میں ہم صاف دیکھتے ہیں کہ جب قدرت کا کوئی میلان بڑھتے بڑھتے اپنے کمالوں کو پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ اس کے لیے تیار ہو چکتا ہے کہ یکایک جیسے ایک پھلانگ مار کر خود کو اپنی ضد میں تبدیل کر دے۔ ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہے کہ جب اسلحہ کی طاقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اس نے اپنے کو ہیبت خیزی کے ڈراوے کی شکل میں بدل دیا یعنی "اگر تم یہ جتا سکتے ہو کہ تم میں قتل کرنے کی طاقت ہے تو پھر واقعی قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" اس جنگ میں اس نئی تدبیر کو کس مہلک تاثیر کے ساتھ کام میں لایا گیا ہے؟ اس تدبیر سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ قوموں کی قوموں کو دبا کر غلام بنا لیا جائے اور اسلحہ کے استعمار کی نوبت تک نہ آئے۔ فوجی اقتدار کی آہنی ایڑی تلے مظلوم آبادیاں جوں جوں بڑھتی جاتی ہیں توں توں اس انکشاف کے لئے بھی زمین تیار ہوتی جاتی ہے کہ اگر مظلوم موت کی

طرف سے بے پروا ہو جائیں تو انھیں آزادی حاصل کرنے کے لیے غالباً مرنا نہ پڑے۔ بربادی کے آلات جس قدر تباہ کن ہو جاتے ہیں اسی قدر اس کا امکان بڑھتا جاتا ہے کہ دنیا ان کی طرف سے اپنا منہ پھیر لے اور ان کے مقابل میں ایک اور طاقت کو لا کھڑ کرے جو بالکل ہی دوسری قسم کی طاقت ہو اور جس کے خلاف یہ آلات محض بے بس ہیں یعنی ”نہیں“ کہنے کی صلاحیت۔ اسلحہ بس تباہ ہی تو کر سکتے ہیں، وہ تم سے اطاعت اور تعاون تو جبریہ حاصل نہیں کر سکتے بشرطیکہ تم میں ”نہیں“ کہنے کی طاقت ہو۔ اور یہی چیز یعنی تعاون، رضامندی کا ہو یا جبر کا، یہی چیز تو ظلم کو زندہ اور برقرار رکھ سکتی ہے اور اسلحہ کے استعمال کا بھی اصل مقصد تباہی و بربادی نہیں بلکہ اسی تعاون کا حاصل کرنا ہی۔

اس طاقت کی فتح کی سب سے پہلی اور شاید سب سے شاندار تاریخی مثال اس مقابلے میں ملتی ہے جو ٹیکسلا کے میدان میں سکندر اعظم اور ہندوستانی حکیم دامدانی میں ہوا تھا۔ یونانی وقائع نگار اس حکیم کے متعلق لکھتا ہے کہ ”اگرچہ پوڑھا تھا اور برہمنہ لیکن یہی ایک مذمقابل تھا جو قوموں کے فاتح سکندر کے لیے برابر سے زیادہ تھا“ ناظرین اس واقعہ کے داخلی معنی پر ذرا غور کریں۔ اس کے اندر مشرق کا جواب مضمر ہے جو مسیح سے تین سو سال پہلے اس مسلح قوت کو دیا گیا تھا جو مشرق پر حملہ آور ہوئی تھی۔ ہندوستان میں

یونانی قوت کی تاریخ سے اس طریق کار کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔
 آج پھر ہمیں اسی قسم کے چیلنج سے واسطہ ہے، بلکہ اس سے بھی
 زیادہ سخت چیلنج کا۔ اور پھر لوگوں کا دھیان اس آلے کی طرف اور
 قوت کے اس نہ ختم ہونے والے سوت کی طرف مڑ رہا ہے جو
 ہندوستان کو خاص طور پر اپنے ماضی سے ورثہ میں ملا ہے اور
 جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی آنے والی ترقی میں ہندوستان
 کی طرف سے ایک خاص اضافہ ہو گا۔ اس قوت کی جس کو ہندوستان
 نے پھر سے دریافت کیا ہے، ماہیت کیا ہے؟ یہ فرد میں کس طرح
 پیدا ہو سکتی ہے اور عوام میں اسے کس طرح منظم کیا جاسکتا ہے؟
 اس کے لیے کس قسم کے نظم کی ضرورت ہے؟ دوسرے نظاموں
 سے جو تشدد پر مبنی ہوتے ہیں یہ نظم کس طرح مختلف ہے؟ اس پاس
 کی دنیا سے اس عدم تشدد کے رویے کا کیا علاقہ ہونا چاہیے، اس لیے
 کہ اس پاس کی دنیا یہی نہیں کہ بے میل اہنسا کی قائل نہیں بلکہ یاد
 اس کی ضد پر یقین بھی رکھتی ہے اور عمل بھی کرتی ہے۔ اہنسا کے نئے نئے کے لیے
 چند سوالات ہیں جن کا جواب ان صفحات میں ملے گا۔

لیکن اگرچہ انفرادی طور پر اہنسا ماحول سے بے نیاز ہے اور
 ہر جگہ اس پر عمل کیا جاسکتا ہے مگر اس پر اجتماعی پیہبانے پر
 عمل کرنے کے لیے ایک خاص قسم کا سماج و رکارہ ہے عدم تشدد کا
 مطالبہ کرنے والے کے لیے دوسرا سوال قدرتی طور پر یہ پیدا ہوتا ہے

کہ جس سماج کی بنا عدم تشدد پر ہو اس کی صورت اور اس کی ذہنیت کیا ہوگی؟ اس 'نئی دنیا' کی کچھ جھلک آپ کو ان مضامین میں ملے گی جو "ٹیکسلا" پر اس کتاب کے پہلے حصے کے آخر میں درج ہیں۔ وہ بڑی ہی دل فریب دنیا ہی، جو کبھی واقعی موجود بھی تھی، سادگی کی دنیا نظری زندگی کی آزادی والی دنیا، ایمان دار اور تن درست محنت کی دنیا، ایک دنیا جس میں بہت کم قانون تھے مگر جس کا معاشرتی نظام نہایت ترقی یافتہ تھا، ایک دنیا جس میں جنگ و جدل کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور رواداری، خصوصاً مذہبی رواداری کا دور دورہ تھا۔ یہ ساری بہار عدم تشدد کے رامنی جیسے ننھے بیج سے پیدا ہوئی تھی۔

ان صفحات سے معلوم ہو گا کہ گاندھی جی اس ننھے سے بیج کو صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گاروں کے دل میں پھر بونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ناظرین اس تصویر کے داخلی معنی اور اہمیت پر غور کریں اور خود فیصلہ کریں کہ یہ اس قابل ہیں کہ انہیں کہ اسی کے لئے جیا جائے اور اسی کے لیے مرا جائے؟

پیارے لال

پہلا باب

تضاد کا قانون

صوبہ سرحد کو لوگوں نے ”دھوپ چھاؤں کی، رنج و راحت کی، رومان اور حقیقت کی، محبت اور نفرت کی، ہم آہنگی اور بے آہنگی“ غرض یہ کہ تضاد کی سرزمین کہا ہو۔ آب و ہوا کے لحاظ سے دیکھئے تو اس میں ڈیرہ جات کا جھلسا ہوا علاقہ بھی ہے جس میں قیامت کی گرمی پڑتی ہے اور ہزارہ کا صحت بخش خطہ بھی جس میں برف پوش پہاڑیاں پراجمائے کھڑی ہیں۔ قدرتی مناظر میں بھی بڑی رنگارنگی ہے۔ شمال کے خوش منظر پہاڑی علاقے میں کہیں گھنے جنگل اور کھیتوں کے سلسلے ہیں جو سیڑھیوں کی طرح درجہ بدرجہ چڑھتے چلے گئے ہیں اور کہیں گتے اور غلے کے سبز کا ہی کھیت اور میوؤں کے خوش نما باغ ہیں جو بہترین قسم کے رسیلے پیرسیب خوبانی، ناشپاتی، انگور، سنترے اور انار سے لدے رہتے ہیں۔ نمک کے پہاڑ کے پار جنوب میں چکنی مٹی کا بنجر علاقہ اور لکی اور مروت کا چٹیل میدان ہے جس کی پشتہ بندی وزیرستان کی

طوفان زدہ، بے رونق، ویران پہاڑیاں کرتی ہیں۔ ایک طرف قدرتی دولت کی افراط ہے اور دوسری طرف وہاں کے رہنے والوں کا انتہائی افلاس۔

سرحدی صوبہ کی حدود مختلف اوقات میں بدلتی رہتی ہیں۔ آریوں کے ابتدائی زمانہ میں اس کی سرحد وادی سندھ سے وسط ایشیا کے دور دراز خطے تک چلی گئی تھی اور اس میں افغانستان کے بڑے حصے اور موجودہ صوبہ سرحد کے علاوہ دریائے سندھ کی جنوبی وادی جو صوبہ سندھ میں ہے اور شاید بلوچستان بھی شامل تھا۔ چھٹی یا آٹھویں صدی قبل مسیح سے لے کر ۱۸۱۹ء تک وہ علاقہ جو اب صوبہ سرحد کہلاتا ہے ایرانی، یونانی، کشان، گپت، ترکی، غوری، مغل اور درانی سلطنتوں کا ایک جزو رہا۔ بیس سال تک سکھوں کی حکومت میں رہنے کے بعد اس حصے پر جو اب آئینی اضلاع کے نام سے موسوم ہے انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

افغانستان سے گندمک کا صلح نامہ ہونے کے بعد جو سرحد مقرہ ہوئی اس کی وجہ سے قندھار کے قدیم صوبہ کا آدھا حصہ بھی برطانوی ہند میں شامل ہو گیا۔ نئی حد جو ڈوہ پور لائن کہلاتی ہے ۱۸۹۴ء میں اس طرح مقرہ ہوئی کہ کوہ سلیمان کی سب سے اونچی پہاڑیوں کے برابر برابر چلی جائے۔ اس کے بعد وہ

سب قبائل جو خیبر، ہمند، تیرہ، قرم اور وزیرستان میں رہتے تھے انگریزوں کے حلقہ اثر میں آ گئے۔

اس کا عجیب و غریب نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ سرحد کی دو حدیں قرار پائیں۔ ایک تو ڈیورنڈ لائن جو برطانوی ہند کو افغانستان سے جدا کرتی ہے اور دوسری انتظامی جہاں سے اصلی انگریزی علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جو علاقہ ان دونوں کے درمیان واقع تھا اور قبائلی علاقہ کہلاتا تھا اس پر دراصل کسی کا قبضہ نہیں تھا۔ وہ ”نقشے پر تو ہندوستان کا ایک حصہ تھا مگر دراصل برطانوی ہند میں شامل نہ تھا“ اس کے باشندے براہ راست تاج برطانیہ کی رعایا نہیں تھے اور انھوں نے اپنے علاقے کا الحاق نہیں ہونے دیا۔ وہاں شاہ برطانیہ کا حکم نہیں چلتا تھا لیکن انگریز اسے اپنا ”علاقہ زیر حمایت“ کہتے تھے اور ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اس کے باشندوں میں ”امن قائم کرنے کے لیے“ ہوائی جہاز سے گولہ باری کرنے کا اخلاقی حق رکھتے ہیں۔

آجکل صوبہ سرحد کا نقشہ یہ ہے کہ اس کی شمالی حد کوہ ہندوکش ہے، جنوبی حد بلوچستان اور پنجاب کا ضلع ڈیرہ غازی خان ہے، مشرقی حد کشمیر اور پنجاب ہے اور مغربی حد افغانستان ہے۔ وسعت کے لحاظ سے وہ چیکو سلوواکیہ سے تین ہزار مربع میل بڑا ہے یعنی اس کا مجموعی رقبہ اڑتیس ہزار مربع میل ہے۔ وہ تین جغرافی خطوں

پر مشتمل ہے (۱) ضلع ہزارہ کا وہ حصہ جو دریائے سندھ کے اُس پار واقع ہے۔ (۲) دریائے سندھ اور پہاڑوں کے درمیان کی پتلی پٹی جس میں پشاور، کوہاٹ، بنوں، مردان اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے آئینی ضلع شامل ہیں (۳) وہ ناہموار پہاڑی علاقہ جو ان ضلعوں کے اور افغانستان کی سرحد کے درمیان ہے۔ اس میں سے ایک تہائی سے کچھ زیادہ یعنی تیرہ ہزار ایک سو ترانوے میل کے علاقے میں چھ آئینی ضلع پھیلے ہوئے ہیں۔ باقی دو تہائی یعنی تقریباً پچیس ہزار مربع میل میں قبائلی علاقے اور آزاد علاقے کے قبیلے بستے ہیں جنہوں نے کوئی سو سال تک انگریزوں کی مزاحمت کی اور ان کو اپنے دیس پر قبضہ نہیں کرنے دیا۔ موخر الذکر علاقہ (تقسیم ہند سے پہلے) پانچ پولیٹیکل ایجنسیوں یعنی ملاکنڈ، قرم، خیبر، لوچی، دانا اور قشمتوں (۱) آئینی اضلاع (۲) قبائلی علاقہ (۳) آزاد علاقہ جسے سرحد پار کا علاقہ بھی کہتے ہیں اور (۴) چترال، دیر اور سوات کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔

یہ صوبہ اب تک "اچھوتی زمین" ہے۔ وہ طرح طرح کی معذرتا سے الامال ہے جن سے اب تک فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں۔ پہاڑی نمک، تیل، سیمنٹ، سنگ مرمر، گندھک، کوئلہ، اور رانگ۔ یہاں مزدوری بہت سستی ہے اور پانی کے بے انتہا خزانے موجود ہیں۔ جاڑوں کی خاص فصلیں

مکی اور جو اور موسم بہار کی گہیوں، جو اور چنا ہیں۔ چاول اور گنا
 زیادہ تر ہزارہ، پشاور اور بنوں ضلعوں کی نہری زمین میں پیدا
 ہوتا ہے۔ پشاور ضلع کی چاہی اور نہری زمین میں اچھی قسم کی کپاس
 اور تمباکو بھی اگتی ہے۔ سرحد پار کے علاقے میں سوات، قرم
 اور ٹوچی دریاؤں کی وادیوں میں دھان کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔
 جغرافیہ طبعی کے لحاظ سے اس صوبہ کا نقشہ حسب ذیل ہے:-
 ضلع ہزارہ ایک گاؤ دُم پٹی کی شکل میں شمال مشرق کی طرف
 ہمالیہ کے بیرونی سلسلے تک چلا گیا ہے اور وادی لگن کے سرے
 پر پتلا ہوتے ہوئے ایک نقطہ سا بن گیا ہے۔ اس میں تحصیل ہاشمرہ
 اور ایٹ آباد کا پہاڑی علاقہ بھی شامل ہے اور تحصیل ہری پور کا
 سیراب میدانی علاقہ بھی۔ یہی خطہ تھا جہاں قدیم زمانے میں دریائے
 سندھ کے اس پار کی ریاست دکنشا سیلا یا ٹیکسلا واقع تھی جسے
 سکندر اعظم نے فتح کیا تھا۔ پہاڑوں کے سلسلے جن کے درمیان لگن
 کی تنگ گھاٹی واقع ہے، جنوب کی طرف اس ضلع کی سرحد تک
 چلے گئے ہیں۔ جا بجا ان پہاڑوں کے درختوں سے ڈھکے ہوئے
 تیلے حصے آگے کو نکلتے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ علاقہ بہت سی
 تنگ وادیوں میں بٹ گیا ہے۔ یہ ضلع ایک بہت اچھی صحت گاہ
 ہے جہاں بہترین قسم کے شیریں پھل، آڑو، آلو بخارا، سیب، ناشپاتی
 خوبانی، انگور، سنترے اور انار کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور

ایسے خوش نما مناظر ہیں کہ دنیا میں بہت کم ہوں گے۔

دریائے سندھ اور پہاڑوں کے درمیان کا علاقہ تین میدانوں یعنی پشاور، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں پر مشتمل ہے جنہیں کوہاٹ کی پنجی پہاڑیاں اور نمک کے پہاڑوں کے آگے نکلے ہوئے حصے ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ پشاور کی وادی کا بہت بڑا حصہ سیراب اور درختوں سے ڈھکا ہوا ہے اور بہار خزاں کے موسم میں ”ناہموار پہاڑیوں کے چوکھٹے میں غلے کی بالیوں سے پہلہاتے ہوئے کھیتوں اور میوے کے شگفتہ باغوں کی ایک دلکش تصویر پیش کرتا ہے۔“ پشاور سے بالکل ملا ہوا کوہاٹ کا ضلع ہے بس ایک جواکی پہاڑی بیچ میں ہے۔ یہ ضلع ”ایک ناہموار پہاڑی علاقہ ہے جس کے بیچ بیچ میں تنگ گھاٹیاں واقع ہیں۔“..... کوہاٹ کی پہاڑیوں کے آگے کو نکلے ہوئے حصے جنوب کی طرف رفتہ رفتہ نیچے ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بنوں کے میدان سے مل جاتے ہیں۔ یہ دریائے قرم سے سیراب ایک ایسا خطہ ہے جو زرخیزی میں آپ اپنی مثال ہی اور کوہاٹ کی بنجر پہاڑیوں کے مقابلے میں ایک عجیب متضاد منظر پیش کرتا ہے۔..... اس کے جنوب میں مروت کا وسیع چورس میدان ہے ”جو لکئی سے شیخ بودن پہاڑ کے دامن تک پھیلا ہوا ہے۔“ ”رتیلے پتھر اور جھے ہوئے ذرات کے تودوں کا ایک سلسلہ جو بیچ بیچ میں ٹوٹ جاتا ہے بنوں کے

میدان کو ڈیرہ اسماعیل خاں کے دمن یا میدان سے الگ کرتا ہے۔
 ”اس کا بڑا حصہ ایک چکنی مٹی کا چٹیل میدان ہے۔ یہ ان سیلابوں
 کی مٹی کے جمع ہونے سے بنا ہے جو مغرب کی طرف سے کوہ سلیمان سے
 آتے رہے ہیں۔“

جو پہاڑی علاقہ آئینی اضلاع اور افغانستان کے درمیان واقع
 ہے اس کے انتہائی شمال میں دیر، سوات اور چترال ایجنسیاں ہیں۔
 چترال کے نیچے دیر اور باجوہ کے ”عمار تی لکڑی کے گھنے جنگل“
 واقع ہیں..... اس ایجنسی اور خیبر کے درمیان ہمند کی پہاڑیوں
 کا ناہموار علاقہ ہے۔ خود خیبر ”ایک چھوٹا تنگ اور تاریک درہ ہے جس
 میں کھیتی برائے نام ہے“ لیکن قلعوں، چوکیوں اور بارہ کوں کا جال
 پھیلا ہوا ہے، خیبر کے مغرب اور شمال مغرب میں آفریدی اور
 گزنی قبائل کے دیس ہیں۔ قرم کے جنوب میں ”وزیری پہاڑیوں
 کے بے ترتیب ٹیلے“ ہیں شمال میں انھیں وادی ٹوچی اور وہ گھاٹیاں
 کاٹی ہیں جن سے گزر کر جنوب میں وانا کا میدان آتا ہے۔ یہ خشک
 پہاڑیاں زیادہ تر بے آب و گیاہ ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ان کے
 درمیان زرخیز اور سیراب وادیاں ہیں مثلاً شوال کے گرد درویش
 خیل کی چراگاہ جو گھنے جنگلوں سے پٹی پڑی ہے۔

سیاسی اعتبار سے تقسیم ہند سے پہلے یہ صوبہ چار حصوں میں
 میں بٹا ہوا تھا (۱) چھ آئینی اضلاع یہ کم و بیش اس علاقے پر

شتمل ہیں جو ۱۸۹۲ء میں انگریزوں نے سکھوں سے لے لیا تھا اس
کی آبادی تقریباً پچیس لاکھ تھی۔ (۲) قبائلی علاقے کی پٹی جس کی
آبادی کوئی تیرہ چودہ لاکھ تھی۔ یہ آئینی اضلاع کی سرحد سے کرآنند
علاقے کی سرحد تک چلی گئی تھی۔ یہ علاقہ آئینی اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کی
سیاسی نگرانی میں تھا جو آزاد قبائل کے انتظام کے بارے میں حکومت ہند
کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سامنے جواب دہ تھے۔ (۳) شمالی ریاستیں جو
ملاکنڈ بھٹی کے علاقے میں تھیں یعنی چترال، دیرا ورسوات۔ ان کی مجموعی
آبادی ساڑھے نو لاکھ تھی۔ (۴) قبائلی پٹی اور ڈیونڈر لائن کے درمیان کا
علاقہ جسے آزاد علاقہ کہتے تھے۔ اس میں کوئی پانچ ساڑھے پانچ لاکھ پٹھان آباد
تھے جن کی بڑی تعداد تیرہ اور وزیرستان میں رہتی تھی۔

صوبہ سرحد کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد پٹھان ہے۔ لفظ
پٹھان کا اطلاق ہر اس قبیلے پر ہوتا ہے جو پشتو (پختو) زبان بولتا
ہے۔ اسے نسل سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اس کا استعمال صوبہ سرحد
کے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور خدائی حدنگاروں
کی تحریک شروع ہونے کے بعد اکثر ہوتا بھی تھا سرحد پار کے قبائلی
علاقے کے پٹھان اپنے ان بھائیوں سے جو آئینی اضلاع میں رہتے
ہیں زیادہ جفاکش اور جنگ جو ہیں۔ ان کی قبائلی پٹی اصل صوبہ
سرحد اور ڈیونڈر لائن کے درمیان کا پہاڑی علاقہ ہے۔ اس میں چار
بڑے قبیلے یعنی آفریدی، ہمند، وزیری اور محسود آباد ہیں۔ ان

کے علاوہ اور قبائل یعنی کزئی، یوسف زئی، بھٹانی اور شنواری وغیرہ بھی ہیں۔

شمال سے چلئے تو بوز اور پشاور کی گھاٹی سے آگے کے علاقے میں یوسف زئی رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بوز کے یوسف زئی گفتیشا پرہیزگار اور انتہا درجے کے مہمان نواز ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی ایک حجرہ یا مہمان خانہ ہوتا ہے۔ وہ بڑے محبت من ہیں اور انھیں اپنی شرافت نسب کا بڑا دعویٰ ہے (جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے ہیں)۔

پشاور کے شمال مغرب میں دریائے کابل اور دریائے سوٹ کے درمیان ہمند رہتے ہیں۔ ان کی خانگی زندگی یوسف زئیوں کی طرح ہے البتہ ان کے ہاں حجرے یا مہمان خانے نہیں ہوتے۔ خیبر کے اُدھر جنوب کی طرف بے چارے بدنام آفریدی رہتے ہیں جنھیں واقعات کے جبر نے ”دُنیا بھر سے بدگمان کر دیا ہے“ لیکن کہا جاتا ہے اگر یہ بدگمانی ایک بار دور ہو جائے تو آفریدی میں وفاداری کی اتنی صلاحیت ہے کہ وہ آپ کا بڑا پکا دوست بن سکتا ہے۔ وہ چھریوں اور مضبوط جسم کا ہوتا ہے۔ اس کی عقاب جیسی تیز آنکھ، اس کا مفرد رائے انداز اور ”سبک رفتار“ اس کی

ملک شمال مغربی سرحد کا مسئلہ انڈیا کا لی ڈیوینہ۔

آزادی کی منظر ہے جو پہاڑ کی کھلی کھلی گھاٹیوں کی پیداوار ہے۔ آفریدیوں نے ان دونوں لڑائیوں میں جو انگریزوں اور افغانوں میں ہوئی تھیں اور ۱۹۳۷ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں بہت اہم حصہ لیا تھا۔ پشاور اور آئینی اضلاع کے دوسرے حصوں میں خدائی خدمت گاروں پر جو وحشیانہ مظالم کئے گئے تھے اس کی وجہ سے ان میں بڑی تل چل چل گئی تھی۔

گاندھی اردن صلح کے زمانے میں آفریدیوں کے بارے میں ایک دلچسپ روایت مشہور تھی جس سے ان کی سادہ دلی کا اندازہ ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ پولیسکل افسروں سے ان کی جو گفت و شنید ہوئی تھی اس میں ان کی طرف سے صلح کی یہ شرطیں کی گئی تھیں کہ حسب ذیل اشخاص کو رہا کر دیا جائے۔

(۱) بادشاہ خاں (عبدالغفار خاں)

(۲) ملنگ بابا (گاندھی جی)

(۳) انقلاب

اس زمانے میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ بہت عام تھا۔ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی کسی محب وطن کا نام ہے جسے برطانوی حکومت نے قید کر دیا ہے۔

تیرہ کے جنوبی دیہات میں مختلف قبائل رہتے ہیں جو مجموعی اور کزنٹی یا کھوئے قبائل کہلاتے ہیں۔ قرم اور گومل کے درمیان

وزیرستان واقع ہے جسے صوبہ سرحد کا سوئزرلینڈ کہنا چاہیے۔ یہ پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک بھول بھلیاں سی ہی جس میں وزیری رہتے ہیں۔ چونکہ وہ سخت اور ناہموار پہاڑیوں کے درمیان رہتے ہیں اس لیے ان کی سیرت میں بھی اپنے ماحول کی بے لوث تندی اور سختی آگئی ہے۔ وزیریوں کی ایک شاخ محسود ہے جو ”سرحد ڈیرہ جات کی بلا“ کہلاتی ہے۔ یہ وزیرستان کے قلب میں رہتے ہیں۔ بھٹانی اس علاقے میں آباد ہیں جو وزیرستان کی مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ گومل سے مروت تک چلا گیا ہے۔ ان میں اور محسودوں میں پرانا ”خونی بیر“ چلا آتا ہے۔ بنوں سے لے کر کوہاٹ کے دوسرے سرے تک کھٹک قبائل کا دیس ہے۔ یہ لوگ بڑے محنتی اور جفاکش ہیں ان کا مشغلہ یا تو کھیتی ہر یا نمک کی تجارت۔ بنوں میں بتوچی اور مروت قبائل رہتے ہیں جو پٹھانوں میں سب سے زیادہ مخلوط النسل ہیں“ ان میں ڈیرہ اسماعیل خاں کے ہموار اور چٹیل“ میدان میں زیادہ ترجاٹ رہتے ہیں۔ پٹھانوں کی آبادی صرف ایک ہتائی ہے۔ اسی طرح ہزارہ کے ضلع میں بھی زیادہ تر آبادی غیر پٹھانوں کی ہے جن میں پنجابی مسلمان، لکھر اور سید وغیرہ شامل ہیں۔

کھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب قبائلی پکے سنی مسلمان ہیں یعنی وہ حضرت محمد کے سب خلفاء کو تسلیم کرتے ہیں اور قرآن کے علاوہ

احادیث یعنی پیغمبر اسلام کے اقوال کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں۔
 پٹھانوں میں بچپن کی سی سادگی اور خوش مزاجی پائی جاتی ہے۔ انھیں
 موسیقی، شاعری اور لوک ناچ کا بڑا شوق ہے اور جب مزے میں
 ہوتے ہیں تو اظہارِ مسرت کے لیے بندو قوں کے فیر کرتے ہیں۔
 لوک ناچ میں عورتوں کے پاؤں ہمیشہ مرد ادا کرتے ہیں۔ ان کے
 پسندیدہ یاجوں میں نقارہ، بانسری (سرنائے) اور ایک قسم کا
 بین ہے۔ لوک ناچ کی مختلف قسمیں ہیں جن میں غالباً کھٹک ناچ
 سب سے زیادہ دل کش ہے۔ ان ہی کھٹک رقصوں کے متعلق
 آج ایک انگریز مصنف لکھتا ہے: ”وہ پیر ٹپک رہے تھے اور
 کو در رہے تھے۔ کبھی ہاتھی کی سی قوت سے اور کبھی غزالوں کی سی
 نزاکت سے۔“ آگے چل کر اُس نے کہا ہے ”بولوڑ کی“ سب سے
 پیش پیش تھی کی خوش ادائی اور پھرتی میرے پرواز خیال سے
 بڑھ کر بھتی۔ سنسکی، میسن، جوس اور دوسرے رفاہ جن کا میں
 بہت قائل ہوں کیا جانیں کہ ایک دور دراز ملک میں ان کے
 مد مقابل موجود ہیں۔“

پٹھانوں کی زبان پشتو یا پختو کہلاتی ہے۔ یہ سنسکرت سے
 نکلی ہے اور اس سے بہت مشابہ ہے۔ اس کا اچھا خاصا ترقی یافتہ

ادب موجود ہے اور اس نے متصوفانہ اور وطن پرستانہ شاعری کے بعض حیرت انگیز نمونے پیدا کئے ہیں۔ سب سے مشہور مصنفوں میں جنگ جُو شاعر خوشحال کھٹک (۱۶۳۷ء تا ۱۶۷۷ء) اور جتید صوفی عبدالرحمن بابا گزرے ہیں۔ پٹھانوں کو اپنی زبان سے بڑی محبت ہو اور اگر کوئی اُن سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کرے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔

برطانوی عہد میں قبیلوں کا اندرونی انتظام جرگے کے اصول پر قبائلی سرداروں کی نگرانی میں ہوتا تھا جو ملک کہلاتے تھے۔ جرگے کے معنی ہیں بڑے بوڑھوں کی پنچایت۔ جتنی زیادہ کسی قبیلے میں جمہوریت ہوتی اتنا ہی اس کا جرگہ بڑا ہوتا۔ چنانچہ جرگے میں کل بالغ مرد شامل ہوتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ قبائلی جرگہ خصوصاً ایجنسی کے علاقوں میں نوجوان برطانوی افسروں کے لیے اعلیٰ درجے کے حکمت عملی کے مدرسے کا کام دیتا تھا۔

سرحد کی حفاظت کا جو طریقہ برطانوی حکومت نے اختیار کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ سرحد پار کی فوجی خدمات اور غیر اہم وادیوں کی جو کی داری خاصہ داروں یعنی مقامی سپاہیوں کے سپرد کرتے تھے اور قبائلیوں اور ان کے سرداروں کو امن قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے وظیفے دیتے تھے۔ یہ وظیفوں کا طریقہ دراصل درویشوں میں آکر وظیفے دینے یا رشوت دینے کا ایک خوش نما تمام تھا اور اس کے حامیوں میں برطانوی سامراج کے علم بردار مشمل

ڈیویز، بروس اور سرائیکل اڈائر وغیرہ شامل ہیں۔
 افغانستان، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی آبادی کے درمیان
 ہندوؤں اور سکھوں کی بستیاں بھی موجود تھیں۔ آئینی اضلاع کی
 چوبیس پچیس لاکھ آبادی میں ان کی مجموعی تعداد دو لاکھ کہی جاتی تھی۔
 لیکن ان کی اہمیت کا اندازہ ان کی تعداد سے نہیں ہو سکتا۔ ہندوؤں
 کے سرحدی علاقہ کی قریب قریب ساری تجارت ان کے ہاتھ میں
 تھی۔ دراصل ان کا وجود ایک معاشی ضرورت تھا۔ یہ ساہوکارہ
 کرتے تھے، مال رہن رکھتے تھے اور سناہ کا کام کرتے تھے۔ ان
 کی ہر قسم کی دوکانیں خصوصاً غلے اور کپڑے کی، ہر جگہ پائی جاتی
 تھیں۔ مجموعی طور پر ان کے تعلقات آزاد علاقے کے قبائل سے
 پُر امن تھے۔

سلسلہ "ان وظیفوں میں خرچ تو ضرور ہوتا ہے اور شاید خوردہ گیر انھیں دھونس
 میں آکر روپیہ دینا سمجھیں" تاہم یہ تعزیری ہموں سے بہت بہتر ہیں جن
 پر کہیں زیادہ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔"

(شمال مغربی سرحد کا مسئلہ از ڈیویز صفحہ ۳۳)

دوسرا باب

تاریخی جائزہ

صوبہ سرحد کی دلکش کہانی

اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے صوبہ سرحد نے ہندوستان کی تاریخ میں اہم حصہ لیا ہے۔ اس صوبہ کی کوئی معین حدود نہیں ہیں۔ یہ پہاڑوں کا ایک منطقی پٹی ہے جس کی چوڑائی مختلف ہے اور لمبائی بارہ سو میل ہے۔ یہ ایک سنگی دیوار ہے جس سے بیرونی حملہ آوروں کا گزرنا سوا خیر، قرم، ٹوچی، گول اور بولن کے دروں کے قریب قریب ناممکن ہے۔ یہی "شمالی مغربی پھاٹک" ہے جس سے بیرونی حملوں کی لہریں یکے بعد دیگرے ہندوستان پہنچیں اور انھوں نے اس صوبے کو "بدیسی جہگوں کا کارواں سرائے" یا دوسرے الفاظ میں بہت سی ایشیائی نسلوں کا عجائب خانہ بنادیا۔ یورپ کی بحری طاقتوں کے ہندوستانی ساحل پر پہنچنے کے

بعد بھی صوبہ سرحد کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک صدی تک وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی خارجی پالیسی پر چھایا رہا۔ صوبہ سرحد اور اس کے متصل قبائلی علاقے کو "ایک آتش گیر بارود کے ذخیرے" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ برطانوی سامراج کے ماہرین حرب کے لیے آزاد علاقہ جس کے پیچھے دعویٰ آزادی کی تائید کے لیے کوئی طاقت نہیں تھی ایک "غیر مقبوضہ" علاقہ تھا۔ جس کو وہ اپنی فوجوں کی جنگی تربیت کے لیے تختہ مشق کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ مشق سرحدی لڑائیوں اور جنگی مہموں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ فوج کے نوجوان عرصہ مندا فرسے ایک بہترین شکار گاہ سمجھتے تھے جہاں بین الاقوامی ضابطوں کی رکاوٹ سے آزاد ہو کر وہ اپنے طور پر تھوڑا بہت قتل و غارت کر لیا کرتے تھے۔ تاکہ کچھ جنگی تجربہ حاصل ہو جائے۔ دراصل کسی نوجوان افسر کی ٹریننگ اس وقت تک نامکمل سمجھی جاتی تھی جب تک وہ صوبہ سرحد میں کچھ دن تک جنگی خدمت انجام نہ دے چکا ہو۔ صوبہ سرحد پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک طلسمی حصار تھا جس میں اس کی خاص برادری کے باہر کا کوئی شخص قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ امن کے زمانے میں جب کہ برطانوی افسروں کے لیے میدان جنگ میں جو ہر دکھانے کا موقع نہیں ہوتا تھا، امتیاز حاصل کرنے کے لیے ایک اچھا میدان تھا۔

اس سیاسی رازداری کی بدولت جو "پولیٹیکل اور فوجی افسروں

کے اس خلوت خانے "میں چھائی ہوئی تھی، ہندوستان کے عام لوگوں کو کچھ دن پہلے تک اس کا کچھ علم نہ تھا کہ یہ علاقہ کیا ہے، اس کے رہنے والے کون لوگ ہیں، ان کی رسوم و روایات، ان کی امیدیں اور حوصلے کیا ہیں اور ان کی زندگی کی تشکیل کون سی قوتوں نے کی ہے۔ مغربی ملکوں کے عام لوگوں کے لئے صوبہ سرحد محض اس سرزمین کا نام تھا جہاں "دنیا میں سب سے زیادہ قتل ہوتے ہیں۔" ان کے نزدیک وہ جادوگرئی کا کڑھاء جس میں فتنہ و فساد کا حریر پکتا رہتا ہے اور اس میں بسنے والا پٹھان ایک لٹیر جس کی "رگوں میں صدیوں کی مطلق العنانی کا خون" دوڑ رہا ہے۔ جس کا محبوب مشغلہ خون کا بدلہ لینا ہے اور جس کا خاص پیشہ اور آمدنی کا ذریعہ چھاپہ مارنا، اغوا کرنا اور قیدیوں کا ذریعہ وصول کرنا ہے۔ "پہلے سرے کا بد معاش، دغا باز، بے رحم، کینہ پرور، خوشخوار" یہ ہیں وہ الفاظ جو اس کے لیے استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے ساتھ تقریباً ایک صدی سے کیا برتاؤ ہوتا رہا ہے۔ اس کو کس کس طرح ستایا گیا، دبا یا گیا، اور دھوکا دیا گیا۔ اس سے بین الاقوامی سیاست کی بساط پر ایک مہرے کا کام لیا گیا۔ "اس کا مغزورانہ انداز اور اس کے مضبوط قدم، اس کی فوجی صلاحیت اور آزاد طبیعت، اس کے بے تکلف اور بے بناوٹ اطوار، اس کی غیروں کے تسلط سے نفرت، اس کی

حیرت انگیز جفاکشی " وہ صفات ہیں جس کا ڈیویڈ سے لے کر اب تک سب مصنفوں نے ذکر کیا ہے۔ لیکن مغربی ملکوں میں کتنے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس صوبے نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں کتنا بڑا حصہ لیا، کس طرح ۱۹۱۷ء کے بعد عدم تشدد کی زبردست تحریک چلائی، اور یہ ثابت کر دیا کہ بہادر پٹھان جو چھاپہ مار لڑائی میں بے نظیر ہے، پہاڑی جنگ میں سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے " سپاہیانہ جرات، جنمائی طاقت اور برداشت، بے مثل نشانہ بازی اور سپہ گری کے کمال میں دنیا بھر میں مشہور "مسکینوں اور خاکساروں کی صف میں بھی پیش پیش ہے اور اس بے تشدد شجاعت میں بھی کمال رکھتا ہے جو روحانی ہتھیار کے سوا اور کسی ہتھیار سے کام نہیں لیتی اور جسے کوئی مادی ہتھیار مغلوب نہیں کر سکتا۔

صوبہ سرحد ہندوستان کی طویل تاریخ سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہے۔ اشوک کی لافانی یادگاریں جو اس میں بکھری پڑی ہیں بودھ مت کی شوکت و عظمت کی شہادت دیتی ہیں جو کسی زمانہ میں اس علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پشاور، کنشک کی بودھ سلطنت کا جو وندھیا چل سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی، دارالسلطنت تھا ٹیکسلا میں، جو اپنے زمانے میں مشرق کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی، دور مشرقی اور مغربی ملکوں سے یاتری اور طلبہ علم اور ایوان

کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ آگے چل کر چوتھی صدی عیسوی میں جب بہار میں مشہور نالندہ پونی ورستی قائم ہوئی تھی تو وہاں اکثر طالب علم بدھ سلطنت کے اسی حصے سے جایا کرتے تھے جو تین بڑی ہندوپا یعنی ہندوستانی، چینی اور یونانی رومی ہندیوں کا سنگم تھا۔ اسی راستے سے ہندوستان نے اپنا مذہب اور آرٹ کا شاندار پیام دور مشرق کے ملکوں میں بھیجا تھا۔

اس علاقے کی جو آج کل صوبہ سرحد کہلاتا ہے پہلی جھلک ہمیں آریوں کی اس ہجرت کے سلسلے میں نظر آتی ہے جو ہندو کش کے برون پونش پہاڑوں کی راہ سے ہندوستان میں ہوئی تھی۔ یہ لوگ دریائے جیحوں سے ہرات تک آئے اور وہاں سے ایک شاخ غزنی اور پابل سے ہو کر اور دوسری قندھار اور کوہ سلیمان سے گزر کر اس علاقے میں پہنچی جسے دریائے سندھ سیراب کرتا ہے۔ مشہور اور معروف رزمیہ نظم ہا بھارت میں جس کی تصنیف کا زمانہ ۳۰۰ ق م کے لگ بھگ سمجھا جاتا ہے، مشہور ہیروئن گندھاری، (گندھار یعنی پشاور کی رہنے والی) کا ذکر آتا ہے جو ہستنا پور (جسے اب دہلی کہتے ہیں) کے حکمران کوریوں کی ماں تھی یمنسکرت کا نامور مخوی بنسی جو غالباً دنیا کا سب سے بڑا عالم نحو تھا اسی علاقے میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ کہا جاتا ہے کہ پشاور کی بنیاد پر شورام یعنی اس زہر دست برہمن سپہ سالار نے ڈالی تھی

جس کا ذکر ہندوستان کی دوسری رزمیہ نظم رامائن میں آیا ہے۔
 پانچویں صدی ق۔م کے ملگ بھگ ایران کے بادشاہ سائرس نے
 اس علاقے پر فوج کشی کی جو اب افغانستان اور بلوچستان کہلاتا ہے
 اور دارائے اول نے گندھار پر (جو اب پشاور اور راولپنڈی
 کے ضلعوں پر مشتمل ہے) قبضہ کر لیا۔ ذرکسینز نے جب یونان پر
 حملہ کیا تو اس صوبے نے اس کے لیے فوج بھیجا کی۔

۳۲۶ ق۔م میں یونانیوں نے سکندر اعظم کی سرکردگی میں
 ہندوستان پر حملہ کیا اور وادی پشاور کو فتح کر لیا۔ یہاں اس زمانے
 میں ایک راجا کی حکومت تھی جس کی راج دھانی پشکروتی (موجودہ
 چارسدہ) دریائے کابل کے کنارے تھی۔ سکندر نے اسے اپنی سلطنت
 کا ایک صوبہ بنا کر ایک مقدونی افسر فلپ کو اس کا گورنر مقرر
 کر دیا۔ ٹیکسلا (جو اس زمانے میں بودھ علوم کا بہت بڑا مرکز تھا)
 کے ہندو راجہ نے جس کی اپنے ہم سایہ راجہ پورس سے مخالفت تھی،
 سکندر سے درخواست کی کہ وہ اس کے حریف پر حملہ کرے۔ پورس
 کو لڑائی میں شکست ہوئی مگر سکندر اسے اس کا راج واپس دے کر
 آگے بڑھتا ہوا بیاس تک پہنچا۔ لیکن اس کی فوجوں نے مگدھ کے
 زبردست راجا کے مقابلے تلے لیے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا
 اور سکندر کو واپس ہونا پڑا۔ اس کے مرنے کے بعد ۳۲۵ ق۔م
 میں ٹیکسلا کے صوبہ دار ابھی اور پورس کو جنھیں یونانیوں کے حملے

نے کمزور کر دیا تھا، چندر گپت نے مغلوب کر لیا اور ان کے علاقے کو مگدھ کی موریہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ سارا افغانستان اور شمالی ہند کا سرحدی علاقہ جس میں کشمیر بھی شامل تھا، چندر گپت کی طرف سے ترقی یافتہ ملکی اور فوجی نظام کے ماتحت ہو گیا جس کی تفصیل چندر گپت کے مشہور عالم وزیر کوتلیہ نے ارتھ شاستر میں بیان کی ہے۔ چندر گپت کے عہد میں (سنہ ۳۰۵ ق۔ م) گندھارا (پشاور ضلع) اور پاکھلی (ہزارہ ضلع) میں بدھ مت کا عام رواج ہو گیا۔ موریہ سلطنت کا نقطہ عروج اشوک کا عہد تھا جو غالباً دنیا کا سب سے عالی قدر فرماں روا گذرا۔ اس نے بدھ مت کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ ایک بار اس نے کلنگ کی فتح میں میدان جنگ میں دڑھلا کر قیدی دیکھے اور جنگ کی تباہ کاریوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے لڑائی کو بالکل ترک کر دیا۔ اس کے بجائے جنگی مہمیں بھیجنے کی جگہ وہ امن کے پیام پر بھیجنے لگا کہ دنیا کی قوموں کو امن کا اور ”دھرم“ کا پیام پہنچائیں۔ اس کے زمانے میں ایک مہتمم بالشان نظام سلطنت نے جو خدا ترسی اور ”دھرم“ پر مبنی عقائد کو نمایاں کیا۔ یونانی مصنفوں نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے فرمانوں اور کتبوں سے جو مانسہرہ کے قریب شہباز گڑھی میں پائے گئے ہیں

اس واقعہ کا ذکر کلنگ کے مشہور تیرھویں فرمان میں ہے۔

ٹیکسلا کا نام اس کے ماتحت علاقے کی حیثیت سے آیا ہے۔ اشوک کی سرحدی پالیسی یہ تھی کہ اپنے ہمسایوں سے پُر امن تعلقات قائم رکھے۔ وہ فتوحات کے ذریعے سے اپنی سلطنت کی توسیع نہیں چاہتا تھا۔ کلنگ کے پہلے فرمان میں اس نے یہ اعلان کیا کہ غیر مفتوح سرحدی علاقے کے لوگوں کو مجھ سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ انھیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور مجھ سے رنج کی جگہ خوشی کی توقع رکھنی چاہیے۔“

۳۱۱ ق۔م میں اشوک دُنیا سے رخصت ہو گیا اور اس

کے بعد بدھ مت سرکاری مت نہیں رہا۔ دوسری صدی ق۔م کے وسط سے لے کر ۱۳۵ ق۔م تک باختر کے بادشاہ باختر، کابل، گندھارا اور ٹیکسلا پر حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد سینتھین قوم کی باری آئی (۱۳۵ ق۔م) جسے شک بھی کہتے ہیں اور اس کے بعد کشن قبائل نے جنھیں ہنوں نے ان کے پہاڑی وطن سے کال دیا تھا اس سارے علاقے کو جس پر یوڈن ٹکوں اور پہلوؤں کی حکومت تھی، تاخت و تاراج کیا۔ سلطنت میں ہم جنھیں ٹیکسلا پر حکمرانی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تیسرے کشن راجہ کشن کی سلطنت سارے شمال مغربی ہند اور کشمیر میں پھیلی ہوئی تھی جس کی راجدھانی پرش پودہ (پشاور) میں تھی۔ کشن راجہ پانچویں صدی عیسوی میں ہنوں کے حملے تک اس شمال مغربی علاقے پر حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ہرش کی سلطنت میں شامل

ہو گیا۔ (ساتویں صدی عیسوی)

سلاطین میں مسلمان ہندوستان میں آئے۔ سیکتگیں نے جو
 سلاطین اور غزنی کے غلام بادشاہوں کے سلسلے کا تیسرا حکمران تھا وزیر
 اور آخری قباہل کے ساتھ پشاور اور دریائے سندھ کے مغرب
 کے میدان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد محمود غزنوی کے حملے شروع
 ہوئے۔ لیکن محمود ہندوستان کو مستقل طور پر فتح کرنا نہیں چاہتا
 تھا۔ پھر بھی صوبہ سرحد کا سارا علاقہ جو دریائے سندھ کے اس
 پار ہے اس کے ایک نائب کی حکومت میں تھا۔ سلاطین میں
 محمد غوری نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد غلاموں، خلیفوں
 تغلقوں کے زمانے سے لے کر اکبر کے زمانے تک، جب کہ
 سلطنت مغلیہ مضبوطی سے قائم ہوئی، اس علاقے میں اپنی
 بد نظمی اور نزاج کا دور دورہ رہا اور کبھی کبھی باہر سے حملے بھی
 ہوتے رہے۔ ان میں سب سے مشہور تیمور کا حملہ تھا جو اپنے
 دارالسلطنت ہرقند سے سواروں کی ایک بہت بڑی فوج
 کے ساتھ روانہ ہوا اور کابل سے اور درہ خیبر سے گزرتا ہوا
 دہلی تک پہنچا جسے اس نے پانچ دن تک لوٹا اور ایک لاکھ
 ہندو قیدیوں کو قتل کر کے ان کے سروں کا ایک مینار بنایا۔ اس
 نے اپنے حملہ کی وجہ یہ ظاہر کی کہ ایک کٹر مسلمان کی حیثیت
 سے اُسے وہ رواداری بہت گراں گزری جو دہلی کے مسلمان بادشاہ

ہندو مذہب کے ساتھ برتتے تھے۔

اکبر کے زمانے میں جب خوش انتظامی اور رواداری کا زمانہ تھا
 اس کی شمالی قلمرو میں بلوچستان اور قندھار کا زبردست قلعہ جو پہلے
 ایران کے ماتحت تھا شامل کر لیا گیا اور اورنگ زیب کی وفات کے
 بعد تک سلطنت مغلیہ کا ایک جز رہا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں
 یوسف زئی اور خٹک قبائل نے شورش کی اور ان کی سرکوبی کے
 لئے تعزیری فوجیں بھیجی گئیں۔ پہلے خٹک اور آفریدی نے مل کر
 مغلوں کو شکست دی اور "قندھار سے اٹاک تک" عام بغاوت
 ہو گئی۔ اس پر خود شہنشاہ نے اُس مہم کی کمان جو یوسف زئی قبیلے
 کے خلاف بھیجی گئی تھی خود اپنے ہاتھ میں لے لی (۱۰۱۱ھ) اور
 حکمت عملی صورت حال پر قابو پا لیا۔ اسکی پالیسی جس کی بعد میں برطانوی
 حکومت نے تقلید کی، یہ تھی کہ "ایک قبیلے کو دوسرے سے لڑائے
 اور ان کے سرداروں کو وظیفے دے کر ان کے ذریعے سے سرحد
 میں امن قائم رکھے۔ اس لیے کہ یہاں فوجی چوکیوں کا رکھنا زیادہ
 کامیاب نہیں ہوا تھا۔"

نادر شاہ درانی نے ۱۰۳۹ھ میں دریائے سندھ کو عبور کر کے
 بالکل اُسی طرح جیسے تیمور لنگ نے ۱۰۳۸ھ میں کیا تھا اس علاقہ
 کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی نے
 (۱۰۴۳ھ تا ۱۰۶۳ھ) قندھار، کابل اور غزنی کے ساتھ ساتھ

پشاور، ڈیرہ جات، ہزارہ، سندھ، کشمیر اور ملتان کو ملا کر ایک جداگانہ درانی ریاست قائم کی۔

درانی سلطنت کے زوال کے بعد سکھوں کی حکومت قائم ہونے تک مرکزی حکومت کی "اس علاقے پر جسے سرحد کہتے تھے ایک بے قاعدہ اور غیر مسلسل حکمرانی تھی" پنجاب کے سکھ حکمران ہماراجہ رنجیت سنگھ نے صوبہ سرحد سے نو آباد افغانیوں کو نکال دیا۔ ۱۸۲۲ء تک پشاور، بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ جات کے کچھ حصے پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے افغانوں کو دریائے سندھ کے پار پہاڑوں میں بھگا کر موجودہ صوبہ سرحد کی بنا ڈالی۔ مگر سکھوں کی حکومت صوبہ سرحد پر (۱۸۳۲ء تا ۱۸۴۸ء) محض تلوار کی حکومت تھی۔ ڈکیتیوں اور انتقامی لڑائیوں کا زور تھا اور ان سے بھی زیادہ تباہی اس وقت ہوتی تھی جب سکھ مال گزاری وصول کرنے کے لئے آتے تھے۔ ایسے موقعوں پر عورتوں اور بچوں کے جھنڈ اپنے گھروں سے ڈر کر بھاگ جاتے تھے اور اس علاقے کی حالت ہاجروں کی نو آبادی کی سی ہو جاتی تھی۔ (میجر جیمس) ہماراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد ان کی سلطنت میں ابتری پھیل گئی۔ سکھوں اور انگریزوں کی پہلی لڑائی کے بعد بد امنی اور انتشار کا دور شروع ہوا۔ سکھوں کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ لیکن اس خطرے نے کہ کہیں افغان فوجیں سرحد سے گزر کر

دریائے سندھ کے اس پار نہ پہنچ جائیں، برطانوی حکومت کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ پنجاب کے الحاق کا سوال چھوڑ دے اور نابالغ ہمارا جہ ولیپ سنگھ کو اس صوبے کا حکمران تسلیم کر لے۔ ۱۶ دسمبر ۱۸۴۹ء کے معاہدے کی رو سے نظم و نسق ایک ریجنسی کاؤنسل کے سپرد کیا گیا جو برطانوی ریزیڈنٹ کے ماتحت تھی۔ ۱۶ دسمبر کے معاہدے میں یہ بشرط بھی تھی کہ ”ایک برطانوی افسر اور اس کے ساتھ ایک بڑا عملہ گورنر جنرل کی طرف سے لاہور تعینات کیا جائے گا اس افسر کو پورا اختیار ہوگا کہ ریاست کے ہر محکمے کی نگرانی کرے۔“ سرسہری لارنس لاہور میں برطانوی ایجنٹ مقرر ہوئے۔ جان نکلسن اور ہربرٹ ایڈورڈس کو حکم دیا گیا کہ بنوچیوں یعنی بنوں کے باشندوں کے مال گزاری نہ ادا کرنے کی سزائیں ”بنوں کی سرکش وادی کو قابو میں لانے کے لئے خالصہ دیوان کی طرف سے فوج کشی کرے۔“ اس وادی کو دور یا سیراب کرتے تھے۔ ”یہاں کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ فصل اچھی نہ ہو۔ زمین اس قدر زرخیز تھی کہ بغیر کسی خاص محنت کے قریب قریب سب اناج جو ہندوستان میں ہوتے تھے، افراط سے پیدا ہوتے تھے۔“ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا نقشہ میجر ہربرٹ ایڈورڈس نے اپنی کتاب سرحد پنجاب میں ایک سال ”میں کھینچا ہے دراصل یہ ایک خلاصہ ہے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی انیسویں صدی

کے نصف آخر کی تاریخ کا "اس وادی پر قبضہ بندوق یا توپ سے نہیں کیا گیا بلکہ محض دو نسلوں اور دو مذہبوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑا کرنے سے۔ سکھ فوج کے خوف سے دو جنگجو اور آزاد مسلم قبائل نے میرے اشارے پر چار سو قلعے جن پر ان کے دیس کی ساری طاقت منحصر تھی، مسبار کر دیے اور انھیں مسلم قبائل کے خوف سے سکھ فوج نے میرے حکم پر بڑا نوئی حکومت کے لیے ایک قلعہ تعمیر کیا جس کے ذریعے سے اس وادی پر پورا تسلط ہو گیا اس طرح ایک وحشی قوم پُر امن طریقے سے تہذیب کے دائرے میں آگئی اور ایک نیک نیت انگریز نے تین مہینے کے اندر بغیر لڑائی کے وہ فتح حاصل کر لی جو مذہبی دیوانے سکھ تلوار کے زور سے پچیس برس سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تیسرا باب

سڑکیں اور حملے

۱۸۴۹ء میں جب لارڈ ولہوزی نے پنجاب کا باقاعدہ الحاق کر لیا تو صوبہ سرحد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت آگیا، اس طرح برطانوی ہند کو پٹھانوں کے کئی آزاد اور جنگ جو قبائل سے براہ راست سابقہ پڑا جو نام نہاد قبائلی علاقے میں رہتے تھے اور سرحدی پالیسی کا ایک نیا دور شروع ہوا، ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات مختلف زمانوں میں مختلف رنگ اختیار کرتے رہے۔ لیکن ان سب میں دراصل ایک ہی پالیسی مد نظر تھی کہ ”حکمران خاندان کی آزادی کو اس وقت تک برقرار رکھا جائے جب تک وہ انگلستان کا دوست رہے اور اس کی حریف طاقتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہے“ حریف طاقتوں سے خاص طور پر روس مراد ہے جس کی وسط ایشیا میں پیش قدمیاں پچھلی صدی کے وسط سے برابر برطانیہ کے لئے پریشانی کا

باعث رہی ہیں۔ پہلے تو خطرے کی پیش بندی کی پالیسی اختیار کی گئی اور ۱۸۵۸ء میں مانسٹراٹ ایل فٹنشن "کابل کے مشن" پر بھیجا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۳ء میں دست اندازی کی پالیسی شروع ہوئی جب اے برنس تجارتی مشن پر گئے اور ۱۸۵۸ء میں جنرل کلین نے افغانستان پہنچ کر ہر دل عزیز بابر زئی سردار دوست محمد کو معزول کر کے اپنے دوست شاہ شجاع کو تخت پر بٹھایا۔ یہیں سے پہلی جنگ افغان (۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۲ء) شروع ہوئی۔ اس کے پہلے دور میں برطانوی حکومت کوشکست ہوئی برطانوی سفیر سر ولیم میک نائن اور سر ولیم برنس پولیٹیکل ایجنٹ مارے گئے اور ایک سیاسی کے سوا کابل کی ساری برطانوی فوج کام آئی اس کا بدلہ لینے کے لئے ایک اور فوج بھیجی گئی وہ ماروھاڑ کرتی کابل تک پہنچی اور اس نے شہر کے بڑے بازار کو بارود سے اڑا دیا جو یقیناً جنرل رابرٹس کے ایک ناقابل معافی وحیانہ فعل تھا اس طرح برطانیہ کا رعب دوبارہ قائم کر کے یہ فوج ہندوستان واپس آئی اور افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد سر جان لارنس کی عاکمانہ عدم مداخلت کی پالیسی شروع ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں امیر دوست محمد خاں کے مرنے کے بعد جب ان کے دونوں بیٹوں میں تخت کے لئے جنگ شروع ہوئی تو سر جان لارنس نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن جب شیر علی اس جنگ میں غالب آیا تو ہندوستان

کی حکومت نے افغانستان سے رشتہ جوڑ لیا اور وائسرائے نے شیر علی کو امیر تسلیم کر لیا۔

۱۸۶۳ء میں روس نے خیوا کی طرف پیش قدمی کی۔ ۱۸۶۵ء میں یار قند پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۶۶ء میں بخارا کو اور ۱۸۶۸ء میں خیوا کو اپنی "باغگذار" ریاست بنا لیا۔ ان سب باتوں کو برطانوی حکومت اپنے مشرقی مقبوضات کے لئے کھلا ہوا خطرہ سمجھتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جب لارڈ رولٹن نے ایک برطانوی مشن بھیجا کہ کابل کے حکمران سے دوستی کا باضابطہ معاہدہ کرے تو امیر شیر علی نے اسے رو کر دیا۔ اس حرکت کو "برطانیہ کے مقاصد سے حقارت آمیز بے پروائی" سمجھا گیا۔ اور جب امیر نے روسی سفیر کی پذیرائی کی تو اسے ہندوستان کی برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کا اقدام قرار دیا گیا۔

۱۸۶۷ء میں اس پالیسی کی جگہ سرحد پر قدم جما کر ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بچا یا جائے۔ "پیش قدمی کی پالیسی" اختیار کی گئی اور وہ یہ تھی کہ برطانیہ کی طرف سے افغانستان یا اس کے ایک حصے پر مستقل قبضہ رکھا جائے یہ پالیسی اس قسم کی تھی جیسے نیپیر کا "سیکاومی" (مجرمانہ) طرز عمل سرحد کے امیروں کے ساتھ۔ چنانچہ شکایت میں ایک برطانوی ایکشنی قائم کی گئی اور اس کے بعد اعلان جنگ کے کابل پر تین مختلف سمتوں سے حملہ کیا گیا (دوسری

جنگ افغان کو ٹیٹ پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس لئے کہ "اس سے قندھار کا راستہ کھل جائے گا اور دشمن کو جو شمالی دروں سے ہندوستان پر حملہ کرنا چاہے اُسے بڑھ کر گھیر لینے کا موقع ملے گا۔" صلح نامہ گنڈمک ۱۸۵۸ء کی رو سے امیر کابل اس پر راضی ہو گئے کہ کابل میں ایک برطانوی ریزی ڈنٹ کو رکھیں اور شمالی دروں کے علاوہ قندھار کے پُرانے صوبوں کا مشرقی حصہ انگریزوں کے حوالے کر دیں۔

۱۸۵۹ء میں نیا سرحدی خط ڈیویڈن لائن کہلاتا ہے کوہ پستیاں کی سب سے اونچی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ کھینچا گیا جس کی وجہ سے خیبر، مہمند، تیراہ، قندھار اور وزیرستان کے قبائل انگریزوں کے حلقہ اثر میں آ گئے۔ پشاور، نوشہرہ، رسال پور، لنڈی کوتل اور قرم میں مضبوط فوجی چوکیاں قائم کی گئیں تاکہ برطانوی حکومت دروں کو پوری طرح قابو میں رکھ سکے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر قبائلی علاقے کو "کھولا گیا" یعنی مزید فوجی چوکیاں محسوس علاقے کے قلب میں دانا، رزمک اور پیر شاہ میں قائم کی گئیں اور ان کو قوت پہنچانے کے لئے موٹر کی فوجی سڑکوں کا ایک جال بچھایا گیا اور جا بجا چھوٹی چھوٹی چوکیاں، مورچے اور قلعے بنائے گئے۔ ۱۸۵۹ء میں لارڈ کرزن کے دریائے سندھ کے پار کے پانچ آئینی اضلاع یعنی ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں، پٹیر، اسماعیل خاں اور پانچ ایجنسیوں کو پنجاب سے الگ کر کے

ایک جدا گانہ صوبہ بنا دیا۔ اسی سال لارڈ کرزن نے آئینی اضلاع میں ایک چیف کمشنر اور اس کی مدد کے لئے ایک جوڈیشل اور ایک ریونیو کمشنر مقرر کیا اور ایجنسیوں میں چیف کمشنر کو ایجنٹ گورنر جنرل کی حیثیت دی جو براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت تھا تاکہ پنجاب کی سرحد پر رہنے والے قبائل کے ساتھ بیرونی تعلقات پر برطانوی حکومت کی نگرانی پہلے سے زیادہ ہو جائے صوبہ سرحد کو ان سیاسی اصلاحات سے جو ۱۹۰۱ء کی مانسٹر اسکیم کے ماتحت نافذ کی گئی تھیں الگ رکھا گیا۔

اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد پار کے پانچ ترقی یافتہ اور آئینی اضلاع میں نظم و نسق کا معیار گر گیا۔ سارے ہندوستان میں تو اصلاحات کا نفاذ ہوا لیکن صوبہ سرحد چیف کمشنر کی استبدادی حکومت کے ماتحت رہا، اور اوپر سے اس پر ۱۹۰۱ء کے ضابطہ جرائم نمبر ۳۰ کا بوجھ ڈال دیا گیا جس نے شہریوں کو عدالتی چارہ جوئی کے بنیادی حق سے بھی محروم کر دیا۔ یہ نصاب اتنا ناپاکیاں تھا کہ ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ حلقوں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اس صوبے کو دوبارہ پنجاب سے ملا دیا جائے۔ ایک حادثہ اسی ایجنسی کی وجہ سے ۱۹۰۳ء کی دوسری گول میز کانفرنس کے بعد صوبہ سرحد کو ایک گورنر کے صوبے کا درجہ دے دیا گیا اور اس میں بھی وہی آئین

نافذ کیا گیا جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں تھا، اس کے علاوہ پانچ آئینی اضلاع کو بھٹ کا خوارہ پورا کرنے کے لئے مرکز کی طرف سے ایک ایک کروڑ سالانہ کی امداد ملنے لگی۔ پنجاب کے الحاق سے جو علاقے میں ہوا تھا ناگوار نتائج پیدا ہوئے جن کی وجہ سے صوبہ سرحد میں امن قائم نہ ہو سکا۔ لارڈ لٹن کے آنے تک (۱۹۰۷ء) بقول ڈیوینر کے پنجاب کی سرحد کے بارے میں عدم مداخلت کا اور اس کے ساتھ کبھی کبھی فوجی مہم بھیجنے کا ”طریقہ اختیار کیا گیا مگر دراصل عدم مداخلت کا محض نام ہی نام تھا۔ پنجاب کے الحاق اور ۱۹۰۵ء کے غدر کے درمیانی عرصے میں سب ملا کر شہرہ فوجی مہمیں بھی گئیں، اسی طرح دوسری جنگ افغان اور ۱۹۰۷ء کی بھٹانوں کی بغاوت کے درمیان سرحدی قبائل پر سولہ بار چڑھائی کی گئی، جولائی ۱۹۰۷ء میں سرحد میں ایک غامض شورش برپا ہو گئی۔ قبائلیوں کے بڑے لشکر نے محبزیں ملا کی سرحد میں جس نے برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا ملائٹ کی پہاڑوں پر حملہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ دریائے کابل کے پار پشاور کی وادی پر بھی قبائلیوں کے ایک بڑے لشکر کا حملہ ہوا جس میں خیبر کے آفریدی بھی شامل تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمند کے علاقے میں تیرہ کی مہم بھیجی گئی۔ تاکہ آفریدیوں کو ”سزا“ دی جائے۔ ان مہموں کے تجربے سے اس خیال کو روز بروز تقویت ہو رہی تھی کہ افغانستان کو

فتح کرنے اور اس پر قبضہ رکھنے میں روپے کا اور جانوں کا بے حد نقصان ہوتا ہے۔ "معقول تدبیر" یہ ہے کہ یہ خراج دشمن پر ڈالا جائے، چنانچہ پیش قدمی کی پالیسی رفتہ رفتہ ترک کر دی گئی اور اس کی جگہ پر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ افغانستان کی ایک آزاد، مضبوط اور پائدار حکومت کے ساتھ جو سرحد کے آزاد قبائل کی نگرانی برطانوی حکومت کے سپرد کرنے پر تیار ہو، دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ اس پالیسی کے مطابق امیر عبدالرحیم کو کابل کے تخت پر بٹھایا گیا اور وہ برطانوی فوج کی مدد سے بہت عرصے تک حکومت کرتا رہا۔ اس درمیان میں اُسے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ایک معقول رقم وظیفے کے طور پر ملتی رہی۔ یہ طریقہ اس کے جانشین امیر حبیب اللہ خاں کے زمانے میں بھی جاری رہا جو سلطانزادہ میں قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس "سائنٹیفک" سرحد کی وجہ سے برطانوی حکومت کو سرحد پار کے قبائل سے براہ راست سابقہ پڑا جس سے دوسری قسم کی سجدگیاں پیدا ہو گئیں۔ افغانستان کے حکمران فائدے میں ہے کہ ان کے حریف برطانوی حکومت کے سر پر گئے۔ عہد نامہ گنڈاپک جو افغانستان سے ہوا تھا اور وہ سیاسی مفاہمت جو سرحدی قبائل سے کی گئی تھی ان کی رو سے برطانوی حکومت نے دہروں پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا، اور ہندوستان سے کابل تک دو فوجی سڑکیں اس کے قبضے میں آگئی تھیں اور جن میں سے ایک خیبر سے اور دوسری

قوم سے گزرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ برطانوی حکومت کا دخل
 قبائلی علاقے میں ہوتا گیا جس کی بدولت وہاں بچی سڑکوں اور فوجی
 ریلوے کی "برگتیں" پہنچ گئیں۔ ان چیزوں میں اور اس علاقے کی
 سیاسی اور معاشی پستی میں ایک عجیب تضاد محسوس ہوتا تھا۔
 اس میں شک نہیں کہ ان سڑکوں پر مغرب کا ہر مذہب ملک رشک
 کر سکتا تھا اور فوجی ریلیں خصوصاً وہ جو آئینی اضلاع سے پرے
 پہاڑوں کے گرد چکر کھاتی اور پہاڑوں کے بیچ سے گزرتی چلی جاتی
 تھیں فن انجینیری کے کمال کی نشانیاں تھیں۔ لیکن آزاد قبائل ان سے
 کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ وہ جاہل تو تھے، مگر بے وقوف نہیں
 تھے۔ وہ ان سڑکوں اور بارکوں کو اپنی غلامی کی نشانیاں اور
 زنجیریں سمجھتے تھے اور انھیں، برطانوی حکومت کا فوجی مقصد کے
 ماتحت ایک ایک اسخ زمین پر قبضہ کرنا بھی جارحانہ پیش قدمی کی
 حیثیت سے شاق گذرتا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔
 قبائلیوں کی طرف سے حملے ہوتے رہے، اور برطانوی حکومت کی
 طرف سے تغیریری نہیں بھیجی جاتی رہیں۔ اس طرح دونوں میں ایک
 مسلسل اور مستقل "جنگ" شروع ہو گئی۔ بقیہ میں اس کیسٹل کا خیال
 کے تمام مرد، عورت اور بچے ان لوگوں کو غازی سمجھتے تھے۔ جو لپٹاؤ
 اور کھپاٹ پر حملے کرتے اور لوہے کے ڈالے تھے۔ وہ قوم کے مجاہد
 تصور کئے جاتے تھے۔ ان کو دوائے خیر کے ساتھ رخصت کیا جاتا

تھا اور جب وہ کامیاب و کامران واپس آئے تھے تو بڑی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۵۷ء تک اور آزاد علاقے کی طرح وزیرستان بھی برطانوی حلقہ اثر سے باہر تھا اور افغانستان کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ڈیورنڈ معاہدے کی رو سے امیر عبدالرحمن خاں اس سے دست کش ہو گئے ۱۹۰۱ء سے پہلے قبائلیوں کی طرف سے حملے بہت ہی کم ہوتے تھے لیکن ڈیورنڈ لائن کی حد بندی کے دوران میں وانا کے مقام پر ایک برطانوی دستے پر حملہ کیا گیا، اور اس کی وجہ سے جنگ شروع ہو گئی۔ ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء۔ ۱۹۰۲ء سے قبل وزیرستان کے علاقے میں ایک سڑک بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۰۲ء کی انتظامی رپورٹ کے ساتھ جو نقشہ شائع ہوا اس میں پہلی بار تھال سے ایڈک تک جوڑی علاقے میں تھا ایک سڑک دکھائی گئی۔ وزیرستان میں جنگی سڑکوں کی اسکیم عمل میں آ رہی تھی کہ محسود قبیلے نے بغاوت کر دی اور ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ ۱۹۰۲ء۔ ۱۹۰۳ء تک وہ دور تھا جب محسود قبیلے کے خلاف فوج بھیجی گئی اور اس کے علاقے پر قبضہ کیا گیا۔ اسی کے ساتھ سڑکوں کی تعمیر بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد بار سے سال بھر میں جتنے حملے ہوا کرتے تھے ان کی تعداد بہت

بڑھ گئی، ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ سڑکوں اور حملوں میں باہم کیا تعلق تھا۔

سنةء حملوں کی تعداد

۷۱	۱۲-۱۱-۱۹۱۱ء
۷۷	۱۳-۱۲-۱۹۱۲ء
۹۳	۱۴-۱۳-۱۹۱۳ء
۱۶۵	۱۵-۱۴-۱۹۱۴ء
۳۴۵	۱۶-۱۵-۱۹۱۵ء
۲۹۲	۱۷-۱۶-۱۹۱۶ء
۲۲۳	۱۸-۱۷-۱۹۱۷ء
۱۸۹	۱۹-۱۸-۱۹۱۸ء
۶۱۱	۲۰-۱۹-۱۹۱۹ء
۳۹۱	۲۱-۲۰-۱۹۲۰ء
۱۹۳	۲۲-۲۱-۱۹۲۱ء
۱۳۱	۲۳-۲۲-۱۹۲۲ء
۶۹	۲۴-۲۳-۱۹۲۳ء

ہندوستان کی برطانوی حکومت کے فوجی محکمے کے لئے یہ صورت حال کچھ زیادہ ناخوش گوار نہیں تھی۔ ہندوستان میں اس بات کے

خلاف عام احتجاج تھا کہ ملک کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ یعنی ساٹھ فیصدی تک فوجی مصارف "میں کھپ جاتا تھا، اس لئے کبھی کبھی جھڑپیں ہو جانے سے اور قبائلی علاقوں میں فوجی ہم بھینچے ان مصارف کے لئے حکومت کو ایک معقول اندر ہاتھ آ جاتا تھا۔ لیکن ان حملوں کی زد خاص طور پر صوبہ سرحد کی برطانوی رعایا پر پڑتی تھی، قبائلی برطانوی حکومت میں اور برطانوی ہند کی رعایا میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہی لوگ ہمارے دس پر حملہ کرنے کے لئے اور ہمارے بھائیوں کا خون بہانے کے لئے روپیہ اور آدمی ہبیا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ انھیں قتل کرنے، لوٹنے اور فدیہ وصول کرنے کے لئے اپنا جائز شکار سمجھتے تھے۔ یہاں مشرقی ملکوں کی یہ مثل صادق آتی ہے۔ "جب فوجیں لڑتی ہیں تو گھاس بچاری مفت میں کچل جاتی ہو" اس سلسلے میں شرمی بھولا بھائی ڈیاسی نے ۱۹۲۵ء میں مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا "مہیں تو فوج رکھنے کا ایک بہانہ ہیں۔ ان کے بغیر چار کروڑ روپے کا خرچ حق بجانب ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں فوج ہو وہاں ہمیشہ اس کے استعمال کا میلان۔۔۔ بلکہ یوں سمجھئے جواز۔۔۔ بھی ہوتا ہی جب ہم اپنی حد میں ہوتے ہیں تو اس سے تجاوز کرنا چاہتے ہیں اور جب ایک حصے پر قابض ہو جاتے ہیں تو اگلے بڑھ کر کچھ اور لینا چاہتے ہیں۔

اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اصل میں سرحد کی جنگ کو کھپے تیس، اکتیس سال سے اسلحہ کا ذخیرہ جمع کرنے کا بہانہ بنایا گیا ہے اور اس طرح ہمارے ملک کی غریب جتنا کا خون چوسا گیا ہے۔

مہینے پرست لوگ، رشوتوں، تعزیری مہموں اور دس میل ریل یا سڑک بنانے میں اس سے کہیں زیادہ روپیہ صرف کر دیتے تھے، جتنا اسکول، ڈاک خانے، اسپتال اور دوسری آسائشوں کے مہیا کرنے میں صرف ہوتا جن کی سرحد پار کے لوگوں کو سخت ضرورت تھی اور جنہیں وہ دوستی کی نشانی سمجھ کر خوشی اور احسان مندی کے ساتھ قبول کرتے۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۸ء تک فوجی مہموں کے بھیجنے پر تیرہ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ مرکز کی سرحدی پالیسی کی وجہ سے جو مستقل مالی ذمہ داریاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ ان میں ذیل کی رقمیں شامل تھیں۔

(۱) ایک کروڑ چوہن لاکھ روپیہ ہر سال محکمہ خارجہ کے ذریعے سے صرف ہوتا تھا۔

(۲) فوجی ریلوے کو دو کروڑ سالانہ کا خسارہ ہوتا تھا۔

(۳) اس علاقے میں فوج کو رکھنے اور مورچہ بندی کرنے کا

خرچ دس گیارہ کروڑ کے قریب تھا۔

(۴) تعزیری مہموں کے خوفناک فوجی کھیل پر جو قریب قریب

ہر سال کھیلا جاتا تھا یا بڑی اور چھوٹی لڑائیوں پر جو جنگ چترال

کے بعد چالیس سال کے اندر ہوئیں، اوسط خرچ دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھا۔ ایک بیان کے مطابق جو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں دیا گیا تھا اس وقت سے جب برطانوی حکومت نے پنجاب کو سکھوں سے چھینا، نوے سال کے اندر (۱۸۹۹ء تا ۱۹۳۸ء) کل خرچ چار ارب کے قریب ہوا۔

یہ سلسلہ ستر سال سے زیادہ جاری رہا۔ ان بے شمار مہموں کا جنھیں سرمایہ کل ادوار نے "آتش زنی اور غارت گری کے واقعات" کہا ہے، نتیجہ قریب قریب صفر تھا۔ ایک اور موقع پر سرمایہ کل نے کہا تھا "ان سے قبائلی کچھ عرصہ کے لئے دب جاتے تھے لیکن پھر وہی پہلی سی بد امنی کی حالت پیدا ہو جاتی تھی۔"

چوتھا باب

ایک عجیب و غریب منظر

سنہ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ستیہ گرہ کی تحریک بہت بڑے پیمانے پر شروع ہوئی۔ پہلی عالمگیر جنگ میں ہندوستان نے اپنے بدیسی حکمرانوں کی پریشانی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کے ساتھ جنگ میں تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے کے بعد اس کے حقے میں آزادی کے بجائے رولٹ ایکٹ آیا جس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ باغیانہ جرائم کا انسداد کرے مگر اصل میں یہ شہری حقوق کو بے دردی سے کچلنے کی ایک ایسی تدبیر تھی جو ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ اس کی بدولت گاندھی جی جنھیں اب تک برطانوی سلطنت کی ”ہماییت و فادارہ رعایا“ ہونے پر فخر تھا اقلری باغی اور ہندوستان کی برطانوی حکومت کے کھلے ہوئے باغی بن گئے۔ انھوں نے اس کے خلاف سارے ملک میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی۔ حکومت نے اس کے جواب میں پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا جس کی تان امرتسر

میں جنرل ڈائری کے ہاتھوں ہندوستانیوں کے قتل عام پر ٹوٹی۔ اس لئے وہ تحریک جو دولت ایکٹ کے خلاف شروع ہوئی تھی کچھ دن بعد زیادہ وسیع ہو کر بے تشدد ترک موالات کی تحریک بن گئی۔ یہ تحریک گاندھی جی کی قیادت میں ان وحشیانہ مظالم کی دادخواہی کے لیے جو پنجاب میں مارشل لا کے سلسلے میں ہوئے تھے اور اس بے انصافی کی تلافی کے لیے جو خلافت کو ختم کر کے اور ہندوستان کو اس کے پیدائشی حق یعنی سوراج سے محروم کر کے کی گئی تھی، شروع ہوئی۔ اس وقت ایک عجیب معجزہ دیکھنے میں آیا ہندو اور مسلمان جنھیں برطانوی حکومت کی ”لڑاؤ اور حکومت کرو“ کی پالیسی نے ایک مدت تک الگ کر رکھا تھا، اس پر ٹل گئے کہ آپس کے جھگڑوں کو بھول کر ایک ہو جائیں ظاہر ہے کہ اس سے برطانوی سامراجی جن کو دن رات یہ فکر رہتی تھی کہ ان دونوں کو ٹکرا کر ہندوستان کو دائمی طور پر ”برطانوی حکومت کے لیے محفوظ“ بنادیں۔ اب تک ان کی یہ پالیسی رہی تھی کہ صوبہ سرحد کو روسی خطرے کے خلاف ایک مورچہ بنائیں۔ مگر اب انھوں نے یہ سوچا کہ اسے ہندوستان کی اندرونی اور بیرونی مصلحتوں کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ مسلمان کی اکثریت کے صوبے کی حیثیت سے ترقی دیں تاکہ ہندو اکثریت کے صوبوں کا توڑ ہو سکے اور ہندوستانی قومیت کے سیلاب کے لئے پشتے کا کام دے سکے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر چیف کمشنر

اور پولیٹیکل سروس کے کل ذمہ دار افسروں کو ہدایت کی گئی کہ ان اصرار کے باشندوں کے مقابلے میں جن پر براہ راست حکومت کی جاتی تھی۔ قبائلیوں کی دل جوئی کو ترجیح دی جائے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں ترک موالات کی تحریک سارے ہندوستان کی طرح صوبہ سرحد میں بھی پھیل گئی۔ اس کے بعد وہ دور آیا کہ فرقہ وارانہ فسادات بہت بڑے پیمانے پر کھڑے ہوئے۔ اس کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ بعض صورتوں میں حکام نے اور ان کے ایجنٹوں یعنی مقامی افسروں نے اگر قصداً نہیں کرائے تو انھیں مشہ ضرور دی۔ صوبہ سرحد کے سب سے بڑے فساد سنہ ۱۹۲۱ء میں کوہاٹ اور سنہ ۱۹۲۲ء میں ڈیرہ اسماعیل خاں میں ہوئے۔ لیکن باوجود فرقہ واریت کے زہر کے جو برطانوی حکومت کی پالیسی نے پھیلا یا تھا سنہ ۱۹۲۳ء میں سرحد میں عوام کی ایک بہت بڑی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب ایک عجیب و غریب منظر نمودار ہوا یعنی بے تشدد پٹھان۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں نمک کی سٹیہ گره کے سلسلے میں صوبہ سرحد کے پٹھانوں نے ہزاروں کی تعداد میں عدالتوں اور بدلیسی کپڑے اور شراب کی دوکانوں کی پرامن پکٹنگ کی۔ سرحد کے حکام نے جو اپنے مقاصد کے لیے بے تشدد پٹھان کو مسلح پٹھان سے کہیں زیادہ خطرناک سمجھتے تھے اس تحریک کو کچلنے میں کسی قسم کی سختی اٹھا نہیں رکھی۔ ۲۳ اپریل کو لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پشاور میں پٹھانوں کے

ایک پُر امن مجمع پر جس میں ہندو اور سکھ بھی شامل تھے، گولی چلائی۔ اس الم ناک واقعہ کی تفصیل کے لیے شرعی و - ج - پٹیل کے پشاور فائزننگ کی تحقیقاتی رپورٹ (۱۹۷۳ء) کو پڑھنا چاہیے جسے برطانوی حکومت نے اس زمانے میں ممنوع قرار دیا تھا۔

سلسلہ ذیل میں ایک رپورٹ کے کچھ اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں یہ رپورٹ پنجاب کے ایک ذمہ دار مسلم لیڈر نے بھیجی تھی اور اسی زمانے میں ننگ انڈیا میں شائع ہوئی تھی :-

”انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ..... پشاور پہنچا اور اس نے بغیر پہلے سے تنبیہ کئے ہوئے مجمع پر جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے فیر کرنا شروع کر دیا..... جب اگلی صف والے گر گئے تو پیچھے سواروں کی سیٹھ کھولے ہوئے گولی کھانے کو تیار آگے بڑھ گئے..... بعض کے اکتیس اکتیس گولیاں لگیں..... سب کے قدم جھے رہے۔ گھبراہٹ اور بھگدڑ کا نام تک نہ تھا۔ ایک کم سن سکھ لڑکا ایک گورے کے سامنے آکر کہنے لگا کہ مجھے گولی مار دو۔ گورے نے بے تامل فیر کر دیا اور لڑکا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت نے اپنے عزیز بندوں اور دوستوں کو زخمی ہوتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھی اور گولی کھا کر گر گئی۔ ایک پیر مرد جس کے کندھے پر چار سال کا ایک بچہ سوار تھا اس وحشیانہ قتل عام کو برداشت نہ کر سکا اور آگے بڑھ کر گوروں سے التجا کرنے لگا کہ مجھے بھی اڑاؤ۔ اس کی فرمائش پوری ہوئی اور وہ بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا.... یوگ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ہے)

ہر شخص جسے پٹھان سے زرا سی بھی واقفیت تھی حیرت میں رہ گیا۔
رائل گروہ والے رائفلز کے جنگ آزمودہ گروہ والی سپاہیوں کی دوہلیں
اس نظارے سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے گولی چلانے
کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ ان کو کورٹ مارشل کر کے دس سے
چودہ سال تک قید کی سزائیں دی گئیں۔ جب گاندھی ارون معاہدہ
ہوا تو عام معافی کی دفعہ ان پر عائد نہیں کی گئی اور انھیں اپنی پوری
سزائیں بھگتنی پڑیں ان میں سے ایک اپنی میعاد ختم ہونے کے بعد
گاندھی جی کے پاس آیا اور کچھ عرصے تک ان کے آشرم کے ایک کن کی

(صفحہ ۷۷ کا نقیہ حاشیہ)

ایک ایک کر کے آگے بڑھ رہے تھے اور گولیوں کی بارود کا سامنا کر رہے تھے۔
جب وہ زخمی ہو کر گرے تھے تو انھیں پیچھے گھسیٹ لیا جاتا تھا اور دوسرے
ان کی جگہ لے لیتے تھے.....“

ایک خاص سیرا فسر نے اس واقعہ کا ذکر انڈین ڈیلی میں کے کاموں
میں جس کا ایڈیٹر انگریز تھا ان الفاظ میں کیا ہے :-

”میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اخباروں میں جتنی دیر گولی چلنے کا ذکر
کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ دیر تک چلتی رہی۔ ہم نے ان کم بختوں کو ایسا سبق
دیا کہ یاد ہی تو کریں گے..... ہمارے آدمی کھڑے دناؤں گولیاں چلا رہے
تھے اور شور و شش پسندوں اور ان کے لیڈروں کو جن کی طرف پولس اشارہ
کرتی تھی مار کر گرا رہے تھے۔ محض چند گولیاں نہیں چلیں بلکہ مسلسل گولی باری کی گئی؟

حیثیت سے رہا۔

وہ جس نے پٹھانوں میں یہ حیرت انگیز کاپاپٹ کر دی خاں
عبد الغفار خاں تھا جو اپنے صوبے میں بادشاہ خاں کے نام سے مشہور
تھا۔ خاں عبد الغفار خاں اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب نے
۱۹۲۹ء میں خدائی خدمت گار تحریک شروع کی تھی۔ چارلی
اینڈریوز کے الفاظ میں ”وہ اپنے مزاج اور چال ڈھال کے لحاظ سے
بیج مچ بادشاہ ہے۔ وہ خود اہلسا کا پابند ہے اپنے پیروؤں کو بھی
اس کی تاکید کرتا ہے اور ہاتھ لگا دھکی کی ہدایتوں پر حرف بہ حرف
عمل کرتا ہے۔“ ان کی زندگی کی روداد ایک کہانی یا رومان معلوم ہوتی
ہے وہ ۱۸۹۹ء میں محمد زئی قبیلے کے دولت مند خوانین کے خاندان
میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بہرام خاں تحصیل چارسدہ ضلع پشاور کے
ایک گاؤں اتمان زئی کے سب سے بڑے خاں تھے۔ عبد الغفار خاں
نے ایڈورڈ مشن ہائی اسکول میں تعلیم پائی لیکن وہ میٹرک کے امتحان
میں فیل ہو گئے اور گھر پر رہنے لگے بخلاف اس کے ان کے بڑے بھائی
ڈاکٹر خاں صاحب طب کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے اور پہلی
جنگ عظیم میں طبی خدمات انجام دینے کے بعد آئی۔ ایم۔ ایس کے
رکن ہو کر ہندوستان واپس آئے۔ بادشاہ خاں کو بھی کچھ عرصے تک
یہ شوق رہا کہ فوج میں داخل ہو کر ایک سپاہی کی حیثیت سے امتیاز
حاصل کریں لیکن قدرت نے انھیں اس سے محفوظ رکھا۔ اس لئے کہ

جب وہ اپنے ایک دوست سے جم فوج میں افسر تھے، ملنے کے لئے گئے تو ان کی آنکھوں نے یہ ناگوار منظر دیکھا کہ ایک کم تر درجے کے برطانوی افسر نے ان کے دوست کی سخت توہین کی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے لیکن ان کے والد نے انھیں واپس بلالیا اور انھیں انجیری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا جہاں سارے انتظامات ہو چکے تھے یہاں تک کہ بی اینڈریو کے ایک جہاز میں ان کا ٹکٹ بھی خرید لیا گیا تھا۔ مگر ماں کی محبت انجیری کے شوق پر غالب آگئی۔ جب وہ رخصت ہونے کے لئے گئے تو وہ سسکیاں لے کر کہنے لگیں ”میرا ایک بیٹا تو پہلے ہی مجھ سے جدا ہو چکا ہے اگر تم بھی چلے گئے تو میں کیا کروں گی۔“ بیٹے کا دل ہل گیا اور اس نے یورپ جا کر تعلیم پانے کا خیال چھوڑ دیا۔ گاندھی جی کو تو ماں کی محبت نے تین چیزوں یعنی شراب، عورت اور گوشت سے پرہیز کرنے کا عہد لے کر عمر بھر کی تپسیا کی راہ پر ڈال دیا تھا مگر بادشاہ خان سے جہنیں ان کے دوست پیار سے سرحدی گاندھی کہتے ہیں دنیاوی جاہ پسندی چھڑا دی اور انھیں بقول سرحد کے عوام کے ایک فقیر بنا دیا۔ جس نے اپنی زندگی ایشیا، قربانی اور خلق خدا مخصوصا غریبوں کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ دونوں نے جس راہ میں قدم رکھا تھا اُس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ دونوں سینہ تانے ہوئے اپنے اپنے انداز میں اس منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے جو تقدیر نے ان کے لئے معین کر دی تھی۔

۱۹۱۱ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی کے ساتھ جنھیں اپنے جُہ وطن کی بدولت گھر چھوڑ کر قبائلی علاقے میں جلا وطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی، بادشاہ خاں نے اپنے صوبے میں کئی نیشنل اسکول قائم کئے۔ اس زمانے میں راسخ العقیدہ ملا سرکاری اسکولوں کے خلاف ایچی ٹیشن کر رہے تھے لیکن وہ تعلیم کی کوئی دوسری راہ نہیں بتاتے تھے۔ بادشاہ خاں نے اس ایچی ٹیشن کو تحریبی رنگ کے بجائے تعمیری رنگ دے دیا۔ ان کے اپنے پرانے ایڈورڈ مشن کے پرنسپل پادری وگرام کی مثال نے ان کے دل میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔

بادشاہ خاں نے اپنے قول کے مطابق دین داری کا جذبہ اپنی ماں سے ورثے میں پایا تھا اور اپنے باپ سے انھیں عدم تشدد کا فطری رجحان ملا تھا۔ دونوں ان پڑھ تھے اور انھیں جسمانی دنیا سے زیادہ روحانی دنیا سے لگاؤ تھا۔ میری والدہ اکثر نماز کے بعد خاموش مراقبے میں بیٹھی رہتی تھیں۔ میرے والد کے دوست تو بہت تھے مگر ساری عمر ان کی کسی سے دشمنی نہیں ہوئی..... ان میں انتقام کا مادہ بالکل نہیں تھا اور ان کا خیال تھا کہ دھوکا کھانا کوئی شرم کی بات نہیں البتہ دھوکا دینا ضرور شرمناک ہے۔ وہ اپنی بات کے پکے تھے اور ان کی سچائی کا یہ حال تھا کہ دشمن بھی ان پر شبہ کرنے یا ان کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ "سرحد کے لوگ ان کے قول کو

دشاویز سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ بادشاہ خاں بیان کرتے ہیں کہ
 دیگ گردہ در گردہ اگر اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ ان کے پاس امانت
 رکھاتے تھے اور رسید تک نہیں مانگتے تھے۔ وہ حکام کی درباری
 کے قائل نہیں تھے، اس کے باوجود بڑے بڑے برطانوی حکام
 انہیں چاہتے تھے، اور انہیں ناراض کرنے کی جرات نہیں
 کرتے تھے۔

حاجی ترنگ زئی کے چلے جانے کے بعد بادشاہ خاں نے
 ہمند اور باجور کے علاقے کا دورہ کیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ
 قبائلیوں میں رہ کر اپنا مشن پورا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ کئی دن تک
 روزہ رکھتے رہے اور دعائیں مانگتے رہے لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکتے
 آخر انہوں نے پھر عوام کی تعلیم اور ترقی کا پرانا مشغل شروع کر دیا۔
 جب رولٹ اینکٹ کے خلاف ایچی ٹیشن شروع ہوا تو بادشاہ خاں
 دل و جان سے اس میں شریک ہو گئے وہ فوراً گرفتار کر لئے گئے۔
 ۱۹۱۹ء کو آتان زئی میں ایک لاکھ آدمیوں کا جلسہ
 ہوا جس میں بادشاہ خاں کے بوڑھے باپ بھی شریک تھے بادشاہ
 خاں کی گرفتاری کے بعد پولیس کا افسر ایک جرگے کے ساتھ ان کے
 والد کے پاس آیا اور انہیں یہ دھمکی دی کہ بادشاہ خاں کو گولی مار
 دی جائے گی۔ پھر اس نے ان کو بھی گرفتار کر لیا جب بادشاہ خاں
 جرگے کے سامنے پیش ہوئے تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم پٹھانوں کے

بادشاہ ہوتے میں نے کہا یہ تو میں نہیں جانتا مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ میں قیوم کا خادم ہوں اور اس قانون درولٹ ایکٹ، کوچپ چاپ برداشت نہیں کر سکتا۔..... پھر مقدمت کی کارروائی شروع ہوئی۔..... جرگے نے طرح طرح کی دھمکیاں دیں اور جھوٹی دلیلوں سے کام لیا۔..... مگر مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا“

۱۰

اس طرح باپ بیٹے دونوں کی سستی گرہ کی لسم اٹھ ہوئی۔
مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر خیلے گئے۔ اور جب تک میں قید رہا میرے
پاؤں میں بیڑیاں پڑی رہیں۔ ان دنوں میرا جسم اب سے دگنا
تھا، اور میرا وزن دو سو پندرہ پونڈ تھا۔۔۔۔۔ کوئی بیڑیاں
میرے پاؤں میں نہیں آتی تھیں۔۔۔۔۔ بیڑیوں کے
تکڑاں کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی اور جب وہ مجھے پہنائی
گئیں تو ٹخنوں کے اوپر کا حصہ پھل گیا، اور بہت سا خون بہا۔
۔۔۔۔۔ افسروں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور یہ کہا کہ ہتھوڑے
دن میں تمہیں اس کی عادت ہو جائے گی۔

خان بہرام خاں تین مہینے بعد چھوٹ گئے اور بادشاہ خاں
بھی چھ مہینے سے زیادہ قید نہیں رہے۔ اس لئے کہ اس زمانے
کے چیف کمشنر سر روس کیپل کی یہ پالیسی تھی کہ پٹھانوں کی "تالیف
قلوب" کی جائے۔

اس اثنا میں بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب نے سنٹ
 ماس ہسپتال سے ایم آر سی، ایس (سین) کی ڈگری لی اور خلی
 خدمت کے لئے فرانس چلے گئے۔ انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ ان کے
 چھوٹے بھائی اور والد پر کیا گزر رہی ہے۔ ہندوستان سے
 کوئی خط ان تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔ سن ۱۹۴۷ء میں جب وہ ہندوستان
 واپس آئے تو انھوں نے اپنے عہدے سے استعفاء دے دیا۔
 بادشاہ خاں سن ۱۹۴۷ء میں کانگریس کے اجلاس ناگ پور میں شریک
 ہوئے، اور انھوں نے خلافت کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ان
 کی سرکردگی میں نہا جرم کی ایک بڑی جماعت تحریک خلافت کے
 سلسلے میں احتجاج کے طور پر ہجرت کر کے کابل کی طرف روانہ ہوئی
 ان غریبوں کو آتے جاتے بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا،
 بوڑھے بہرام خاں بھی جن کی عمر اب نوے سال کے قریب تھی۔
 جانے پر تیار تھے مگر انھیں بڑی مشکل سے سمجھا بھجا کر روکا گیا۔
 سن ۱۹۴۷ء میں برطانوی حکام نے بادشاہ خاں کو محض نیشنل
 اسکول کھولنے کے جرم میں گرفتار کر لیا یہ آزاد مار سے "اس قدر
 مقبول تھے کہ ملاکٹ، باجور اور موات کے علاقوں سے بھی
 قبائلی اپنے بچوں کو ان میں پڑھنے کے لئے بھیجتے تھے، اور یہ حکام
 کی نظر میں بڑی خطرناک چیز تھی۔
 سر جان سیفی چیف منسٹر نے بادشاہ خاں کے والد

کہا تمہارے بیٹے کو کیا ضرورت ہے کہ وہ دوسرے کھوے جبکہ کسی اور شخص کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ باپ نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بیٹے نے جواب دیا "ابا جان فرض کیجئے کہ دوسرے لوگوں کو نماز سے دلچسپی نہ رہے تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ تم نماز ترک کر دو یا کہیں گے کہ چاہے جو ہو تم اپنا فرض پورا کرنے رہو۔"

باپ نے کہا "ہرگز نہیں، دوسرے کچھ بھی کریں، میں یہ کبھی نہ چاہوں گا کہ تم اپنے مذہبی فرض کو چھوڑ دو۔" "تو پھر ابا جان قومی تعلیم کا کام بھی اسی قسم کا ہے، اگر میں نماز چھوڑ دوں تو دوسرے کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

باپ نے جواب دیا "اچھا میں سمجھ گیا تم حق بجانب ہو۔" اس یار بادشاہ خاں کو تین سال قید سخت کی سزا دی گئی اور انہیں جیل کی ساری کڑیاں جھیلنی پڑی۔ قید تنہائی، مہینہ ایک ٹیریاں پہننا، چمکی پسندا وغیرہ۔ ان کا وزن بچپن پونڈ کم ہو گیا، اور جیل کی سختیوں کی وجہ سے انہیں فساد خون اور لڑکے درد اور دوسری طرح طرح کی شکایتیں نازل ہو گئیں۔ اس کے باوجود ان کا طرز عمل ایک مثالی قیدی کا سا رہا وہ ہنسی خوشی جیل کے فضا بطور کی پابندی کرتے تھے کبھی کوئی رعایت نہیں چاہتے تھے، مگر کبھی اپنے اصول سے نہیں ہٹتے تھے۔ جیل کے افسروں تک

پراس با اصول نامور قیدی کی تکلیفیں دیکھ کر بہت اشرموا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قاعدے کے مطابق جو سختیاں معنی چاہئیں انہیں ڈھیلہ کر دیں مگر بادشاہ خاں نے یہ درخواست کی کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ انہوں نے جیل کی بد عنوانیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ان کے افر سے ایک کانسلر نے یہ کہہ کر اسٹوٹ گارٹن دیا کہ وہ بغیر رشوت لئے ہوئے اپنا گزارہ نہیں کر سکتا۔ جیل کے افسر گیمبرائے اور انہوں نے بادشاہ خاں کو یہاں سے منتقل کر کے پنجاب کے گجرات جیل میں بھیج دیا۔ یہاں ان کی دیانت داری اور جیل کے ضابطوں کی پابندی دوسرے قیدیوں کے لئے ایک مصیبت ہو گئی۔ مگر وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس لئے کہ وہ ایک اور مشہور قیدی تمام کلارک کی طرح اس کے قائل تھے کہ "اگر آدمی اپنے اصول سے ہٹے تو نہ صرف حق کی بلکہ اپنی خود داری کی توہین کرتا ہے" جو اصول نا فرمانی کرنے والے کی سب سے بیش بہا دولت ہے۔

گجرات کے جیل میں منتقل ہونے کے بعد انہیں ایک زیادہ وسیع حلقے میں رہنے اور دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ خصوصاً بھگوت گیتا اور سکھوں کی گرنتھ صاحب کے مطالعے کا۔ ناہمی مفاہمت کی غرض سے انہوں نے اپنے ہندو ساتھیوں کے مشورے سے یہ تجویز پیش کی کہ گیتا اور قرآن کے

سبق ہوا کریں۔ یہ سبق کچھ دن تک ہوتے رہے لیکن آخر میں انھیں بند کرنا پڑا۔ اس لئے کہ گیتلے کے سبق میں میرے سوا اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا اور اسی طرح قرآن کے سبق میں بھی صرف ایک ہی طالب علم تھا۔

بہ خلاف ڈاکٹر خاں صاحب کے جو اکثر مذاق میں یہ کہا کرتے تھے کہ میرا بھائی میرے بارے کی نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔ "بادشاہ خاں نے کبھی نماز یا روزہ قضا نہیں کیا۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی نظر میں بڑی وسعت تھی۔ انھوں نے ایک بار مہادیو ڈیوانی سے کہا تھا "میں کسی مذہب کی قوت کا اندازہ اس کے پیروں کی تعداد سے نہیں لگاتا ہوں اس لئے کہ عقیدہ بجائے خود کوئی چیز نہیں۔ جب تک وہ انسان کی زندگی میں نہ ظاہر ہو۔ میرا یہ اعلان ہے کہ اسلام عمل، یقین اور محبت کا نام ہے اور ان صفات کے بغیر مسلمان کا لفظ محض باجے کی ایک جھنکار ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔ قرآن شریف میں صاف صاف آیا ہے کہ خدا کو وحدہ لا شریک ماننا اور نیک عمل کرنا انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔"

ایک اور موقع پر انھوں نے کہا تھا "میرے خیال میں ہمارے جھگڑوں کی جڑ یہ ہے کہ ہم اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہر مذہب میں اس کے پیروں کے لئے کافی ہدایت موجود ہے۔ قرآن میں صریح طور پر کہا گیا ہے کہ خدا نے سب قوموں کے لئے ہدایت

مقام

۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۳ء کے بیچ کا زمانہ تحریک آزادی کے لئے بڑی کشمکش کا وقت تھا۔ فرقہ وارانہ جذبات بھڑکے ہوئے تھے اور بہت سے لوگوں نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا تھا۔ لیکن خاں بھائی اس رو میں نہیں بہے اور ان کے قاصدوں کو کبھی لرزش نہیں ہوئی بلکہ وہ خاں ان تھک کوشش کرتے رہے اور انھوں نے پاپیادہ بڑے لمبے اور کٹھن سفر کر کے دیہات اور پہاڑی قلعوں میں قبائلیوں کو حق اور عدم تشدد کا پیام پہنچایا، اور بے ہتھیاروں کی لڑائی کا طریقہ، جو گاندھی جی نے پیش کیا تھا، سکھایا۔ اس کے بعد جب ۱۷۹۳ء کی کشمکش شروع ہوئی تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ میدان میں اتر آئے لیکن تعجب یہ ہے کہ اب تک ان کی گاندھی جی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ۱۷۹۳ء کے اجلاس کراچی میں وہ اور ان کے خدائی خدمت گار جن کی شہرت پہلے ہی دور دور پہنچ چکی تھی۔ پہلے گاندھی جی سے اور ان کے ساتھیوں سے جو مہاروستاں کے دوسرے حصوں میں کام کر رہے تھے، ملے۔

خدائی خدمت گاروں کی تحریک اصل میں ایک معاشرتی
 اصلاح کی تحریک تھی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ پٹھانوں کی
 اور بے آئینی لوٹ مار کی عادت چھڑائی جائے۔ انھیں محنت، کفایت شعاری
 اور خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے۔ انھیں باقاعدہ تعلیم دی جائے
 اپنی عزت کرنا اور خدا سے ڈرنا "جو بڑے بڑے لوگوں سے دور کر دیتا ہے"
 سکھایا جائے۔ ہمارے چل کر کے میں بادشاہ خاں نے یہ فیصلہ
 کیا کہ اپنے والوں کی چھوٹی سی جماعت کو ایک باضابطہ سیاسی
 جماعت بنادیں تاکہ وہ کانگریس کے پورے پروگرام پر عمل کرے
 خدائی خدمت گاروں کا نصب العین، جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر
 خلق خدا کی خدمت کے ذریعے سے خدا کی خدمت کرنا تھا۔ ان کو
 باقاعدہ ڈیڑل کرائی جاتی تھی اور فوجی طرز سے لمبے لمبے مارچ کرائے
 جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار یہاں تک کہ لاٹھی اور چھڑی
 تک نہ ہوتی تھی۔ وہ خدا کی ملت اور وطن کی وفاداری کا حلف
 اٹھاتے تھے۔ وہ سب کے سب اُس کے پابند تھے کہ خیال، قول
 اور عمل میں عدم تشدد سے کام لیں گے، اور اپنے ہم جنسوں کی
 بغیر کسی ذاتی صلے کی توقع کے خدمت کریں گے۔ انھوں نے یہ عہد کیا
 تھا کہ پاک بازی کی زندگی بسر کریں گے اور فرقہ پرستی سے دور
 رہیں گے۔ سرخ رنگ کے کرتے پہننا انھوں نے اس عرض سے اختیار
 کیا تھا کہ کھادی کے سفید کرتے بہت جلدی میلے ہو جاتے تھے

اور صوفیانہ سرخ رنگ پشاور کے اس پاس آسانی سے دستیاب ہوتا تھا (اپریل ۱۹۳۷ء عر تک خدائی خدمت گاروں کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہیں تھی۔ ۱۹۳۸ء ع میں یہ تعداد ایک لاکھ سے بڑھ گئی) گاندھی ارون معاہدے کے نتیجے کے طور پر جنوری ۱۹۳۷ء میں خان بھائی رہا کر دئے گئے۔ لیکن انھیں زیادہ دن تک آزاد رہنا نصیب نہ ہوا۔ خدائی خدمت گاروں کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے گاندھی ارون صلح کو اپنی فتح نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے شری جہاد ریڈیائی سے ذکر کیا تھا کہ ایک بار کیرٹے کے مشہور سر رابرٹ سینڈمین کے بیٹے کرنل سینڈمین اپنے گائڈ دوست کے ساتھ پشاور آئے اور ان کے انداز سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اس صلح سے بہت ناخوش ہیں اور دوسرے برطانوی افسروں کا بھی یہی خیال ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب جو پیدائشی اسپورٹس میں ہیں اور اپنے کالج میں کرکٹ کے کپتان تھے، کرکٹ کی روایات کو کبھی نہیں بھولے۔ انھوں نے ان کی تسکین دیتے ہوئے کہا "نہیں کرنل سینڈمین آپ اس خیال کو دل سے بالکل نکال دیجئے کہ آپ کو شکست ہوئی ہے۔ سیاسی زندگی ایک کھیل ہے جس میں غالب اور مغلوب کو اسی طرح تپاک سے ہاتھ ملانا چاہئے جیسے کرکٹ یافتہ بال میں۔ اور ہمارے آپ کے معاملے میں کوئی فتح شکست کا کوئی سوال ہی نہیں گزشتہ براہ کی چھوٹی ہے۔ نہ کوئی غالب ہے اور نہ مغلوب جب دونوں ایک

دوسرے سے رخصت ہونے لگے تو کرنل نے کہا "خیر ہمارے آپ کے پرانے تعلقات ہیں مجھے اُمید ہے کہ میرے گاڑڈوسے کو چار سڑک میں کوئی نازیبا کارروائی نہیں کرنی پڑے گی۔" انگریز افسر اس معاہدے کو اپنی ذاتی شکست سمجھتے تھے، اور اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ وہ بار بار معاہدے کی خلاف ورزی کرتے تھے اور خدائی خدمت گاروں کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ ۲۳ دسمبر کو چیف کمشنر نے انھیں دوبار میں شریک ہونے کی دعوت دی مگر انھوں نے اس وجہ سے کہ عام خدائی خدمت گاروں پر اب تک سختیاں جاری ہیں احتجاج کے طور پر دوبار میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ ۲۴ دسمبر کی رات کو وہ قریب قریب اپنے سارے خاندان کے ساتھ ایک آرٹوینس کے ماتحت گرفتار کر لئے گئے اور صوبہ سرحد کے باہر لے جا کر ایک غیر معین مدت کے لئے بند کر دئے گئے۔ یہ واقعہ عین اس وقت ہوا جب گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آ رہے تھے۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان سول نافرمانی کی دہائی
 تحریکوں کے دوران میں صوبہ سرحد میں ناؤر شاہی حکومت تھی۔
 سول نافرمانی کرنے والوں کی کھیتیاں جلا دی گئیں۔ غلے کے
 ذخیروں پر تیل چھڑک کر انھیں آگ لگا دی گئی۔ اور ان کے گھر بھی
 خاکستر کر دئے گئے۔ مارشل لا کا زور تھا۔ لاٹھی اور گولی چل رہی

تھی اور لوگوں کے ساتھ ایسا ذلت آمیز اور حشمانہ برتاؤ کیا جاتا تھا جویان سے باہر ہے۔ "سرخ پوشوں کو گولی سے مارنا صوبہ ہرحد میں برطانوی فوجوں کے لشکار اور تفریح سمجھا جاتا تھا وہ ننگے کر کے برطانوی سپاہیوں کی صفوں کے بیچ میں دوڑائے جاتے تھے اور یہ انہیں ٹھوکریں لگاتے تھے اور سنگینوں اور رائفلیں کی نوکریں چھرتے تھے۔ وہ مکانوں کی چھتوں سے گرائے جاتے تھے۔ گندے تالابوں میں ڈھکیلے جاتے تھے اور ان کے ساتھ ایسی نامناسب حرکتیں ہوتی تھیں کہ بعض عمر بھر کے لئے پابج ہو کر رہ گئے۔

پٹھان ایک خردوار اور حساس قوم ہے جنہذا ذلت پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔ خان بھائیوں کے ایک رشتے کے بھائی جنہیں خاندانی حالات سے مجبور ہو کر اپنی رہائی کے لئے ضمانت دینی پڑی، اپنی اس کمزوری پر اس قدر نادام ہوئے کہ اس کی تلافی کے لئے انہوں نے خودکشی کر لی۔ اُن کے دوستوں اور عزیزوں نے ہر حید سمجھایا کہ تم قانون کی خلاف ورزی کر کے پھر جیل خانے جاسکتے ہو مگر کچھ اثر نہ ہوا، وہ یہ لکھ کر چھوڑ گئے کہ اُن کی وجہ سے خاندان کی جو بے غنی ہوئی اس کی تلافی صرف اُن کی موت ہی کر سکتی ہے۔

ایک اور ممتاز سیاسی کارکن سید عبدالودود پاشا، جو ملاکنڈ کے قبائلی علاقے کے معزز مذہبی پیشوا اور زمیندار تھے،

تین سال سے قید تھے۔ اُن کے بوڑھے باپ نے جو مرنے کے قریب تھے، ان کی طرف سے ضمانت داخل کر دی تاکہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کی صورت دیکھ لیں۔ بیٹے نے جیل سے چھوٹ کر شرم کے مارے اپنے آپ کو گولی مار کر جان دے دی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ بچان کتنے عقصہ ور ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اس سارے زمانے میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہوا جس سے خدائی خدمت گاروں پر تشدد کا الزام اُسکے۔ ان میں سے بعض نے یہ دیکھ کر اب اُن کے لئے عدم تشدد کو نبھانا مشکل ہے خودکشی کر لی۔

۱۹۳۷ء میں خان بھائی پھر رہا ہو گئے۔ لیکن صوبہ سرحد میں اُن کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ بادشاہ خاں وردھا میں گاندھی جی کے پاس آ گئے۔ اُنھوں نے اپنی بیٹی کو (جو تعلیم کی غرض سے انگلستان میں تھیں) بلا کر وردھا کے مہلا آشرم میں، میرا بہن (یعنی ایڈمرل سلیڈ کی بیٹی مس سلیڈ) کی نگرانی میں داخل کر دیا جو گاندھی جی کے طرز زندگی سے متاثر ہو کر اُن کی وفادار رفیق بن گئی تھیں۔ یہ نوبر کے آخری ہفتے کا ذکر ہے۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو بادشاہ خاں بھائی گورنمنٹ کے ایک وارنٹ کے ماتحت ایک تقریر کی وجہ سے جو اُنھوں نے بھی میں عیسائی نوجوانوں کی انجمن کی دعوت پر کی تھی، پھر گرفتار کر لئے گئے اور تین سال قید سخت کی سزا دی گئی۔

۹۲ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ پھر گاندھی جی کے پاس پہنچے۔ اس سال وہ ورودھا میں سیٹھ جنالال بھاج کے مہمان تھے۔ لیکن اپنے وقت کا زیادہ حصہ گاندھی جی کے ساتھ سیوا گرام آشرم میں بسر کرتے تھے۔ اب یہی اُن کا گھر بن گیا تھا اور جب تک انھیں اپنے صوبے میں واپس جانے کی اجازت نہیں ملی، یہیں رہے یہ دونوں کے لئے بہت اچھا اور قابل قدر موقع تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہونے کا موقع ملا اور ان میں دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اور یہ دوستی روز بروز زیادہ گہری ہوتی ہوئی۔ اس طویل رفاقت کے زلزلے میں ان دونوں کا گھل مل کر رہنا کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی قدر و عزت کا برتاؤ کرنا اور اپنی اپنی واردات قلب ایک دوسرے سے بیان کرنا۔ یہ ایسے منظر تھے کہ حافظ اب تک اُن سے لطف اٹھا لے رہے ہیں گاندھی جی جنھیں فرقہ وارانہ اتحاد سے عشق تھا۔ بادشاہ خاں کو ساری مسلم جماعت کا نمونہ سمجھتے تھے۔ بادشاہ خاں سے بڑھ کر سچا مسلمان اس سے زیادہ متقی، دین دار، صاف دل، مخلص اور روادار آدمی کہاں مل سکتا تھا۔ اور بادشاہ خاں کو جو چیز گاندھی جی کی طرف کھینچتی تھی وہ ان کی شہرت یا ان کی سیاسی خدمات نہ تھیں۔ اس محبت اور عقیدت کا راز جو انھیں گاندھی جی سے تھی یہ تھا کہ وہ ان کے روحانی ہم سفر تھے۔ خدا پرست اور عبادت گزار، پاک باز

اور مرتاض، سدا حق سے لو لگانے والے اور چھوٹے سے چھوٹے کام میں اس کی مرضی پر چلنے والے۔

ایک بار بادشاہ خاں نے کہا "اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک مسلمان یا پٹھان میری طرح عدم تشدد کا قائل ہو۔ یہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے۔ اب سے چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام نے اپنی ساری کئی زندگی میں اس پر عمل کیا اور ان کے بعد سب لوگ جو کسی ظالم کے ظلم سے نجات پانا چاہتے تھے اس پر عمل کرتے تھے لیکن ہم اسے ایسے بھولے کہ جب گاندھی جی نے ہمارے سامنے پیش کیا تو ہم یہ سمجھے کہ وہ کسی الٹرے کے عقیدے کی تلقین کر رہے ہیں۔۔۔۔۔

ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ہمیں یہ بھولا دیا کہ سبق یاد دلایا اور اُسے قوم کے سامنے رکھا کہ وہ اسے اپنی شکایت کی چارہ چوٹی کے لئے استعمال کرے۔"

انھوں نے فرمایا "جب گاندھی جی کی زندگی میں کوئی معرکے کا وقت آتا ہے اور وہ کوئی اہم فیصلہ کرتے ہیں، تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں۔ یہ اس شخص کا فیصلہ ہے جس نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ اور خدا کبھی کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔"

ایک اور موقع پر کہا "میرے لئے یہ آسان نہیں کہ اُن کے فیصلے میں چون و چرا کروں، اس لئے کہ وہ ہر معاملے میں خدا سے ہدایت چاہتے ہیں۔ اور ہمیشہ اس کے حکم پر چلتے ہیں۔ میرے پاس

تو ایک ہی پیانہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیا ہے۔

۱۹۳۷ء میں کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۹۳۷ء کے انڈیا ایکٹ کے ماتحت ان وعدوں کی بنا پر جو وائسرائے نے کئے تھے صوبوں میں وزارتیں قبول کرے۔ خان بھائی اپنے ہاں انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے اس لئے وہ حکم جس کی رو سے انھیں صوبہ سرحد میں داخل ہونے کی ممانعت تھی اب تک نافذ تھا پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی انتخابات کی مہم کے سلسلے میں اس صوبے میں قدم رکھنے دیا گیا حالانکہ مسلم لیگ والوں کو جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے آئے تھے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ سرکاری افسروں نے کھلم کھلا خان بھائیوں اور کانگریس کے خلاف کام کیا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر خان صاحب کو بڑی اکثریت حاصل ہوئی اور وہ اپنی عدم موجودگی میں صوبے کی کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں انھوں نے وزیر اعظم کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں کانگریسی وزارت بنائی اور وہ لوگ جو کل تک راندہ قانون تھے، اپنے وطن کے حاکم بن گئے۔

فقیر منش بادشاہ خاں نہ تو الیکشن کے لئے کھڑے ہوئے اور نہ اپنے بھائی کی وزارت میں شریک ہوئے۔ اس کے بجائے انھوں نے خدمت کی کٹھن راہ اختیار کی۔ ان کو یہ یقین ہو گیا

تھا کہ سوا اس عدم تشدد کے جس کی گماندہی جی نے تعلیم دی ہے اور کسی چیز کے ذریعے سے ان کی قوم پوری اخلاقی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس میں خدمت کا جذبہ اور عدم تشدد کا عقیدہ کتنا گہرا تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہو گا جو نینگ انڈیا میں شائع ہوا تھا۔

”عدم تشدد قریب قریب میرا عقیدہ بن گیا ہے۔ میں ہاتا گاندھی کی اس سزا کو پہلے ہی مانتا تھا۔ لیکن میرے صوبے میں جو بے نظیر کامیابی اس تجربے میں ہوئی اس کی وجہ سے میں عدم تشدد کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔“

”مجھے یقین ہے کہ انشا اللہ میرا صوبہ پھر کبھی تشدد کی راہ پر نہیں چلے گا۔ ہم اس کے خونی بیر کی وجہ سے جس کے لئے ہم بدنام ہیں، عدم تشدد کے تلخ نتائج اچھی طرح جانتے ہیں یہ ہمارا طبیعت میں بڑا تشدد ہے۔ عدم تشدد کی تربیت حاصل کرنے میں خود سہارا ہی فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ پٹھان صرف محبت سے اور عقول بات سے خوش ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کا دل ہاتھ میں لے لیں تو وہ آپ کے ساتھ جہنم میں چلا جائے گا۔ لیکن دوسری بات آپ کے جنت میں بھی نہیں لے جاسکتی۔ محبت سے پٹھان قابو میں آجاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پٹھان دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان کے ساتھ کریں۔ ممکن ہے

کہ میں ناکام رہوں اور میرے صوبے میں تشدد کی ایک لہر دوڑ جائے میں قسمت کے فیصلے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن اس سے میرے عارم تشدد کے عقیدے میں ذرا بھی تزلزل نہیں ہوگا۔ اس چیز کی میری قوم کو اندر سب لوگوں سے زیادہ ضرورت ہے۔“

پندرہ برس تک بادشاہ خاں انگریزوں سے لڑتے رہے تھے۔ اس پر بھی ان کے دل میں تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء کی صلح کے دوران میں رابرٹ، برنیز سے ایک انٹرویو کے دوران میں کہا تھا ”اگرچہ انگریزوں نے مجھے قید کیا تھا لیکن میں اُن سے نفرت نہیں کرتا۔ میری تحریک صرف سیاسی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ میں سرخ پوشوں کو یہ تعلیم دیتا ہوں کہ اپنے ہمساویوں سے محبت کریں اور سچ بولیں۔ مسلمان ایک جنگجو قوم ہے وہ عدم تشدد کے عقیدے کی آسانی سے ماننے والے نہیں ہیں میں انھیں اس کے سکھانے کی اپنی سوشلسٹ کر رہا ہوں۔“

اس رات کو ”تنگے فقیر“ کے مصنف نے اپنی ڈائری میں عبدالغفار خاں کے متعلق یہ رائے لکھی تھی :-

”عبدالغفار خاں ایک نیک دل، حلیم اور قابل محبت آدمی ہیں۔ ان کو ایک خطرناک انقلابی سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے بوڑھے جارج لینن بری کو۔“

اگلے سال ۱۹۳۸ء میں بادشاہ خاں نے گاندھی جی کو دعوت دی کہ وہ اُن کے صوبے کا دورہ کریں اور خدائی خدمت گار تحریک کی رہنمائی فرمائیں۔ کانگریس وزارت کے قائم ہونے سے صوبہ سرحد میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اس صوبے میں برطانوی افسروں خصوصاً پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کانگریسی حکومت کا قائم ہونا بہت ناگوار تھا۔ وہ قبائلیوں کے ذریعے سے کانگریسی وزارت پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ اس میں انھیں اس دعوے کی وجہ سے جو صوبہ سرحد میں بھی بہت مدد ملی مثلاً گورنر بحیثیت صوبائی حکومت کے صدر کے تو آئین کی رو سے اس کا پابند تھا کہ وزیروں کے مشورے کے مطابق کام کرے لیکن قبائلی علاقوں کے معاملے میں وہ صرف دائرے کے ماتحت تھا، اور اس سے براہ راست تعلق رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ضلع کے کاموں میں تو وزارت کے ماتحت تھے لیکن قبائلی علاقے کے منظم کی حیثیت سے براہ راست پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سامنے ذمہ دار تھے۔ اور بغیر مجلس قانون ساز یا وزارت کی منظوری اور علم کے بالا بالا جو چاہیں کر سکتے تھے۔ وزارت کے تعلقات پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور فوج سے بگڑے ہوئے تھے اور اس کی وجہ سے سرکاری ملازموں کے کام میں اوجھڑپیں ڈھیل پائی جاتی تھی، اور جرائم بڑھ گئے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے

آخر میں جب برطانوی کینٹ کے ہارمی کے اعلان کے مطابق مرکز میں عارضی حکومت قائم ہوئی اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کے وائس پریسڈنٹ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں ملاکنڈ ایجنسی کے دورے کے لئے گئے تو ان کی موٹر کار پر قبائلیوں نے کمین گاہ سے جو حملہ کیا اس کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ اس میں سرکاری افسر کا ہاتھ ہے اور متعلقہ پولیٹیکل افسر کو اپنے فرض میں غفلت کرنے کی بنا پر سزا دی گئی۔ اس مخالفت کی ایک مخصوص علامت بنوں کا چھاپہ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کا فساد تھا۔ مثلاً ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۶ء تک کی سرکاری انتظامی رپورٹوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صوبے کے افسر سیاسی شورش کا علاج فرقہ وارانہ فساد کو سمجھتے تھے مثلاً ۱۹۱۹ء کی صوبہ سرحد کی رپورٹ کو لیجیے۔

ستمبر کے ابتدائی دنوں میں صوبہ سرحد کی سیاسی جدوجہد سرد پڑ گئی جس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ عبدالغفار خاں یہاں موجود نہ تھے۔ وہ مٹر گاندھی سے ملنے شملے گئے تھے، اور کچھ دن پنجاب میں ٹھہرنے کے بعد سردھے ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچے جہاں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں صلح کرانے کی ناکام کوشش میں ایک ہفتہ صرف کیا اور آگے چل کر یہ عبارت ہے:-

”اس عرصے میں ضلع میں سیاسی حیثیت سے بہت سکون

رہا۔“

اس وقت کی وزارت کے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور فوج کے آپس کے تعلقات بگڑ جانے کا یہ اثر ظاہر ہو رہا تھا کہ سرکاری ملازم احکام کی تعمیل نہیں کرتے تھے اور بد امنی بڑھ گئی تھی۔ ۱۹۳۷ء کی تیسری سہ ماہی میں پنڈت ہروداس عارضی حکومت کے نائب صدر کی حیثیت سے جڑہار می کے اعلان کے مطابق قائم ہوئی تھی، صوبہ سرحد میں تشریف لائے، اس موقع پر خدائی خدمت گاروں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ دس میل لمبے راستے کے دونوں طرف تھوڑی تھوڑی دیر کے فاصلے پر ان کی قطار اس سرے سے اس سرے تک چلی گئی تھی۔ لیکن ملاکنڈ ایجنسی میں بعض قبائلیوں نے ان کی کار پر کمین گاہ سے حملہ کیا۔ شبہ یہ تھا کہ اس معاملے میں سرکاری ملازموں کا ہاتھ ہے، اور متعلقہ پولیٹیکل افسر کے خلاف ادائے فرض میں غفلت کا الزام لگا کر اسے سزا دی گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ کانگریس کی عوامی حکومت ایسی صورت میں کیا کرے؟ قبائلیوں کو زبردستی دبانے کی کوشش پہلے کسی بار ہو چکی تھی اور ناکام رہی تھی۔ برطانوی حکومت نے ان پر گولہ باری بھی کی تھی جس سے ساری مہذب دنیا کو سخت دھچکا لگا، لیکن اس سے بھی قبائلیوں کو دبانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

جینر ۱۹۳۳ء میں جو کانفرنس ہوائی ترک اسٹیج کے لئے ہوئی تھی۔ اس میں مسٹر اینیٹی ایڈن نے برطانیہ کی طرف سے یہ

پہلے سے آگاہ کر دیا جائے تو ہم باری کرنے کے کوئی معنی نہیں۔
 اب رہا یہ عذر کہ قبائلی ہم باری سے ہلاک نہیں ہونے، اس لئے
 کہ انھیں پہلے سے آگاہ کر دیا جاتا ہے تو اس خدا ترس انگریز
 چارلی اینڈریوز کا قول سنئے :-
 ”پہلی آگاہی انھیں پہلے ہم سے ہوتی ہے جو ہوائی جہاز سے
 اُن پر گرایا جاتا ہے“

(صوبہ سرحد کا چیلنج ص ۹۴)

ایک تجربہ کریمٹہ کے مشہور انسپرار برٹ سین ڈمین نے کیا تھا
 کہ قبائلی علاقے میں پر امن طریقے سے داخل ہو کر قبائل کے سرداروں
 کی ہمت افزائی کی جائے اور اخلاقی اور مادی فائدے پہنچا کر
 انھیں اندر سے قابو میں لایا جائے۔ مگر یہ بھی کوئی اچھی بات نہ
 تھی۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی وجہ سے فرسودہ جاگیر داری
 نظام کو تقویت پہنچتی تھی۔ یہ بجائے خود سامراج کا ایک پہلو تھا
 آخر یہی طریقہ تھا جس سے برطانوی حکومت نے آہستہ آہستہ
 اور غیر محسوس طور پر اس سارے علاقے کا الحاق کر لیا جو اب
 بلوچستان کا صوبہ کہلاتا ہے اور ورہ گوئل تک راستہ صاف کر دیا
 حالانکہ پنجاب کے پولیسکال ڈیپارٹمنٹ والے مدت سے وزیرستان
 کے پہاڑوں کے سامنے پڑے ہوئے تھے اور اُسکے نہیں بڑھ سکے
 تھے۔ ڈیویز کے وقت سے ہر مصنف نے پٹھان قبائلیوں کے

جمہوری طریق زندگی اور اُن کے آزادی کے جذبے کا اعتراف کیا تھا۔ تو پھر کیا تعجب ہے کہ وہ سین ڈمین کی پالیسی کو اپنی آزادی کے لئے جو انھیں دل سے عزیز تھی، خطرناک سمجھتے تھے۔

بنوں مشن کے ڈاکٹر پینل نے کچھ اور ہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ بیٹھانوں کے درمیان جا کر بس گئے اور محبت اور نفیسی کے ساتھ ان کی خدمت کر کے انھیں عیسائیت کی طرف راغب کرتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، ان کا سال لباس پہنتے تھے، اُن کی زبان بڑی بے تکلفی سے بولتے تھے اور آخر انھوں نے اُن ہی لوگوں کی خدمت کرتے کرتے جان دی۔ وہ ہمیشہ بڑے سے بڑے سرکش پہاڑوں کے درمیان نہتے پھرتے تھے۔ اور ایک بار جب ایک فوجی افسر نے اس پر اصرار کیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک محافظ دستہ لے جائیں تو انھوں نے کہا کہ اس طرح تو لوگ یقیناً کمین گاہ سے گولی چلا کر مجھے مار ڈالیں گے اُن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ اکیلے پینل ”دو فوجی جہنمٹوں کے برابر ہیں“ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امن کے اس علم بڑا سا کتنا زیادہ اثر تھا۔

لیکن ڈاکٹر پینل کی یہ مہم محض ایک انفرادی کوشش تھی اور اس میں بھی ان کو عیسائی بنانے کی غرض پوشیدہ تھی۔ اس سے بھی اس اہم ترین سوال کا، جو اس دلی صفت انگریز اینڈریوز نے

کہا تھا، جواب نہیں ملتا "کیا ان تشدد کے طریقوں کے مقابلے میں جو آج تہذیب کو تباہ کر رہے ہیں، اخلاقی مزاحمت کی کوئی گنجائش ہے؟ کیا چینوں کے لئے کوریا، منچوریا شمالی چین میں اس طریقے سے جاپان کے تسلط کو روکنا ممکن تھا؟ کیا اس سے اطالوی کی جارحانہ پیش قدمی روکی جاسکتی تھی؟ کیا اسپین سے کام لیا جاسکتا تھا؟ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے دنیا کے ضمیر کو جارحانہ اقدام کرنے والے کے خلاف اس طرح اُبھارا جائے کہ اس کی کامیابی اخلاقی شکست بن جائے۔ کیا اخلاقی دنیا میں کوئی ایسی تدبیر ہے جس کی تاثیر جہانی قوت پر منحصر نہ ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ اس اخلاقی تدبیر سے کام لے کر منہارستان کی شمال مغربی سرحد پر قبائلیوں میں امن قائم کیا جاسکے؟

بادشاہ خاں ایران کی خدائی خدمت گار تحریک نے اس سوال کا جواب ایک حد تک دے دیا تھا۔ اب گاندھی جی وہاں جا کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سرے سے یہ سوال ہی باقی نہ رہے۔

پانچواں باب دہلی سے ایک خط کشکش

اپنے ہونے والے میزبان خان عبدالغفار خاں صاحب سے
ایک عرصے تک خط و کتابت کرنے کے بعد آخر ستمبر ۱۹۳۶ء میں
گماندہی جی سید اگرام سے اس ارادے سے روانہ ہوئے کہ صوبہ
سرحد کے خدائی خدمت گاروں کے درمیان ایک مہینہ گذاریں۔ یہ
اس دعارے کا ایفا تھا جو گماندہی جی نے خاں صاحب سے کیا تھا۔
اس اُمید پر کہ گماندہی جی راستے میں دہلی ٹھہریں گے، وہاں
کانگریس ورکنگ کمیٹی اور دو اور کمیٹیوں یعنی آل انڈیا چر خاسٹھ
اور جلیان والا باغ یادگار کمیٹی کے جلسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔
گماندہی جی کے دوستوں کی بڑی فکر تھی کہ کہیں ان جلسوں میں
شریک ہونے سے اُن کی صحت پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ ورکنگ
کمیٹی کا یہ جلسہ ایسے وقت میں ہو رہا تھا جب یورپ کے آسمان

پر جنگ کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب
 برسا ہی چاہتی ہے اس اہم ترین مسئلے پر بڑے زور شور سے
 بحث ہوتی رہی۔ لیکن ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہونے پایا تھا کہ
 دم بھر میں بادل چھٹ گیا اور مطلع صاف ہو گیا۔ کانگریس میں بعض
 لوگ اس خیال کے بھی تھے کہ انگلستان کی مشکلات سے فائدہ
 اٹھا کر اچھے سے اچھا سودا کر لینا چاہئے۔ مدتوں کے انتظار
 کے بعد ایسا موقع آیا ہے۔ لیکن گاندھی جی کے لئے یہ سخت روحانی
 کشمکش کا وقت تھا۔ خود ان کے لئے اور ہندوستان کے
 لئے آزمائش کی گھڑی تھی۔ اگر اس سودے میں ہندوستان
 سب کچھ پا جائے مگر اپنا ضمیر کھو بیٹھے تو کیا فائدہ؟ کوئی
 چوتھائی صدی سے گاندھی جی ملک کو اہنسا کا سبق پڑھا رہے
 تھے۔ اب ان کی عمر بھر کی تعلیم کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ دیکھنا یہ تھا
 کہ کانگریس اس نازک وقت میں کیا کرتی ہے؟ آیا اس میں اتنی
 ہمت اور طاقت ہے کہ جنگ یورپ کے پر آشوب دور میں
 اپنے خاص اہنسا کے عقیدے پر عمل کر کے دکھا دے؟ گاندھی
 جی نے ایک دوست سے کہا: "اگر کانگریس اس موقع پر اپنے
 اہنسا کے عقیدے پر پورا پورا عمل کرے تو ہندوستان کا نام
 امر ہو جائے گا۔ اس کا یہ کارنامہ دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے
 گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ابھی تک یہ محض میرا ایک خواب ہے۔"

ایک یادگار موقع پر انھوں نے لکھا تھا " اگر ہندوستان نے
 تلوار اٹھالی تو یہ وہ ہندوستان نہیں رہے گا جس کا میں خواب
 دیکھتا ہوں اور مجھے یہی کرنا پڑے گا کہ اپنے دکھے ہوئے دل کو
 سکون دینے کے لئے ہمالیہ کی راہ لوں " دہلی میں کچھ دوست
 گاندھی جی سے ملنے کے لئے آئے۔ اُن سے گفتگو کے دوران میں
 انھوں نے فرمایا " کچھ بھی ہو جائے ہم حکومت کے اُگے جھکنے کے
 نہیں۔ اگر حکومت سارے اختیارات کانگریس کے سپرد کرے
 تب بھی میں تو لڑائی سے الگ ہی رہوں گا، چاہے اور کتنی میل
 ساتھ نہ دے " ایک اور دوست نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ
 خطرے کے وقت آپ کی خالص اہنسا کی پیکار پر شاید ہی کوئی
 کان دھرے۔ اُن کے جواب میں گاندھی جی نے فرمایا " پچاس
 سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ ہوائی جہاز سچ مچ اُڑنے لگیں گے؟ تیس
 سال پہلے اس ملک میں کون کہہ سکتا تھا کہ ہزار ہائے گناہ مرد عورت
 اور بچے ہنستے کھیلنے جیل جانے پر تیار ہو جائیں گے؟ اہنسا سے
 ہتھیار کا کام لینے کے لئے فوق البشر ہستیوں کی ضرورت نہیں
 یہی معمولی مٹی کے پتلے اس ہتھیار کو چلا سکتے ہیں اور چلا چکے ہیں،
 بہر حال ورننگ کیٹی کے پندرہ ممبر اہنسا کا امتحان دینے کو تیار
 ہیں۔ مجھے تو اس کی بھی اُمید تھی " فی الحال یہ نازک وقت
 ٹل گیا ہے۔ مگر اس نے گاندھی جی کو چونکا دیا ہے۔ وہ اب اس

مسئلے پر گہرا غور کر رہے ہیں۔ انھوں نے اہنسا کا سبق یورپ کو بھی دینا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک مضمون میں فرماتے ہیں :-

”اگر میں چیکو سلواکیہ کا رہنے والا ہوتا تو ان دونوں قوموں دفرانسیسیوں اور انگریزوں کو اپنے ملک کی حفاظت کی ذمہ داری سے آزاد کر دیتا۔ مجھے کسی قوم یا جماعت کا دست نگر ہو کر رہنا گوارا نہ ہوتا، میں تو کامل آزادی حاصل کرتا یا فنا ہو جاتا۔ ہتھیاروں سے مقابلہ کر کے جیتنے کی کوشش کرنا تو محض اجڈ پن ہے۔ ہاں یہ ایک دوسری چیز ہے کہ جو لوگ میری آزادی چھیننا چاہتے ہیں ان کی طاقت کو خاطر میں نہ لا کر میں ان کی مرضی کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دوں اور اس کشمکش میں ہتھامار جاؤں۔ اس طرح میں اپنا جسم قربان کر دوں گا لیکن اپنی روح یعنی اپنی عزت کو بچا لوں گا۔ اب تک ہٹلر اور اس جیسے لوگوں کی امیدیں اس تجربے پر مبنی ہیں کہ لوگ ہمیشہ طاقت سے دب جاتے ہیں۔ نئے مردوں، عورتوں اور بچوں کا بغیر تشدد اور بغیر نفرت کے مزاحمت کرنا ان کے لئے ایک اذیٹکا تجربہ ہوگا۔ کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ بریترا اور پاکیزہ ترقوتوں سے متاثر ہو کر ان کی فطرت ہی میں نہیں ہے آخر ان کے جسم میں بھی وہی روح ہے جو میرے جسم میں ہے۔ (۳۸-۱۰-۸)

.....

جہیز امن کے سپاہی اٹھاتے ہیں۔

کو خدائی خدمت گاروں میں بھرتی ہونے کے لئے پیش کرنا ہوں۔

۱۲) میں ہمیشہ قوم کی خدمت، اور ملک کی آزادی کی خاطر تن من وھن قربان کر دینے کو تیار رہوں گا۔

۱۳) میں کسی فرقہ بندی میں شریک نہ ہوں گا۔ نہ کسی سے جھگڑا کروں گا، اور نہ دشمنی رکھوں گا۔ میں ہمیشہ مظلوم کو ظالم کے جوڑ و ستم سے بچاؤں گا۔

۱۴) میں کسی دوسری جماعت میں شریک نہیں ہوں گا اور عدم تشدد کی لڑائی کے دوران میں نہ کبھی ضمانت داخل کروں گا، نہ معافی مانگوں گا۔

۱۵) میں ہمیشہ اپنے افسروں کے ہر جائز حکم کی تعمیل کروں گا۔
۱۶) میں ہمیشہ عدم تشدد کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۷) میں ساری نوع انسانی کی یکساں خدمت کروں گا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہو گا کہ ملک کو کامل خود مختاری اور سب کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔

۱۸) میں اپنے ہر عمل میں سچائی اور پاک باری کو ملحوظ رکھوں گا۔

۱۹) میں اپنی خدشات کے لئے کسی صلے کی توقع نہیں رکھوں گا۔

۲۰) میری ساری خدشات خدا کی راہ میں ہوں گی۔ ان کا مقصد

جاہ و منصب یا کمزور دانش نہیں ہو گا۔

میں صوبہ سرحد میں اس لئے آیا ہوں بلکہ یوں کہنا چاہئے

کہ خان عبدالغفار خاں صاحب مجھے اس لئے یہاں لائے ہیں کہ جو کچھ اُن کے آدمی کر رہے ہیں اُسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں، اتنا تو میں ابھی سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں میں عدم تشدد پس واجبی ہی واجبی ہے، اُن کے پاس تو بے مے کے ایک ہی دولت ہے یعنی وہ عقیدہ جو اپنے رہنما پر رکھتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں امن کے ان سپاہیوں کو مکمل مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ میں ان کا ذکر اس سلسلے میں کر رہا ہوں کہ ایک سپاہی دوسرے سپاہیوں کو امن کی راہ دکھانے کی سچے دل سے کوشش کر رہا ہے۔ اس کی میں تصدیق کر سکتا ہوں کہ یہ ایک پر خلوص کوشش ہے اور خیر اس میں کامیابی ہو یا ناکامی اس سے آنے والے زمانے کے نتیجہ گر ہی سبق لیں گے۔ اس وقت تو میرا مقصد صرف یہ ہے اُن کے دل میں یہ بات اتر جائے کہ اگر عدم تشدد ان کے اندر اس سے زیادہ بہادری کا احساس نہ پیدا کر کے جتنا ہتھیاروں اور ان کے استعمال کی طاقت رکھنے سے ہوتا ہے تو انھیں اپنے عدم تشدد کو خیر باد کہہ دینا چاہئے اس لئے کہ پھر وہ عدم تشدد نہیں بلکہ بنوولی ہے، پھر تو انھیں اپنے ہتھیار دوبارہ سنبھال لینا چاہئے..... اور ظاہر ہے کہ اس سے ان کو خردوان کے ارادے کے سوا اور کوئی اور چیز روکنے والی نہیں..... سب سے بڑی

بہادری یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر طاقت کے سامنے غمراہ وہ
کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو جھکنے سے انکار کر دے۔ اور
اس انکار میں تلخی نہ ہو بلکہ وہ اس عقیدے میں ڈوبا ہوا
ہو کہ زندگی صرف روح کو حاصل ہے، اور کسی چیز کو نہیں۔

چھٹا باب

سرحدی گاندھی

گاؤں میں

خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کی یہاں نوازی کا کرشمہ ہے کہ گاندھی جی کی صحت کے بارے میں جو اندیشے تھے ان کے برعکس انھیں صوبہ سرحد کی آب و ہوا بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ابھی تک سرحدی بہت زیادہ نہیں ہوئے ہیں خوش گوار خشکی ہے۔ ان کے میزبان انھیں زیادہ سے زیادہ آرام لینے کا موقع دے رہے ہیں۔ ان سے زیادہ ہمدرد اور دلسوز "جیلر" گاندھی جی کو آج تک نصیب نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کو پوری آزاوی دے رکھی تھی کہ اپنا مسئلہ خاموشی کا نسخہ استعمال کریں، جس طرح جی چاہے اپنا وقت گزاریں نہ کوئی عام جیلے ہوئے ہیں اور نہ ملاقاتیں، گفتگو بھی قریب قریب

بند ہے یہاں تک کہ پرچے کچھ کو بھی اظہار خیال نہیں کرتے۔ امیرسن کی بابت کہا جاتا ہے کہ جب وہ انگلستان میں چلیسی کے حکیم کارلائل سے ملنے کو گیا تو دونوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس خاموش ملاقات کے بعد امیرسن نے چلے وقت کہا "جناب ہمارے گفتگو خراب رہی۔ اس کے جواب میں کارلائل نے جو خاموشی کی برکتوں کا دل سے قائل تھا، صرف اتنا کہا "جی ہاں اور کتنی فصیح و بلیغ" مجھے یقین ہے کہ اگر گاندھی جی چاہتے تو بادشاہ خاں اس کے لئے تیار ہو جاتے کہ انھیں ایسا دورہ "کرائیں جس میں ذرا بھی نقل و حرکت نہ ہو۔ ان کا ایسا پروگرام بنائیں جس میں کوئی مصروفیت نہ ہو، اور آخر میں ان سے یہ کہلائیں "جناب ہمارا دورہ خوب رہا" جب تک بادشاہ خاں کے چاروں طرف ان کے وطن کے جانے پہچانے مناظر نہ ہوں، اور وہ اپنے علاقے کی تازہ ہوا اور آزاد فضا میں سانس نہ لے سکیں۔ ان کی طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔ صرف بادشاہ خاں ہی کی نہیں، ہر شہان کی یہی فطرت ہے بڑے شہروں کی آبادی، جذبات میرست، ریاکار اور خود غصہ ہوتی ہے، اور بادشاہ خاں کو ان چیزوں سے چڑھے۔ اسے لئے وہ گاندھی جی کو چار روز کے قیام کے بعد ۹ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو پشاور سے اپنے اتران زئی کے مکان میں لے آئے۔

نہایت خوش نامر عزار کے درمیان دریائے سوات کے کنارے

اتان زنی کا چھوٹا سا گاؤں خاص دل کشی رکھتا ہے۔ اس پاس
 میلوں تک مٹی، گتے، ذال کی پھلیوں اور کپاس کے ہرے بھرے
 کھیت چلے گئے ہیں۔ اور ان کے بیچ میں پھل دار درختوں کے
 باغ ہیں جن میں طرح طرح کے بہترین پھل۔ سرخ ملٹے، اڑو
 آلچے، انگور، خوبانی اور سیب پھلتے ہیں۔ زمین زرخیز ہے اور
 پانی افراط سے ہے اس لئے کہ دریائے سوات سارے علاقے
 کو سیراب کرتا ہے اور اس کے بے شمار چھوٹے چھوٹے آبشاروں
 کی سرری آواز دن رات فضا میں گونجتی رہتی ہے۔ گاؤں کے
 ایک سرے پر ایک چھوٹی سی خوش نما پن چکی ہے۔ یہاں قدامت
 کی ایک عجیب فضا نظر آتی ہے جس پر زمانے کی بدیلی کا کوئی اثر
 نہیں۔ گاؤں کے غریبوں، امیروں۔ سب کے مکانات عام طور
 پر کچے ہیں۔ ان کی دیواریں چوڑی اور چھتیں موٹی موٹی لکڑیوں
 سے بنی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے وہ گرمی میں ٹھنڈے اور جاریاں
 میں گرم رہتے ہیں بعض مکان اب بھی پرانے پٹھان طرز کے
 بنائے جاتے ہیں جن میں آگے ایک حجرہ اس کے بعد ایک صطبل
 اور سب سے پیچھے رہنے کا مکان ہوتا ہے۔ حجرے میں آج کل
 نوکر رہتے ہیں۔ لیکن پرانے زمانے میں یہ گائروں کے کلب کا کام
 دیتا تھا جہاں مرد جمع ہو کر گپ شپ کرتے تھے اور حقہ پیتے تھے
 کنوارے نوجوان اپنے گھر کے بجائے یہاں سوتا زیادہ پسند

کرتے تھے مجھے بتایا گیا کہ پرانے زمانے میں جب بدامنی کا موز
 مدہ تھا۔ صطبل میں دن رات گھوڑے کے کسائے تیار رہتے
 تھے۔ تاکہ ضرورت کے وقت خان دم بھر میں سوار ہو کر روانہ
 ہو جائے۔ آج کل اعلیٰ درجے کی پکی سڑکوں کی وجہ سے
 جن کا صوبہ سرحد میں جال بچھا ہوا ہے اور آمدورفت کی سہولت
 افزوں آسانیوں کی بدولت قریب قریب سب صطبل خالی
 نظر آتے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں کوئی گھوڑوں کا شائق اب بھی
 پرانی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سڑکیں صوبہ
 سرحد پر برطانوی سامراج کی فوجی مصلحتوں کی وجہ سے بطور
 تحفے کے نازل ہوئی ہیں اور ان کا خرچ مفت میں غریب
 ہندوستانی رعایا کے سر پر آن پڑا ہے۔ سول نافرمانی کے
 زمانے میں پکی سڑکیں جرم بغاوت کے انعام اور سزا دونوں
 کا کام دیتی تھیں۔ جو گاؤں عدم تشدد کی خلیج میں زیادہ
 سرگرمی دکھاتا وہاں تک ایک پکی سڑک بنادی جاتی تاکہ
 گاؤں والوں کی آسانی سے گوشمالی کی جاسکے۔ گاؤں میں نہ
 باقاعدہ نالیاں ہیں، نہ بند رو اور نہ ہی میونسپلٹی کی طرف
 سے گندے پانی کے نکالنے کا کوئی بندوبست۔ گلیوں کے
 بیچ میں ایک چوڑا سا نالہ آہستہ آہستہ بہتا چلا جاتا ہے۔ بیچ
 میں کہیں کہیں اس کا پانی پھیل جاتا ہے اور سیاہ بدبو والہ

کیچڑ کے چڑ سے لگ جاتے ہیں۔ تھوڑی دور جا کر وہ بالکل رک جاتا ہے اور ہوا کو معطر کرتا ہے۔ لوگ ابھی تک صفائی کی قدر و قیمت سے واقف نہیں۔ ان سب باتوں کا گاندھی جی کے دل پر بہت اثر ہوا اور آگے چل کر انھوں نے پشاور میں خدائی خدمت گاروں سے جو گفتگو کی وہ اس موضوع پر تھی۔

گاندھی جی کے قیام میں اتان زئی کے بارے میں ایک چھوٹی سی بات غلط مشہور ہو گئی ہے اور اس نے کئی دوستوں کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ یہاں اس کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ چونکہ بادشاہ خاں کو گاندھی جی کی حفاظت کی بہت زیادہ فکر تھی اس لئے ان کے قیام اتان زئی کے دوران میں بادشاہ خاں اپنے مکان کی چھت پر راتوں کو خدمت گاروں کا پہرہ لگا دیتے تھے۔ اس سے پہلے بادشاہ خاں نے گاندھی جی سے اس کے متعلق گفتگو کی تھی، مگر اپنی تجویز انھیں نہیں بتائی تھی۔ انھوں نے صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ کے پہرہ لگانے پر کچھ اعتراض ہے۔ گاندھی کا خاموشی کا دن تھا۔ انھوں نے بغیر یہ جانے ہوئے کہ ان پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہونے والی ہے اشارے سے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بادشاہ خاں نے اس کے معنی یہ سمجھے کہ وہ اس پر راضی ہیں کہ رات کو مسلح پہرہ لگا دیا جائے مگر جب گاندھی جی کو معلوم ہوا

کہ مسلح گارڈ تعینات کیا گیا ہے تو اٹھوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ میں دوسروں کے لئے چوکی پہرے کے خلاف نہیں ہوں مگر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میری حفاظت کے لئے مسلح گارڈ سے کام لیا جائے۔ یہ تو میرے عمر بھر کے ستموں کے خلاف ہو گا۔ بادشاہ خاں نے یہ سوال سوچا تھا کہ چونکہ ہتھیار صرف ان لوگوں کو دھمکانے کے لئے ہیں جن سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے اور ان سے کام لینا مقصود نہیں ہے اس لئے غالباً گاندھی جی کو ان کے رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اس مسئلے پر دنوں میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی۔

گاندھی جی نے کہا "خان صاحب یہ بات جو آپ نے کی اس پر مجھے ایک حکایت یاد آتی ہے۔ ایک دفعہ سانپ الدرمیاں کے پاس گیا۔ الدرمیاں نے کہا میں تیرا زہر نکال لیتا ہوں۔ سانپ نے کہا۔ چاہے زہر نکال لے، مگر چھنکار میرے پاس رہنے دے۔ الدرمیاں نے کہا۔ اگر چھنکار رکھنی ہے تو زہر بھی رکھ لے۔ مگر آدم کی اولاد تجھے مار ڈالے گی۔ سو آپ نے بھی چھنکار بانی رکھی تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔ پہرہ اگر رکھنا پڑے تو بے شک رکھو مگر بند مق کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ کچھ دن ہوئے سیوا گرام میں بھی ایک ایسا ہی قصہ ہو گیا تھا مگر میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے پولس کی حفاظت کی ضرورت نہیں، مرنا تو ایک روز ہے ہی

تو پھر چاہے کوئی ہاتھ سے مار ڈالے یا بیماری سے مر جائے اس میں
فرق کون سا ہوا؟

بادشاہ خاں۔ ہم صرف ایک آپ کی ذات کی حفاظت تھیڑا ہی
کرتے ہیں۔ آپ کی حفاظت میں تو ہندوستان کی حفاظت آجاتی
ہے۔ ہمارے صوبے کی آبرو کی حفاظت آجاتی ہے۔ اگر آپ کو
کچھ نقصان پہنچا تو ہمارے صوبے کو ہیشہ کے لئے بڑھ لگ جائے گا۔
گاندھی جی کے نزدیک یہ چھوٹا سا واقعہ ایک اور بڑے مسئلے پر
روشنی ڈالتا ہے جو ہمیں درپیش ہے۔ جس طرح سے ایک سستی گرمی
اپنی ذات کی حفاظت میں ہتھیار سے کام نہیں لیتا۔ اسی طرح
ہندوستان تشدد سے پاک سوراخ حاصل کرنے کے لئے اس
قابل ہونا چاہئے کہ سرحد پار کے قبائل کے حملوں سے اپنے آپ کو بغیر
پوس اور فرج کی مدد کے محفوظ رکھ سکے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں صوبہ
سرحد میں ایک لاکھ خدائی خدمت گار ہیں جنہوں نے عدم تشدد کا
حلف اٹھایا ہے۔ گاندھی جی نے کہا کہ اگر ان لوگوں کا عدم تشدد
محض وقتی مصلحت یا زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ بہادریوں کا سچا
عدم تشدد ہے تو ان کو اس قابل ہونا چاہئے کہ سرحد پار کے حملہ آوروں
کو محبت اور خدمت کے ذریعے اپنا دورست بنا لیں اور ان کی غارت
گری کی عادت چھڑا دیں۔ اگر ایسا ہوا تو وہ ہندوستان کو آزاد
کرا لیں گے اور ساری دنیا کے لئے نمونہ بن جائیں گے۔

گاندھی جی نے بادشاہ خاں سے گفتگو کے دوران میں اپنے دل کی بات بتائی۔ انھوں نے کہا کہ ”اگر کانگریس کی وزارت بغیر پولیس اور فوج کی مدد کے ان حملوں کی روک تھام نہ کر سکے تو ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت سے استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ اگر ہمارا یہی رویہ رہا تو ہم دن بدن کمزور ہوتے جائیں گے اور آخر میں شکست کھا بیٹھیں گے۔ عقل مند آدمی شکست کا انتظار نہیں کرتا۔ اس سے پہلے ہی سمجھ جاتا ہے کہ یہاں میری دال نہیں گلے گی، اور رخصت ہو جاتا ہے برسوں سے جب کہ میری آپ سے جان پہچان بھی نہ تھی، میری یہ آرزو تھی کہ قبائلی علاقے میں جاؤں، کابل تک پہنچوں اور ان ڈاکوؤں کے ساتھ جا کر رہو اور ان سے پوچھوں کہ کیوں آپ لوگ ایسے کام کرتے ہیں۔ یہ میرا ایک پرانا خواب ہے۔ آئیے ہم اور آپ یہ کیوں نہ کریں کہ ان کے پاس چلیں، ان کی ذہنیت کو سمجھیں اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے پیش کریں اور ان سے دوستی اور ہمدردی کا زندہ رشتہ قائم کریں۔ امن قائم کرنے کی اصلی تدبیر یہی ہے اگر ہم ایسا کر سکیں، تبھی سرخ پوشوں کا جو یہ اتنا بڑا شک ہم نے بنا رکھا ہے کسی کام کا ہے ورنہ بے کار ہے۔“ پھر سرخ پوشوں کے سالاروں کو مخاطب کر کے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا ”میرے یہاں آنے کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ میں یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ خدائی خدمت گار کیا ہیں۔ اگر اس میں

چھ مہینے بھی صرف ہو جائیں تو مجھے اس کی پروا نہیں کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ جس راستے پر مجھے چلنا ہے وہ صاف نظر آجائے میں جو کچھ بھی کر سکتا ہوں اسی صورت میں۔ جنوبی افریقہ میں مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کون میرا ساتھ دے گا اور کیا نتیجہ ہو گا مگر مجھے اس کی کچھ پروا ہی نہ تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ کام مجھے کرنا ہی اور اگر اس میں میری جان بھی جائے تو کچھ ہرج نہیں۔ کیونکہ مجھے راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ بس میں اللہ کا نام لے کر میدان میں آگیا اور اس کا نتیجہ بھی اچھا نکلا۔ اس سے پہلے چین وہاں سے نکالے جا چکے تھے۔ ہماری تعداد چینیوں سے کہیں کم تھی اور ہم گولی سے اڑائے جاسکتے تھے۔ اور جنرل سٹمس نے جدوجہد کے شروع میں اعلان بھی کیا تھا کہ میں ان لوگوں کو یہاں سے نکالے بغیر نہ رہوں گا۔ مگر آخر کار اسی جنرل سٹمس کو کہنا پڑا کہ ان لوگوں پر کتنا بھی تشدد کروں یہ عداوت کا جواب عداوت سے نہیں دیتے مارنے پر بھی جواب میں ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اگر وہ گالی کا جواب گالی سے دیں تو میری تشدد کرنے کی طاقت بڑھتی ہے مگر یہاں تو مجھے سمجھنا کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔

یہاں تو بادشاہ خاں جیسی ایمان دار اور خدا پرست ہستی ہمارے ساتھ ہے۔ انھوں نے ہزاروں پٹھانوں سے ہتھیار چھڑا دیئے۔ آگے چل کر کیا ہو گا، یہ میں نہیں جانتا، ہو سکتا ہے کہ ان

خدائی خدمت گاروں میں سب کے سب خدا کی خدمت کرنے والے
 نہ ہوں۔ پھر بھی جتنا کچھ ہے وہی بہت ہے۔ کیا اگر ان میں سے
 کسی کو ابلتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں جھونک دیا جائے تو وہ خدا
 کا نام لیتا ہوا بغیر کسی قسم کے دُر کے بادل لینے کے خیال کے جان دے
 نہ گا؟ یہ تو بڑا اونچا درجہ ہے۔ تلوار سے لڑنے میں بھی بے شک
 بہادری ہے۔ مگر مارنے سے زیادہ بہادری مرحلے میں ہے
 جو بغیر دُر کے دشمن کو ایذا پہنچانے بغیر مرتا ہے، وہی سچا بہادری
 اور وہی میرے نزدیک سچا شہید ہے۔ مار کر مرنے والا نہیں۔ اگر
 ہمارا اگر اہل ملک اتنا کر دکھائے تو یورپ کی تو بات ہی کیا ہے۔ ان
 کے پاس تو اتنا ساز و سامان ہے۔ اگر وہ لوگ اس بات کو سمجھ لیں
 کہ تھڑی تعداد میں ہوتے ہوئے ہتھیار لے کر نکلنے میں تو بہادری
 ہے ہی۔ مگر اس سے کہیں زیادہ بہادری بغیر ہتھیار کے نکلنے میں
 ہے تو وہ لوگ خود بھی بچ سکتے ہیں اور دنیا کو بھی ایک بڑا سبق
 سکھا سکتے ہیں۔

انھوں نے خان صاحب سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ
 سے زیادہ تعداد میں خدائی خدمت گاروں سے دل کھول کر بات
 چیت کروں تاکہ میں ان سے اور وہ مجھ سے اچھی طرح واقف
 ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اتان زئی کی چار سہہ تحصیل میں تیرہ سالاروں
 سے، گیارہ اور بارہ تاربخ کوٹے اور پشاور میں پندرہ تاربخ کو

ایک اور جماعت سے۔ دونوں جگہ ان لوگوں نے گاندھی جی کے سوال کے جواب میں انہیں یقین دلایا کہ وہ عدم تشدد کے اصول کو دل سے مانتے ہیں اور پوری طرح سے مانتے ہیں یہاں تک کہ جب گاندھی جی نے اُن سے پوچھا کہ بہ فرض ممال اگر بادشاہ خاں عدم تشدد کی راہ سے قدم ہٹالیں تو تم کیا کرو گے؟ تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم کسی حال میں عدم تشدد کو نہیں چھوڑیں گے۔

خدا فی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ بتا رہی حالات کرتے ہوئے گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے :-

میں یہاں آپ سے ملنے کے لئے اور یہ دیکھنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ عدم تشدد میں کہاں تک پہنچے ہیں۔ بادشاہ خاں سے آپ کو عقیدت ہے۔ اُن کے کہنے سے آپ نے لاٹھی بناروق چھوڑ دی ہے۔ خدا ان کو بہت دنوں تک سلامت رکھے۔ لیکن آخر کار ہم سب کو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہو گا اور بادشاہ خاں کو بھی یہ دن پیش آئے گا۔ سوال یہ ہے کہ ان کے بعد آپ کیا کریں گے۔ ابھی سے اخباروں میں لوگ بادشاہ خاں کو گالیاں دینے

لگے ہیں۔ مجھے ان سے بھی زیادہ گالیاں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں یہاں آپ لوگوں کی طاقت چھیننے کے لئے آیا ہوں۔ صوبہ ہزار ہی ایک ایسا صوبہ ہے جسے ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کی دیا رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں کے لوگ بہادر ہیں، لاٹھی اور بندو

رکھتے ہیں۔ میں ہتھیار چھین کر انھیں بزدل بنادوں گا، ہتھکنا دوں گا اور اسلام کی اس دیوار کو گرا دوں گا۔ ایک حد تک میں ان کی بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں، لیکن اگر آپ عدم تشدد کی طاقت کو سمجھ گئے ہیں تو بندوبست اور لالچھی چھوڑنے پر آپ اپنے اندر پہلے سے بھی کچھ زیادہ طاقت محسوس کریں گے۔ یہ طاقت روحانی ہوگی اس کے ذریعے سے آپ صرف اسلام ہی کو نہیں بلکہ باقی سب مذہبوں کی بھی حفاظت کر سکیں گے۔ لیکن اگر آپ اس کو پوری طرح نہیں سمجھے اور ہتھیار چھوڑ کر اپنے کو پہلے سے زیادہ طاقتور نہیں بلکہ کمزور محسوس کرتے ہیں تو آپ اس اصول کو چھوڑ دیں۔ میرے اثر میں اگر ایک بھی پٹھان بزدل یا نکمبا بنے۔ اس کو میں کبھی گوارا نہیں کروں گا۔ اس سے تو مجھے یہ اچھا لگے گا کہ آپ ایک کے بجائے دو بندوبست کریں آج سیکھ کہتے ہیں کہ اگر ہماری کرپان چھین گئی تو ہمارا سب کچھ چھین گیا وہ سمجھتے ہیں کہ کرپان ہی ان کا مذہب ہے۔ کرپان چھوڑ دیں گے تو بزدل بن جائیں گے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ ان کا یہ خیال غلط ہے اور یہی بات میں مسلمانوں سے بھی کہتا ہوں، آپ نے قرآن شریف پڑھا ہے، اور میں نے بھی پڑھا ہے، اتنی ہی عقیدت کے ساتھ جیسی عقیدت سے گیتا پڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ انگریزی اور وہ زبان میں اسلام پر اور بھی اچھی کتابیں ہیں، وہ بھی پڑھی ہیں میرے دل میں اسلام کی اور دوسرے مذہبوں کی اتنی ہی عزت

ہے جتنی اپنے مذہب کی ، میں آپ سے پھر روز الفاظ میں یہ کہنا
 چاہتا ہوں کہ گواہ اسلام میں خوں ریزی تو بہت ہوئی ہے اور
 دین کے نام پر ہوئی ہے ۔ مگر اسلام نہ تو تلوار کے ذریعے آیا ہو
 نہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے ۔ اسی طرح عیسائیت کے لئے بھی بہت
 تلوار چلی ہے ، لیکن عیسائی مذہب تلوار کے زور سے نہیں پھیلا ۔ ہاں
 تلوار ہاتھ میں لے کر ان لوگوں نے مذہب کے نام کو ربڑ ضرور لگایا
 ہے ۔ آج یورپ میں کروڑوں آدمی اپنے آپ کو عیسائی کہتے اور
 حضرت عیسیٰ کی محبت کا دم بھرنے کے باوجود آپس میں لڑتے اور ایک
 دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں یہ حضرت عیسیٰ کا بتایا ہوا راستہ نہیں
 بلکہ ان کی تعلیم کا مضحکہ ہے جو چیریں میں نے بتائیں اگر آپ بعض
 سمجھ گئے ہیں تو آپ یورپ کو بھی راستہ دکھا سکتے ہیں وہاں
 لوگوں پر بھی اپنا اغڑ ڈال سکتے ہیں ۔ آج سترہ ہزار انگریزوں کا
 لشکر ہمارے اوپر حکمراں ہے ، کیونکہ ان کے پیچھے انگریزی سلطنت
 کی طاقت ہے ۔ اگر ہمارے سرخ پوش پکے خدائی خدمت گار
 ہیں ، تلوار ، بندوق کو چھوڑ کر ان میں جو روحانی طاقت آگئی ہے
 اُسے محسوس کرنے لگے ہیں اُسے پہچان گئے ہیں ۔ تو ایسے صرف
 دس ہزار سپاہی ہماری آزادی کے لئے کافی ہیں ، کیونکہ ان کی پیڑ
 پر خدا کی طاقت ہوگی ۔ لیکن اگر ایک لاکھ کیا دس لاکھ بھی زبان سے
 عدم کشد کا دعوے کریں اور نل میں تشدد موجود ہو تو وہ نکتے

LIBRARY

ثابت ہوں گے۔ ہمیں اگر تلوار چھوڑنی ہے تو اس لئے کہ وہ ہمیں بزدل بناتی ہے، سچا بہادر نہیں بناتی، لیکن اگر تلوار چھوڑنے کے بعد بھی جو چھوڑنے کی چیز تھی وہ ہم نے نہ چھوڑی اور ہمارے دل میں تشدد ہی بھرا رہا تو اس صورت میں صرف ہاتھ سے تلوار چھوڑ دینا نہ صرف بے سود بلکہ خطرناک بھی ہے۔

دل سے تشدد نکال دینے کے آخر کیا معنی ہیں؟ اگر دل میں ٹی کوئی طرف سے غصہ اور ڈر موجود ہے تو سمجھو کہ ابھی دل سے تشدد دور نہیں ہوا۔ عدم تشدد کو پہچاننے کے معنی ہیں کہ ہم اس کی طاقت کو پہچانیں۔ روحانی قوت کو پہچانیں، اور خدا کو پہچانیں۔ خدا کو پہچاننے والے کے دل میں غصہ آہی نہیں سکتا۔ ڈر رہ ہی نہیں سکتا۔ خواہ اشتعال اور ڈر کا سبب کتنا ہی بڑا ہو۔ آپ میری لڑکی کو چھیننا چاہتے ہیں تو میں کیا کروں؟ بندوق سے مقابلہ تو کر سکتا ہوں، مگر دل میں یہ سوچوں گا کہ میری یا کسی اور انسان کی طاقت کیا۔ اصل طاقت تو خدا کی ہے اور آخر میں وہی پکاتا ہے میں اڑوں گا نہیں بلکہ میں ڈاکو سے کہوں گا کہ میں نے تیرا کچھ نہیں بگاڑا، اور نہ میری لڑکی نے کچھ بگاڑا ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی تو اسے چھین کر لے جانا چاہتا ہے تو میرے جیتے جی ایسا نہیں کر سکتا پہلے مجھے مار ڈال پیچھے شاید لے جاسکے۔ میں سوچوں گا کہ اگر میں لڑا اور وہ ایک کو مار بھی ڈالا تو بھی آخر میں جو باقی رہیں گے وہ

مجھے اردو لیں گے اور لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس کے
 برعکس میں نہیں لڑتوں۔ کسی پر غصہ نہ کروں بلکہ صرف خدا سے
 دعا کرتا رہوں کہ انھیں سیدھا راستہ دکھائے، اور اسی طرح
 دعا کرتے کرتے مر جائوں تو ممکن ہے کہ ڈاکوؤں کا دل کھلے یا میری
 مثال سے میری لڑکی میں بھی اتنی ہمت اور طاقت آجائے کہ وہ
 اپنی حفاظت کے لئے جان دینے کو تیار ہو جائے۔ لڑنے سے
 زیادہ بہادرانہ اور پُر اثر یہ راستہ ہے، لڑکر بھی میں اس سے
 زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ جو آدمی تلوار چھوڑے اُسے بے کار نہ رہنا
 چاہئے۔ بے کار رہنے سے دماغ میں طرح طرح کے فاسد
 خیالات آتے ہیں جس سے انسان کا اخلاق بگڑتا ہے دماغ بھی
 جس نے تشدد کو چھوڑا ہے وہ تو چہرہ میں گھنٹے خدا کا نام لے گا اور
 خدا کا کام کرے گا۔ بے کاریا برے خیالات اس کے دل میں کھینچیں
 آسکتے۔ آج سرحد پار کے رہنے والے بعض لوگوں کا پیشہ ڈاکہ زنی
 ہے۔ چونکہ ان کے ہاں کھانے کو نہیں ہے۔ اسی لئے وہ ڈاکہ ڈالتے
 ہیں۔ پھر دشمنی اور بعض دوسری باتیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔
 اگر ہمارے پاس ایک لاکھ خدائی خدمت گار ہیں اور وہ سچے
 خدائی خدمت گار ہیں تو وہ ضرور ان لوگوں پر اپنا اثر ڈالیں
 گے۔ جیسا کہ رسولِ نافرمانی کے زمانے میں ہوا تھا، وہی اب بھی
 ہوگا۔ اور ڈاکہ زنی وغیرہ سب ختم ہو جائے گی۔

جیسے بندوبست کی لڑائی کے لئے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ ویسے ہی عدم تشدد کے لئے تیاری اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ مگر وہ تعلیم فوجی تعلیم سے مختلف ہوگی اور وہ تعلیم ہوگی تعمیری کام کی اور خلق خدا کی خدمت کی۔ ہمیں لکھنا پڑھنا آنا چاہئے۔ تاکہ ہم ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والے ہم وطنوں کے خیالات، ضروریات، وقتوں اور مصائب سے واقف ہو سکیں۔

میرے نزدیک آج کل کی صورتِ حالات میں خدمتِ خلق کا بہترین ذریعہ چرچہ ہے جسے میں نے مشفقانہ عین دریافت کیا تھا مجھے یقین ہے کہ چرچے کو کھوکھلی میں نے اپنی طاقت کھو بی ہے۔ اسے اختیار کر کے ہم اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کر سکیں گے۔ خدائی خدمت گار کا مطلب صرف سرخ پوش ہونا اور قطار میں کھڑا ہونا ہی نہیں بلکہ اس خدائی طاقت کو محسوس کرنا ہے جو تلوار کی طاقت کی ضد اور اس سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ ابھی جب کہ آپ صرف عدم تشدد کے دروازے ہی پر ہیں اور آنا کچھ کر سکتے ہیں تب جب عدم تشدد کی عمارت کے اندر داخل ہوں گے تو کتنا کچھ کر سکیں گے مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کے لئے تعلیم اور تیاری کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے یہ نہیں کی، اور یہ بات آپ کے ذہن میں نہیں بیٹھی تو آپ اس چیز سے لطف و حوصلہ لیں۔ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ جیسے

فن جنگ کا ایک علم ہے ویسے ہی عدم تشدد کا بھی علم ہے۔ جیسے
یورپ نے فن جنگ کو درجہ تکمیل تک پہنچایا ہے ویسے ہی ہمیں عدم
تشدد کو بھی کرنا ہوگا۔ اس کے لئے مسئلے کی ضرورت ہے، فکر کی ضرورت
ہے۔ غور و غرض کی ضرورت ہے۔ چھان بین کی ضرورت ہے۔ اگر
اس علم کو بھی ہم پوری طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں، یورپ پر اپنا اثر
ڈالنا چاہتے ہیں اور حیوانیت کے درجے سے آگے بڑھ کر انسانیت
کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے صرف عدم تشدد ہی کا
راستہ ہے۔

بادشاہ خاں۔ یہاں کچھ سچاں ہیں جو ہمارے خدائی
خدمت گاروں کو بہت تکلیف دیتے ہیں۔ انھیں مارنے میں ان
کی زمینیں چھین لینے ہیں۔ اس صورت میں یہ لوگ کیا کریں؟
گاندرھی جی۔ انھیں یہ سب باتیں صبر اور تحمل سے برداشت
کرنی ہوں گی۔ جو سختیاں پہلے انگریز کیا کرتے تھے وہی اب یہ لوگ
کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارا رویہ ان لوگوں کے ساتھ بھی وہی ہونا
چاہئے جو سرکار انگریزی کے ساتھ تھا۔ ہمیں تشدد کا جواب تشدد
سے اور گالی کا جواب گالی سے نہیں دینا چاہئے۔ ہمیں دل میں غصہ
بھی نہیں لانا چاہئے۔ اس طرح مخالف لوگ ضرور ٹھنڈے پڑ
جائیں گے۔ نہیں تو ہم ان کے ساتھ عدم تعاون کریں گے۔ اگر ہم
ان کی زمینوں پر کام کرتے ہیں تو انھیں چھوڑ دیں گے اور ان سے

کہیں گے کہ اچھا جتنی سختی ہو کر لو مگر ہم اب تمہاری زمینوں میں کام نہیں کریں گے۔ اپنی آن کو نہیں چھوڑیں گے، اور محنت مزدوری کر کے پیٹ بھریں گے۔ اگر فاقہ کشی کی نوبت آئے گی تو اسے بھی برداشت کریں گے۔ مگر آپ کی تابعداری نہیں کریں گے۔ اپنے ضمیر کا خون نہیں ہونے دیں گے۔

بادشاہ خاں — مقدمہ کر کے پولس کی مدد سے انھیں سزا دلوانا ہمارے لئے جائز ہے

گاندھی جی — سچے خدائی خدمت گار کو عدالت میں نہیں جانا چاہئے۔ عدالت میں جانے کا تو یہی مطلب ہونا کہ ہم ایک طرح سے نہیں تو دوسری طرح سے ان سے لڑ رہے ہیں پولس سے سزا دلوانا بھی تو ایک قسم کا انتقام ہے؟ سچے خدائی خدمتگار کو یہ نہیں کرنا چاہئے۔ میں حال کا ایک واقعہ بتاتا ہوں۔

سیوا گرام میں کچھ ہرتین نوٹ میرے پاس آئے اور کہا کہ ایک ہرین ذریعہ کرسی اپنی کی وزارت میں داخل کرادو، ہمیں تو ہم تمھارے دروازے پر مہیچہ کرستہ گرہ کریں گے۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک شریر شخص کی سازش ہے۔ پولس سپرنٹنڈنٹ نے میری مدد کے لئے پولیس بھیجی جاہی کیوں کہ اس کے غنڈوں کی طرف سے خدشہ تھا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اور ان لوگوں سے کہہ دیا کہ یہاں جس کمرے پر چاہو قبضہ کر سکتے ہو۔ کھانے کی ضرورت ہو گی تو وہ بھی کھلاؤں گا لیکن

تم مجھے میرے اصول کے خلاف کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔
 لمٹھاری بہت دھرمی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ انھوں نے میری بیوی
 کا بڑا مدرہ اور غسل خانہ پسند کیا۔ وہ ہم نے اُنھیں دے دیا۔ ہم ان
 کی دیکھ بھال کرتے تھے، ان کی ضرورتیں پوری کرتے کوئی بیمار ہوتا
 تو تیمارداری بھی کرتے تھے، آخر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمارے دوست
 بن گئے

تشدد کا برداشت کرنا عدم تشدد کا پہلا قدم ہے۔ آخری
 نہیں۔ خدائی خدمت گاروں کا نظام فوجی طرز پر بنا ہے۔ مگر اُن کے
 اور ملٹری کے کام میں بہت فرق ہے۔ فوج میں جو جگہ قوا عد کی ہے
 وہی عدم تشدد میں خدمت خلق اور اس کی تیاری مثلاً فرسٹ ایڈ
 دیہاتوں کی صفائی، ہندوستانی زبان وغیرہ کی تعلیم کی ہے۔ خدائی
 خدمت گار کے پاس روزی پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ ہونا چاہئے جو
 چھن نہ سکے۔ جیسے کٹائی، بنائی یا کوئی اور دستکاری۔ بغیر سزا
 کا طریقہ اختیار کئے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں کو سدھارنے کا یہ واحد
 متھیاری ہے

خدائی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ گاندھی جی کی

بات چیت۔

”میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ آپ لوگوں سے ملوں۔ آپ لوگ جو
 کہیں وہ سنوں، اور لوگ آپ کے بارے میں جو کہتے ہیں وہ بھی

سنوں — آج اس صوبے میں، آپ کے دفتر میں ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کے نام ہیں کسی دوسرے صوبے میں شاید اتنے والیٹیو نہیں ملیں گے۔ اگر ہوں بھی تو ان میں اتنی تنظیم نہیں ہے۔ آپ سب ایک آدمی کے ماتحت ہیں، جو وہ کہے آپ کرنے کو تیار ہیں یہی آپ کی طاقت کا راز ہے۔ آپ لوگوں نے اپنا سارا نظام فوجی طریقہ پر بنایا ہے۔ جرنیل اور کرنیل کے خطاب بھی دیتے ہیں۔ مگر آپ کے کام میں اور اسٹری کے کام میں بہت فرق ہے۔ آپ نے جان بوجھ کر لاٹھی اور بتدوق چھوڑ دی ہے۔ آپ نے اپنے ایڈریس میں مجھے بتایا ہے کہ عدم تشدد کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے اور تلوار کی طاقت سے بڑھ کر ہے اور خود میرا تو یہ تجربہ ہے ہی کہ اگر عدم تشدد کی طاقت کو اچھی طرح منظم کیا جائے تو وہ بہت بڑا کام کر سکتی ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہماری تعداد تیرہ ہزار تھی اور گورے لاکھوں بھرے پڑے تھے پھر بھی ہم ان سے لڑے اور کامیاب ہوئے۔ اگرچہ ہمارے ہاں کچھ بہت لکھے پڑھے نہ تھے مگر ایک بڑی بات ان میں یہ تھی کہ وہ سب میرے کہنے پر چلتے تھے، ان میں ڈسپین تھا۔ ان لوگوں نے سب مصیبتیں سہیں، گولی تو وہاں نہیں چلی مگر ہر طرح کی تکلیف کا انھوں نے خوشی سے خیر مقدم کیا۔ وہاں قید خانہ یہاں کے قید خانے سے بڑا تھا۔ خوراک بدتر تھی۔ مگر پھر بھی قید خانوں میں، بچے، بوڑھے، عورتیں سب گئے۔ کچھ لوگوں کو جلا وطن کیا

گیا جن کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ واپس بھیج دیا گیا۔ وہ لوگ خاموشی سے چلے آئے، اور سب کچھ شانتی سے برداشت کیا گولی بھی کھائی پڑی تو اسے سنس کر برداشت کر لیتے۔ یہاں ہم کرڈروں کی تعداد میں ہیں اور محض ستر ہزار انگریز ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ صرف اس لئے کہ ہم لوگوں نے عدم تشدد کی طاقت کو منظم نہیں کیا۔

آپ نے مجھے یقین دلایا ہے، اور میں آپ کا یقین کرتا ہوں کہ آپ عدم تشدد کو سمجھتے ہیں اور اس پر قائم رہیں گے۔ اگر صبح آپ کی ایک لاکھ کی تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے تو ان کے ذریعے کیا نہیں کیا جاسکتا؟ کانگریس میں تو آج کل کچھ مطلبی لوگ بھی گھس آئے ہیں۔ مگر آپ ایک لاکھ آدمی صرف خدمت ہی کے لئے آئے ہیں۔ اس میں آپ کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ پیسہ آپ کو نہیں ملتا۔ کپڑے تک بھی اپنے پاس سے بنوانے پڑتے ہیں۔ روٹی بھی اپنی جیب سے خرچ کر کے کھاتے ہیں۔ ایسی فوج کے ذریعے تو آزاد ہندوستان کی آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ آپ اس حد تک تو پہنچ گئے ہیں۔ وقت پڑنے پر سرکار کے تشدد کو برداشت کر لیا مار پیٹ سہہ لی۔ آج جیسا کوئی خاص موقع آیا تو کام بھی کر لیا۔ یہ سب بہت اچھا ہے مگر کافی نہیں۔ یہ پہلا قدم ہے آخری نہیں اس سے آزادی نہیں مل سکتی۔ آزادی کے لئے ہمیشہ کام کرنا

چاہئے۔ آپ نے اپنے عہدے بطری والوں کے سے رکھے ہیں۔
 جیسے کہ جرنیل اور کرنل، سالار وغیرہ، بطری واسے قواعد کرتے
 ہیں۔ لڑنے کے وقت لڑتے ہیں فرصت میں کھیلتے ہیں۔ کھاتے
 پیتے ہیں۔ بد چلنی بھی کر لیتے ہیں، مگر ہمیں تو دن رات خدمت کرنا
 ہے۔ یا اس کی تیاری کرنا ہے۔ آدمی جو کچھ دن بھر کرتا اور سوچتا ہو
 رات کو خواب بھی اُسی کے دیکھتا ہے۔ فوجی آدمی خواب دیکھے گا
 تو یہ کہ اگر جرنیل فلاں جگہ لڑنے کو بھیج دے تو میں خوب بہادری
 دکھاؤں۔ ترقی پاؤں۔ آپ لوگوں کو تو یہ خواب آنے چاہئیں کہ
 اگر فلاں جگہ پہنچکڑا ہو اور بادشاہ خاں مجھے جھگڑا چکانے کے
 جان دینے کے لئے وہاں بھیج دیں تو میں وہاں دو فریقوں میں
 صلح کرانے کی کوشش میں ختم ہو جاؤں اور عدل میں غصہ تک نہ لے
 تو کیا اچھا ہو۔ آج لوگ بادشاہ خاں کو سرحد سے باہر بلا رہے ہیں
 تو میں روک دیتا ہوں۔ کیونکہ ابھی آپ کی تیاری مکمل نہیں۔ لیکن
 جب آپ تیار ہو جائیں گے تو اگر کہیں جھگڑا ہو جائے جیسا آج کل
 ملتان اور دہلی میں ہو رہا ہے تو وہاں امن قائم کرنے کے لئے ہم آپ
 کو بھیج دیں گے۔ میں نے شانتی سنیا قائم کرنے کی تجویز کی ہے۔ مگر
 آپ تو پہلے ہی سے شانتی سنیا میں ہیں اس لئے آپ کو چاہئے جہاں
 جھگڑا ہو، وہاں جائیں، لوگوں کو سمجھائیں کہ آپس میں لڑتے ہو؟
 خواہ مخواہ ایک دوسرے کو مارتے ہو؟ اگر مارنا ہی ہے تو ہمیں مارو

مگر اس کام کے لئے بہت تیاری چاہئے۔ تعلیم چاہئے ہمیں چوبیس گھنٹے اسی کا خیال کرنا اور اسی کے لئے کام کرنا ہوگا۔ ہم کو دیہاتوں کی صفائی کرنی ہوگی۔ ہم مریضوں کی دیکھ بھال کرنا سیکھیں گے۔ فرسٹ ایڈ سیکھیں گے۔ جہاں جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی وہی مدد دیں گے۔ یہاں تک کہ اس دیہات کا بچہ بچہ۔ پہچاننے لگے گا۔ کہ یہ خدائی خدمت گار ہیں۔ ان کا کام ہی خدمت کرنا ہے۔ اس طرح آپ کا نام ہوگا۔ اگرچہ ہمیں نام کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ان کاموں سے جب لوگ ہمیں اچھی طرح سمجھ جائیں گے تو ہمارا خدمت کا کام آسان ہو جائے گا۔

پشتو کی تعلیم تو ہمیں حاصل کرنی ہی چاہئے۔ لیکن اس کے علاوہ دوسریں کی خدمت کے لئے ہمیں ہندوستانی بھی سیکھنی ہے۔ ہمارے پاس روٹی پیدا کرنے کا ذریعہ ضرور ہونا چاہئے آج آپ میں سے اکثر کے پاس زمین ہے۔ مگر کل وہ چھین سکتی ہے۔ جو خدا کی خدمت کرتے ہیں انھیں روٹی تو ضرور ملے گی مگر خدا بے ہاتھ پاؤں ہلائے روٹی نہیں دیتا۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ دھندا تو کرنا ہی ہوگا۔ دھندے ہی سے روٹی ملتی ہے۔ آپ لوگ سرخ پوش ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کھادی پوش بھی ہوں گے مگر میں دیکھتا ہوں کہ کھادی آپ میں سے بہت کم پہنتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنی وردی اپنے خرچ سے بنانی

پڑتی ہے۔ اور کھا دی خریدنے کے لئے آپ کے پاس پیسہ نہیں ہو
اگر آپ لوگ کا تنہا، دھننا سیکھ لیں تو کھا دی مفت میں تیار
ہو سکتی ہے۔ اور کچھ پیسے بھی مل سکتے ہیں۔

اب یہ سوال ہے کہ ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کے ہوتے
یہاں ڈاکے کیسے پڑتے ہیں۔ دوسری جگہ آپس میں لڑیں جھگڑیں
مگر یہاں تو ایسا نہیں ہوتا چاہئے۔ اگر یہاں ایک بھی ڈاکو ہے تو ہمیں
شرم آنی چاہئے۔ مجھے تو آتی ہے۔ آج کل یہاں بعض لوگوں نے
ڈاکہ زنی کو پیشہ بنا لیا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس پیسہ کمانے اور روٹی
پیدا کرنے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے ہم ان کے ساتھ دو طرح
سے نپٹ سکتے ہیں۔ ایک تو جیسے سرکار کرنی ہے۔ یعنی جرائم پیشہ
ایکٹ بنا کر دن میں اور رات میں ان کو تین تین چار چار بار تھانے
میں بلا کر حاضری لیتی ہے اور اس طرح انھیں تنگ کرتی ہے۔
یا محبت سے سمجھا کر۔ میں یہ نہیں جانتا کہ جرائم پیشہ سب کے سب
بد معاشرے یا ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔ ہم انھیں بھی سمجھا سکتے ہیں۔ کہ
جو ہم کرتے ہیں وہ تم بھی کرو۔ اس سے انھیں روٹی ملے گی اور تم گناہ
اور اس کے نتائج سے بھی بچو گے۔ یہاں ڈاکہ وغیرہ اس قدر
بڑھ گئے ہیں کہ بچارے ڈاکٹر خاں صاحب پریشان ہیں کہ کیا
کہا جائے۔ وہ یہ حالت ایک دن بھی دیکھنا نہیں چاہتے مگر
لاچار ہیں، ایک تو ان کے پاس طاقت نہیں جو طاقت بھی دی

گئی ہے۔ وہ ایک کھلونا سا ہے۔ پولیس اور ملٹری ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہی پولیس جو ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتی ہے اور پھر حکم ملے تو انہیں سٹھکڑی لگا دے گی، مگر پھر بھی آج ہمارے پاس کھچاقت موجود ہے۔ ہم میں یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ ہم یہ کھوج لگائیں کہ فلاں مجرم کہاں گیا ہے، وہاں جا کر اس سے ملیں اس کے ارد گرد کے لوگوں سے ملیں۔ انہیں سمجھائیں بھیا میں ان میں رہ کر کام کریں، ان پر اپنا اثر ڈالیں۔ ان کے طریقہ معاش کو سدھاریں۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو یہ وزارت آپ کے بادشاہ خاں کے، میرے، سب کے لئے باعثِ شرم ہوگی۔ میں اس ندامت میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔

ڈاکٹر خاں صاحب کو آج مجبوراً سزا کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ سزا نہ دیں تو جرم اور بڑھ جائیں۔ سرکار کے پاس دوسرا راستہ نہیں ہے۔ مگر ہمارے پاس تو ہے۔ ایک لاکھ آدمی کے لئے یہ معمولی بات ہے۔ یہ اتنی بڑی جماعت اگر چاہے تو کیا نہیں کر سکتی۔ خدا نے ہمارے سامنے دونوں راستے رکھے ہیں۔ امن کا راستہ اور تشدد کا راستہ۔ اگر ہم امن کا راستہ پسند کرتے ہیں تو دوسرے کو مارنے کے بدلے خود مرنا خدمت لینے کے بدلے خدمت کرنا ہوگا۔ اگر آپ یہ کرنے لگیں، اور جو بیس گھنٹے خدمت یا خدمت خیال میں لگے رہیں تو چند ہی سال میں آپ اس صوبے کی شکل بدل

سکتے ہیں۔

گاندھی جی نے کہا کہ اگرچہ نظامِ آپ لوگوں نے اس بات کے کہنے میں بے جا جرات سے کام لیا ہے۔ مگر میں اپنی عادت کے مطابق مانے لیتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کو تفصیل سے سمجھایا کہ ان کے نزدیک عدم تشدد کا کیا مفہوم ہے اور اس کے لوازم کیا ہیں۔ یہ بات تو آسان ہے کہ قومی اور مسلح حریف کے مقابلے میں ایک قسم کے انفعالی عدم تشدد سے کام لیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ جب باہر کی کوئی قوت آپ کو دبلنے کے لئے نہیں ہوگی تو کیا تب بھی آپ آپس کے تعلقات میں عدم تشدد سے کام لیں گے؟ آپ کا عدم تشدد طاقتوروں کا عدم تشدد ہو یا کمزوروں کا؟ اگر طاقتوروں کا عدم تشدد ہے تو تمہارا کو ترک کرنے سے آپ کو اور زیادہ طاقت کا احساس ہونا چاہئے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ ہتھیاروں کا استعمال جو آپ نے اپنی خوشی سے چھوڑ دیا ہے پھر شروع کر دیجئے۔ اس لئے کہ بہادر اور مسلح سپاہی ہونا بہتے اور بزدل ہونے سے اچھا ہے۔ گاندھی جی نے اس الزام کی تردید کی جو کئی لوگوں کی طرف سے ان پر لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہتھیاروں کو عدم تشدد کا سبق دے کر اسلام کو کمزور کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا آپ نے اسلام کی قابل قدر خدمت انجام دی۔

www.Laetoelectronics.com

اسی سلسلے میں انھوں نے فرمایا کہ خدائی خدمت گار سے مراد وہ شخص ہے جو خدا کی یعنی خلق خدا کی خدمت کرتا ہو۔ اس کے لئے قول، عمل اور خیال کی پاکیزگی اور کسی مفید کام میں نہیں مصروف رہنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ بے کاری میں نفس پاک نہیں رہ سکتا۔ آپ کو چاہئے کہ کوئی ہاتھ کا کام سیکھ لیں جو اپنے گھر پر کر سکیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ روٹی دھنکنا، کاتنا اور کپڑا بننا سیکھیں۔ اس لئے کہ یہ ایسے کام ہیں جو لاکھوں آدمی اپنے گھر پر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو سندھوستانی زبان سیکھنا چاہئے تاکہ آپ کے خیال میں وسعت پیدا ہو اور آپ باہر کی دنیا سے روشناس ہوں۔ حفظانِ صحت کی ابتدائی باتیں اور فرسٹ ایڈ بھی سیکھنا ضروری ہے۔ آخری مگر نہایت ہی اہم چیز یہ ہے کہ آپ کو سب مذہبوں کا احترام کرنا چاہئے اور ان سے رعا داری برتنی چاہئے۔

ساتواں باب

پٹھانوں کے درمیان

دنیا میں جتنی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتی ہیں چنانچہ بادشاہ خاں نے گاندھی جی کے لئے آرام کی جو دست مقرر کی تھی وہ اس جیسے کی ہار تار سچ کو سچیر کے دن ختم ہو گئی۔ اس روز ہم اس ارادے سے چل کھڑے ہوئے کہ ضلع مردان کے مفضلات اور ضلع پشاور کی بقیہ تحصیل نوشہرہ کا دورہ کریں سفر مختصر تھا اور چھوٹی چھوٹی منزلوں میں بانٹ دیا گیا تھا اس لئے گاندھی جی کو ذرا بھی تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ ہماری سواری کے لئے وہ موٹر بس لے لی گئی تھی جو پنڈت جواہر لال نہرو نے خدائی خدمت گاروں کو پروپگنڈا کے لئے دی ہے۔ جب ہم اعلیٰ درجے کی پکی سڑک پر جلتے تھے تو دونوں طرف کے گالوں کی پوری پوری آبادی گاندھی جی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اُمنڈ آتی تھی۔ یہ لوگ بالکل خاموش کھڑے رہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں کتنا ڈر سپن ہے۔ ان لمبے سڑنگے پٹھانوں میں اس قدر

کشادہ دلی گرم جو شئی متانت اور وقار ہے کہ انسان کا دل بے اختیار اُن کی طرف کھینچا ہے۔ بار بار خیال آتا ہے کہ کاش ہندوستان کے اور حصوں میں بھی لوگوں کا مجمع اُن کی تقلید کرتا۔ ان میں ایک ہی کمزیدی ہے، اگر اُسے کمزوری کہا جائے، کہ ان کا نہان داری کا شوق حد سے بڑھا ہوا ہے۔ ممکن تھا کہ اس وجہ سے گاندھی جی کو وقتیں پیش آتیں مگر بادشاہ خاں نے پیش بندی سے کام لے کر لوگوں کو وقت پر سمجھا دیا تھا اس لئے یہ نہان داری اعتدال کی حد سے نہیں بڑھنے پائی۔

البتہ ایک بار جب گاندھی جی آسمان زنی کے باہر سیر کے لئے جا رہے تھے، اُن کو اپنی بس روک کر اُترنا پڑا تاکہ منت خاں کیلی (جس کا نام بادشاہ خاں کے ایک چچا کے نام پر رکھا گیا ہے) کے باشندوں کا کھیلوں اور گیتوں اور ترکاریوں کا تحفہ قبول کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ ہی رہ جائیں اور اس صوبے میں بیوہ باش اختیار کر لیں۔ اُن کے سردار نے کہا ہمارا آپ پر بڑا حق ہے، آپ نے ہمارے بادشاہ خاں جی کو مصیبت کے زمانے میں چھ سال تک اپنے ہاں رکھا۔ اب ہم آپ کو کم سے کم چھ مہینے تو نہان رکھ سکتے ہیں۔ گاندھی جی اور سب لوگ پسینہ کر رہے تھے، کوئی بیس پچیس پچھتے بھی گاؤں سے آئے۔ تھے تاکہ گاندھی جی سے ملیں، اور ان سے مصافحہ کریں۔ اپنی ٹوپیاں

دجہ مہند قبائل میں استعمال ہوتی ہیں۔ اپنے معصوم سرخ سرخ چہرہ میں ڈھکے ہوئے ایک ایک کر کے گاندھی جی کے پاس آتے تھے اور اُن کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ہٹھانوں کی شان سے مصافحہ کرتے تھے اور "ترامشے" کہتے تھے اور پھر بڑے ٹھاٹھ سے "لکڑوں کوں" اکڑ کے ساتھ چلے جاتے تھے گویا اب اُن کی شان میں کمی اچھ کا اضافہ ہو گیا ہے۔

پشاور سے نوشہرہ موڑے گھنٹے بھر کا راستہ ہے، جس وقت ہم روانہ ہوئے۔ نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور ہوا میں بڑی خوش گوار خشکی اور تازگی تھی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جن فطرت کے اس منظر کا جو ہماری آنکھوں کے سامنے تھا، مفصل نقشہ کھینچوں مگر میں اپنے قلم کو روکنے پر مجبور رہوں۔ دور تک دھندلے ارغوانی رنگ کا پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ پہاڑ درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ مگر اب بالکل خشک اور اجڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بدھ تہذیب اور یونانی باختری تہذیب کی بے شمار نشانیوں کو دیکھ کر جو دیائے سوات اور دیائے کابل کی وادیوں میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں چشم تصور کے سامنے مانی کی تصویر بھر جاتی ہے۔ مگر گاندھی جی کی توجہ ان چیزوں کی طرف زیادہ نہ تھی۔ وہ خدائی خدمت گاروں کے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے سرلیک بہت بڑی ذمہ داری لی تھی۔ اُن کے

سامنے وہ لوگ تھے جو جنگ جو سپاہیوں کی حیثیت سے دنیا میں مشہور تھے۔ اب ایک شخص کے حکم سے انھوں نے ہتھیار رکھ دیئے تھے۔ اور عدم تشدد کا اصول اختیار کر لیا تھا گاندھی جی کو یہ فکر تھی کہ کس طرح ان کو عدم تشدد میں کامل بنالیں، تاکہ وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کو سر کر سکیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ کہ ان کو اپنی کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔

ہم سولہ تاریخ کو سہ پہر کے وقت دیپائے کابل کو پارک کے نوشہرہ پہنچے۔ نوشہرہ ایک بہت بڑا فوجی مرکز ہے اور سالپور کی چھاؤنی اور ہوائی اڈے کی طرح، پشاور کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ پشاور سرحد سے اس قدر قریب ہے کہ اس پر درہ خیبر کی طرف سے اچانک حملہ ہو سکتا ہے۔ نوشہرہ میں بھی اٹھان زئی اور پشاور کی طرح گاندھی جی خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے ملے۔ انھوں نے ایک تحریری ایڈریس میں گاندھی جی کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے ہمارے ہاتھ میں عدم تشدد کے ہتھیار دیئے ہیں جو فولاد اور پتیل کے ہتھیاروں سے کہیں زیادہ بہتر اور ان سے کہیں زیادہ زبردست ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ ہم لوگ عدم تشدد پر کامل عقیدہ رکھتے ہیں جس کا ثبوت سول نافرمانی کی تحریک میں ہمارے طرز عمل سے مل چکا ہے اور ہم اس عقیدے کو کبھی نہیں چھوڑیں گے

سپاسنامہ کا کچھ ضروری حصہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

آپ کا عدم تشدد کا سکھایا ہوا سبق جس طرح ہم صوبہ سرحد والوں نے پڑھا، اور اس پر عمل کیا ہے اگر اس کے متعلق ایک کلمہ فخر کا کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اور اُمید ہے کہ آپ ناراض بھی نہ ہوں گے۔ کیوں کہ تشدد و سہارا پیشہ تھا جو فخر افغان نے ہم سے چھڑا دیا۔ ورنہ پیدائشی عدم تشدد والوں کا عدم تشدد بے معنی ہے۔ اس نسخے کے استعمال کا مریض اگر کوئی تھا تو وہ پٹھان تھا اور اس نسخے کو کسی نے سمجھا تو وہ بھی پٹھان نے۔ پٹھان اور مسلمان جس کے مذہب کا اصل اصول عدم تشدد تھا اور تشدد اس کی استثنیٰ۔ اصول کو بالکل بھول کر استثنیٰ کو مذہب بنا چکا تھا مگر پٹھان کے قائد نے اس کو اپنا بھولا ہوا اصول پھر یاد دلا دیا۔ ہم آپ و ثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس صوبے کے باشندے جو سب "پٹھان" ہیں (کیا ہندو اور کیا مسلمان) قلیل ترین عرصے میں آزادی وطن کی فوج کے بہترین سپاہی بن کر آپ کے دوسرے حکم پر میدان جنگ میں آجا دیں گے۔ اور اُمید ہے کہ اس سیلاب کو پھر روکنا شاید دفتروں کے لئے مشکل بھی ہو جائے۔

اس وقت سے لے کر کہ اس ملک کی غلامی کی تشخیص آپ نے کی۔ اور اس کے علاج کے لئے آپ نے نسخہ تجویز کیا۔ یہ صوبہ ہرنانہ میں آپ کی امداد کا خواہش مند رہا جو بالآخر اس کو ملی اور آپ کو

اپنے اندر لے آکر رہا۔ اور ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لیے آپ کو کیا پنا بنائے
اس لئے کہ اصل حالت اس صیغے کی جس طرح باقی صورہجات سے
قبل از اصلاحات جدا تھی اب بھی اسی طرح جدا ہے پہلے اگر قوانین
جیشیانہ تھے تو اب ملازمین برطانیہ نافرمان ہیں۔ کانگریس وزارت
تو ہے، مگر ملازمین ہماری وزارت سے تعاون نہیں کر رہے ہیں۔
یہ بھی مرض ہے۔ اس کا بھی علاج آپ کو بلاتا ہے۔ آپ سے بہتر
ڈاکٹر سم کوئل نہیں سکتا۔ نسخہ تجویز کر کے نشر و پھیلے جاویں۔

گاندھی جی نے ان کے اور پس کے جواب میں کہا کہ میں آپ
کی اس بات کو پوری طرح جانتا ہوں کہ آپ نے عدم تشدد کے اصول
کو سمجھ لیا ہے اور اس پر ہمیشہ قائم رہیں گے۔ میں آپ کو
مبارک باد دیتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے اس اصول پر
پورا پورا عمل کیا تو آپ دنیا کی تاریخ کو بدل دیں گے۔ انھوں نے
بتایا کہ ایک خدائی خدمت گار اور ایک معمولی سپاہی کی تربیت
اور طرز عمل میں کیا فرق ہونا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ معمولی
سرخ پوشوں کے دل میں جب سچا عدم تشدد پیدا ہوگا
تو سورج کی گرمی کی طرح ہر شخص اس کو خود بخود محسوس کرے گا۔
ہرمرد، عورت، بچہ، بوڑھا ان کی نیکی کا معترف ہوگا اور حکومت
کی پوری طاقت نہیں کر سکتی ان کا ایک اشارہ وہ کام کو اس کے
خدائی خدمت گار جیل میں سرکار کو سنانے کے لئے نہیں

اپنی مصیبت کا ثبوت دینے کے لئے جائے گا۔ اس کی قانون کی پابندی کی صلاحیت کم نہ ہوگی۔ وہ اخلاقی مجبوری سے قانون شکنی کرے گا۔ چور، ڈاکوؤں کے جیل جانے سے آزادی نہیں مل سکتی بے گناہ کی قربانی ہی نتیجہ خیر ہوتی ہے۔ سول نافرمانی کرنے والے کو خدا کا فرماں بردار بننا پڑے گا۔

(مردان تحصیل کے خدائی خدمت گاروں کے افسروں

سے بات چیت)

گانڈھی جی :- آج کئی دنوں سے میں خدائی خدمت گاروں کے افسروں سے مل رہا ہوں۔ یوں تو میں آج کل خاموش رہتا ہوں۔ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے مسیری آواز بھی نہیں نکلتی ہے۔ فقط آپ سے بات چیت کرنے کے لئے خاموشی کو چھوڑتا ہوں۔

کیا آپ لوگ عدم تشدد کی خبریاں سمجھ گئے ہیں؟ اور موقع پڑا تو اس پر قائم بھی رہیں گے؟ مجھے سب جگہ سے اس کا جواب ہاں میں ملا ہے۔ اس سے مجھے بڑی خوشی اور تسلی ہوتی ہے۔ مگر جوں جوں میں آگے بڑھتا ہوں مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ کیا آپ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ایک رواج سا بن گیا ہے۔ اس لئے آپ سب لوگ ہاں کہہ دیتے ہیں؟ اگر آپ سچے دل سے ہاں کہہ رہے ہیں تو

آپ کو اس پر قائم رہنا چاہئے۔ میں سوچتا ہوں کہ اور کچھ کہنے سے پہلے آپ سے پھر اتنا پوچھ لوں، کیا واقعی یہ بات آپ کے دل پر جم گئی ہے؟ کیا سچ مح آپ اس پر قائم رہنا چاہتے ہیں؟

سب نے مل کر جواب دیا "ہاں"
ایک آواز :- ہم اور تو سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں مگر جب لوگ ہمارے بزرگوں کو گالی دیتے ہیں تو وہ برداشت نہیں ہوتا۔

گاندھی جی :- ہنس کر بس جلو چھٹی ہوئی۔ اصلی امتحان تو یہی ہے۔ ویسے تو سب لوگ ایک حد تک برداشت کر لیتے ہیں بات تب ہے کہ امتحان کا موقع آئے اور آپ برداشت کر لیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی سردار کو برا بھلا کہے، گالیاں دے تب بھی آپ برداشت کریں گے۔ محل کا دامن نہ چھوڑیں گے۔ اور دل میں بھی غصہ نہ آنے دیں گے۔ اگر آپ اس حد تک عدم تشدد کو سمجھ گئے تو میں آپ کو اور بادشاہ خاں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اس سے ضرور ہندوستان کا بھلا ہوگا۔ مگر صرف زبانی ماننے سے عدم تشدد نہیں آجاتا۔ اس کے عملی ثبوت کی ضرورت ہے۔ سورج کا نکلنا چھپا نہیں رہ سکتا۔ اندھے کو بھی اس کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کے دل میں سچا عدم تشدد پیدا ہوگا تو اس کا نور سورج کے نور سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔

جو لوگ جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں انہیں بھی پتہ چل جائے گا۔
 کہ آج صوبہ سرحد میں آپ جیسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر آپ
 اپنے دل سے غصہ نکال ڈالیں، بدزبانی چھوڑ دیں دلاکھی چھری
 تپیلے ہی چھڑ چکے ہیں، تو آپ خود چاہیں تب بھی اس بڑی تبدیلی
 کو نہیں چھپا سکیں گے۔ اور آپ کے اس پاس کے لوگوں پر بھی اس
 کا اثر پڑے بغیر نہ رہے گا۔ آپ لوگوں کو جاننا چاہتے ہیں کہ جنوبی افریقہ
 میں کافی تعداد پٹھانوں کی بھی تھی اور وہ ستیہ گرہ کی لڑائی میں شامل
 بھی ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک کو میں پہچانتا تھا۔ کئی تو میرے
 موکل تھے۔ مگر میں صرف ان کا وکیل ہی نہ تھا ان کو سیاسی تعلیم
 دینا بھی میرا کام تھا۔ اگر کسی کے پیٹ میں درد ہوتا یا کسی کا سر دکھتا تو
 دوا کی بھی دیتا تھا۔ اس طرح سے میں ان کا دوست تھا اور وہ میرے
 دوست تھے، اور میں جو کچھ بھی کہوں کرنے کو تیار ہو جاتے تھے
 اور خود چاہے کچھ بھی کریں مجھے آکر بتا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ
 ذرا سی بات بھی نہیں چھپاتے تھے۔ میرا ان کے دل میں ایک طرح
 کا ڈر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس آدمی سے کچھ نہ چھپا سکیں گے۔
 اور اگر کوئی برا کام کر بیٹھے تو وہ سخت ڈانٹ پلائے گا۔ میری ڈانٹ
 سے وہ کیوں ڈرتے تھے؟ ویسے تو ان میں سے ہر ایک آسانی سے
 جیب میں رکھ سکتا تھا۔ میرا جسم دیکھنے میں جیسا آج کمزور سا
 ہے ویسا ہی اس وقت بھی تھا۔ انہیں ڈر تھا۔ تو میری محبت کا

وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے مجھ سے ڈرتے بھی تھے میں پٹھانوں کو خوب پہچانتا ہوں۔ انسانوں کو قتل کر ڈالنا ان کے نزدیک اتنی ہی معمولی بات ہے۔ جیسے کہ مرغی یا بکرے کو کاٹ ڈالنا۔ وہ مارنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ لوگوں کو پٹھانوں کا ڈر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ لاکھی چلانے میں ماہر ہیں۔ پتھر پھینکنا بھی جانتے ہیں۔ شاید سی کوئی پٹھان ہو جسے بندوق یا چھری چلائی نہ آتی ہو۔ میں پٹھان کی لاکھی کی طاقت کو خوب پہچانتا ہوں اگر میر عالم کی لاکھی سر کے بجائے پیٹھ پر نہ پڑی ہوتی تو میں آج یہاں نہ ہوتا۔ لیکن آج میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ پٹھان جو بچپن ہی سے لاکھی بندوق چلانا جانتے ہیں..... اندجن کے لئے انسان کو مار ڈالنا معمولی بات ہے۔ انھوں نے بادشاہ خاں کے کہنے سے لاکھی اور بندوق چھوڑ دی ہے اندوہ سمجھ گئے ہیں کہ جو چیز بادشاہ خاں ان کو دینا چاہتے ہیں یعنی عدم تشدد وہ لاکھی اور بندوق سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر سچ مچ آپ یہ بات سمجھ گئے ہیں۔ اور سب پرانی باتیں بھول گئے ہیں۔ اپنے پرانے رسم و رواج کو اس طرح سے اُستار پھینکا ہے۔ جیسے سانپ اپنی کینچی کو اگر ایک لاکھ خدائی خدمت گماروں نے عدم تشدد کو اس طرح اپنالیا ہے تو مجھے یہ ایک معجزہ سا لگتا ہے۔ بادشاہ خاں کی کیا طاقت تھی کہ وہ سب آپ سے کروا سکے۔ یہ طاقت تو انھیں خدا ہی نے دی ہے۔ کہ وہ اس طرح

آپ کا دل بدل سکے۔ اس میں صوبہ سرحد کی بھلائی ہے۔ ہندوستان کی بھلائی ہے اور اس سے ہمارے دین اور دنیا دونوں سدھر جاتے ہیں۔

آپ نے مجھے یقین دلایا ہے کہ آپ عدم تشدد کے پابند رہیں گے۔ اگر آپ جو کہتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے۔ (مجھے "اگر" کہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں، بڑی بھاری بات ہے۔ بہادری کی بات ہے، تو آپ بڑا کام کر سکتے ہیں۔ آپ بہادر ہیں۔ مرنا مارنا جانتے ہیں۔ مگر میں اس سے بڑھ کر بہادری کی توقع آپ سے رکھتا ہوں۔ وہ بہادری کیا ہے؟ وہ طاقت کون سی ہے؟ اس کی کیا نشانی ہے؟ جو نشانی میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے۔ جب میں یہاں بچے بچے سے پوچھوں کہ کیا آپ خدائی خدمت گاروں کو پہچانتے ہیں۔ عورتوں سے پوچھوں۔ تانگے والوں سے پوچھوں۔ تو مجھے جواب ملے کہ ہاں پہچانتے ہیں۔ اگر وہ لوگ آپ سے ڈرتے ہیں تو آپ سچے خدائی خدمت گار نہیں۔ آپ کی زبان میں ایسی سٹھاس ہوونی چاہئے۔ آنکھ میں وہ نور ہونا چاہئے کہ ہر کوئی سمجھ جائے کہ یہ خدائی خدمت گار ہے۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ لوگ خوشی سے منہ ہی کام کریں جو آپ ان سے کروانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کہیں گئی اکیلی ادبے پار دنگار عورت ملے تو بجائے ڈر کے وہ یہ محسوس کرے کہ میں اس شخص کے سائے میں پوری طرح سے محفوظ

ہوں۔ آج سرکارِ شارع عام پر تھوکنے سے روکنے کے لئے یاد دہری کسی غلاطت کو بند کرنے کے لئے قانون بناتی ہے۔ تب بھی کام نہیں چلتا۔ خدائی خدمت گار کو لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے گھر کر لینا چاہئے کہ اس کا لفظ بھی ان باتوں کو روکنے کے لئے کافی ہو۔

آج ہٹلر کی آواز سے لاکھوں دل کانپ جاتے ہیں ابھی مسٹر جمپلین اور فرانس کے امپچی و لاو میر اپنی بات منوانے کو خود اس کے پاس گئے سلطنتِ فرانس اور برطانیہ کی ساری طاقت اُن کے پشت پر تھی۔ پھر بھی اپنا سامنے لے کر آنا پڑا۔ یہ ایک قسم کی طاقت کی مثال ہے۔

یہ طاقت ہے لاکھی کی۔ ہٹلر اور مسولینی دنیا کو کوئی تہی چیز نہیں ہے رہے۔ مگر جس طاقت کا ذکر آج میں خدائی خدمت گاروں کے سامنے کر رہا ہوں۔ وہ بالکل ایک نئی قسم کی اور جدا چیز ہے۔ مثال کے طور پر اگر خدائی خدمت گاروں کا ایک اشارہ ہندوستان کی سب رعایا سے وہ کام کرا سکے جو کہ سرکار اپنے قواعد اور قوانین کے زور سے بھی نہیں کرا سکتی تو ان کو کون سی طاقت کی ضرورت ہوگی؟ کیا ان کی طاقت مسولینی یا ہٹلر کی طاقت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نہ ہوگی۔

وہ طاقت ہے۔ محبت کی، عام تشدد کی، اگر میں ہر طرف جیسا کہ میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ اس قسم کی نشانیاں دیکھوں تب میں آپ کو سچا خدائی خدمت گار سمجھوں گا۔ اور میں یہ سمجھوں گا کہ ہندوستان کی آزادی سچ مح قریب ہے۔ خدائی خدمت گار

کو کسی زندگی بسر کرنی چاہئے؟ ان کو کیا تعلیم ملنی چاہئے؟ آج کل
 میں جو میں گھنٹے یہی سمجھا رہا ہوں۔ انھیں دن رات خدمت ہی کا
 خیال رہنا چاہئے۔ عدم تشدد کے ذریعے سے لڑائی کرنے کے
 لئے انھیں ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ عدم تشدد کی لڑائی
 میں آزادی کے لئے سلطنت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان
 قربان کرنے کی طاقت تو ان میں ہونی ہی چاہئے۔ چاہے مقابلہ
 سلطنت سے ہو یا اپنے بھائیوں سے۔ یہ امن کے واحد شہیا
 کر بھی نہ چھوڑیں۔ ان کا ہمیشہ ہی ایک طریقہ رہے یعنی امن کا۔ عدم
 تشدد کا، مگر اپنے بھائیوں سے ہیں لڑنا ہی کیوں پڑے؟
 اگر وہ ہماری مخالفت کرتے ہیں تو ہم برا کیوں مانیں؟ ان
 پر غصہ کیوں کریں؟ میں یہ نہیں مانتا کہ وہ سب بڑے آدمی
 ہیں۔ اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہو کہ ان میں کچھ بھلے آدمی بھی ہیں
 گستاخ ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ کانگریس بد معاش
 لوگوں کی جماعت ہے۔ اس کا ساتھ دینے والے یا تو خود
 بد معاش ہیں یا بد معاش لوگوں کے زیر اثر ہیں۔ ان کے
 پیچھے سے ملک کو چھڑانا چاہئے۔ ہمیں اپنے مخالفین کا نقطہ نگاہ
 سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تبھی ہم اس کا علاج بھی کر سکیں
 گے۔ غصے سے یہ علاج نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنے عمل سے
 بتا دینا چاہئے کہ ہم بد معاش نہیں۔ بے ایمان نہیں، خود غرض

نہیں ہیں۔ ہمیں پیسہ نہیں چاہیے۔ طاقت نہیں چاہیے۔ صرف اپنے ملک کی آزادی چاہیے۔ اگر ہم سچے ہیں۔ سچ پنج ہمارے دل میں آزادی کی لگن ہے۔ اس کے لئے سب کچھ قرباں کرنے کو تیار ہیں تو ہمارے مخالفین ضرور آخر میں غلطی کو محسوس کریں گے اور جیسے موم آگ کے پاس آ کر پگھل جاتا ہے۔ ہماری محبت اور ایثار ان کے دلوں کو پگھلا دے گا۔ اب فرض کرو کہ اس طرح کرتے کرتے ہم جیل چلے گئے اور وہاں ہمیں کسی نے گالیاں بھی دیں تو ہمارے دل میں غصہ نہیں آئے گا۔ آنکھ لال نہیں ہونے پائے گی۔ اگر غصہ آگیا تو ہمارا جیل جانا بے کار ہوا۔ بادشاہ خاں ہی کو لیجئے۔ آپ نے انھیں بادشاہ خاں، فخر افغان وغیرہ کے محبت بھرے نام دئے ہیں۔ جیل میں اگر وہاں کے سپاہی انھیں گالی دیں۔ اور انھیں یا آپ کو غصہ آئے کہ اس دوسرے کے آدمی کی یہ کیا مجال کہ انھیں گالی دے! تو بادشاہ خاں اور آپ جیل جانے کے لائق نہیں۔ ہمیں یہ سب باتیں شانتی سے برداشت کرنی چاہئے۔ ہم جیل میں جلتے ہیں تو سرکار کو ستانے کی غرض سے نہیں بلکہ اپنی بے گناہی کا اپنے عدم تشدد کا جیتا جاگتا ثبوت دینے کے لئے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے کم آدمی جیل گئے ہیں۔ عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ صرف جیل چلنے ہی سے آزادی مل جائے گی حالانکہ انھیں سرکار کو دکھانا تھا کہ اگر سرکاری لوگ سختی بھی کریں

زیادتی بھی کریں تو بھی ہمیں غصہ نہیں آتا۔ ہم میں قانون کی پابندی کی صلاحیت کچھ کم نہیں مگر صرف اخلاقی مجبوری سے ہم اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اگر ایسے سچے آدمی ہزاروں کی تعداد میں جیل گئے ہوتے تو آزادی مل گئی ہوتی۔ مگر میرے ساتھیوں ہی نے میرے سامنے قبول کیا کہ تم جو کہتے ہو وہ ہے تو ٹھیک مگر ہمارے گلے نہیں اُترتا۔ ہمارے دل میں تو سندوق بھری ہے۔ مگر سم جائے ہیں کہ اس سے اس وقت کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے تمہاری بات اس وقت ماننے لیتے ہیں۔ تب جیل جانے سے کچھ نتیجہ نکلا مگر جتنا ہم چاہتے تھے اتنا نہ نکلا۔

جب پٹنہ میں میں نے لڑائی موقوف کی تو میں نے اعلان کیا تھا کہ یہ ہم اس لئے نہیں کرتے کہ ہم کم زور ہو گئے ہیں۔ ہر پاؤگ جیل جانے کو تیار نہیں بلکہ اس لئے کہ تشدد بھرے دل سے جیل جانے سے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ قربانی کے لئے اہلیت چاہئے۔ اب سوال یہ ہے کہ قربانی کا حق کس کے ہے؟ اس کے لئے کیسی اہلیت ہونی چاہئے۔ کیسی تیاری چاہئے؟ یوں تو چور ڈاکو بھی جیل جاتے ہیں۔ مار کھاتے ہیں۔ مگر ان کا یہ کام قربانی ٹھوڑا ہی ہو گا۔ وہ تو اپنے گناہوں کی سزا پاتے ہیں جسے قربانی دینا ہے اُسے بے گناہ ہونا چاہئے۔ صاف دل پاک دامن ہونا چاہئے۔ تبھی اس کی قربانی کی کوئی قیمت ہوگی۔ تبھی اس کی قربانی کا کوئی نتیجہ بھی ہوگا۔ جس کے

مئے ہمیں قربانی دینی ہے۔ پہلے ہمیں اس کی خدمت کرنی سیکھنا چاہئے۔ بس خدائی خدمت گار کو سب سے پہلے خلق خدا کا خادم ہونا چاہئے۔ آج ہندوستان کے کروڑوں بھوکوں کی خدمت کا بہترین طریقہ چرخہ اور کھڑی رہی ہے۔ بھوکے کو بھکاری بنانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ چرخہ کسی کو بھکاری بنانے بغیر ادا دیتا ہے۔ آج لاکھوں روپے اس کے ذریعے ہندو مسلمان عورتوں کے گھروں میں پہنچتے ہیں۔ اسی طرح آپ تھوڑا سا بیماریوں کا علاج اور فرسٹ ایڈ کا کام سیکھ لیں تو غریبوں کی خاصی خدمت کر سکیں گے۔ اپنے صوبے سے باہر کے لوگوں کی خدمت کرنی ہو، وہاں کے حالات سے واقف ہونا ہو تو پشتو کے علاوہ ہندوستانی بھی آئی چاہئے ہیں یہ سب باتیں آپ سے اس لئے کہتا ہوں کہ میری آنکھوں کے سامنے اس دن کا نقشہ ہے۔ جب آپ کو اپنے صوبے سے باہر سارے ہندوستان میں خدمت اور آزادی کے لئے نکلنا پڑے گا۔ اس وقت ہندوستانی آپ کے کام آئے گی۔

آج کے زمانے میں جیل جانا بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جیل جانے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔ سرکار کو خود جیل ہونا چاہئے کہ بے گناہوں کو جیل میں ڈال کر حکومت نہیں چل سکتی روحانی طاقت خدا کی دین ہے۔ اگر دل میں خدا نہیں تو کلمہ یا گائتری پڑھنا محض طیٹے کی رٹ ہے۔

صوابی تحصیل کے خدائی خدمت گاروں کے افسروں سے
 گاندھی جی نے بات چیت کرتے ہوئے کہا: میں آپ سے کہنا چاہتا
 ہوں کہ اگرچہ میں بعض دوسرے کام بھی کرتا ہوں۔ مگر میرا دل دین
 رات آپ ہی میں پڑا رہتا ہے۔ اُسٹے بیٹھتے، کھاتے پیتے آپ کی
 صورت آنکھ کے آگے رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ
 لوگوں سے بڑی بڑی امیدیں باندھ رکھی ہیں اور رہا اب سے نہیں
 برسوں سے ہیں۔ لاہور کانگریس کے موقع پر آپ لوگ ایک بڑی
 تعداد میں آئے تھے۔ اس سے پہلے میری ملاقات بادشاہ خاں سے
 نہیں ہوئی تھی۔ وہیں پہلی دفعہ جان پہچان ہوئی۔ اس کے بعد وہ
 جیل بھیج دئے گئے۔ رہا ہوتے ہی نہ میرے پاس آئے۔ اور میرے
 ساتھ ہی رہے۔ تب سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے
 کہ آپ لوگوں کے ذریعے بڑا کام کیا جاسکتا ہے۔ اگر میری یہ امید
 برآتی ہے تو میرے جیسا آدمی یوں ہی نہیں بیٹھا رہ سکتا۔ بعد میں مجھے
 یہ کہنا پڑے کہ میں نے تو ان لوگوں کا اعتماد کر لیا تھا مگر ان لوگوں نے
 اپنے عہد کے مطابق عدم تشدد کو نہیں نبھایا۔ تو خدا کے دربار میں
 بھی میں ذمہ داری سے بری نہ ہوں گا۔

اگر میں آپ لوگوں سے پوچھوں تو آپ بھی ضرور وہی جواب
 دیں گے جو دوسری جگہ خدائی خدمت گاروں نے دیا ہے یعنی آپ
 عدم تشدد کو سمجھتے ہیں، اور لڑائی کے وقت اس پر قائم رہیں گے؟

لڑائی تو آج بھی جاری ہے صرف صورت بدلی ہوئی ہے۔ بجائے جیل خانے کے ہم اسمبلی میں جا کر حکومت سے بھڑتے ہیں۔ اسلئے اور اس کے بعد کی لڑائی میں جیل جانے، لاکھٹیاں کھانے اور لاکھٹیاں پہنے کے امتحان میں آپ پاس ہو چکے ہیں۔ مگر میری نظر میں یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس کی زیادہ اہمیت اس زمانے میں تھی جب جیل جانا شرم کی بات سمجھی جاتی تھی مگر اب تو ہم نے جیل جانے کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، جیل کو گھر بنا لیا ہے۔ اب جیل جانا کوئی شرم کی بات نہیں۔ اس لئے اب جیل جانے کی اتنی اہمیت نہیں رہی۔ میری نظر میں تو جیل جانے کی بجائے خود کبھی قدر تھی ہی نہیں۔ اصل قدر جیل جانے کی قابلیت ہو سکتی ہے۔ جب میں پہلی بار جنوبی افریقہ میں جیل گیا تو میں نے خدا سے دعا کرنے کے بعد اپنے دل سے پوچھا کہ کیا میں واقعی اس کے قابل ہوں! کیا میرا دل صاف ہے! یا میں محض لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ جب ہم بغیر کسی قصور کے جیل جاتے ہیں تو ہمیں موقع ملتا ہے کہ سرکاری آدمیوں پر بھی اپنی بے گناہی ثابت کروں۔ ایسے شخص کی بے گناہی سرکار کو چھیتی ہے، اور وہ سوچنے لگتی ہے کہ اسی طرح سب لوگوں کو بے گناہ جیل میں ڈال دیا تو حکومت کیسے چلے گی جیل جانے کا اصل مقصد یہی ہے۔

آج میرا جسم کمزور ہو گیا ہے، مگر دل نہیں۔ ابھی مجھ میں حکومت

لڑنے کی کافی طاقت موجود ہے۔ پھر میں کیوں ملک کو لڑائی کے
 لئے نہیں بلاتا؟ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ کانگریس کے نظام
 میں ابھی تک تشدد موجود ہے (جھوٹ، خود غرضی، بددیانتی، گزلی
 یہ سب تشدد ہی کی مختلف صورتیں ہیں)، اس لئے میں آج کانگریس
 والوں سے کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے نظام میں سے یہ سب برائیاں
 نہیں نکال سکتے، اگر آپ کے دل میں تشدد چھپا ہوا ہے تو محض منہ
 سے عدم تشدد کا دعوے کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ آپ اسے
 چھوڑ دیں۔ آپ سے بھی آج میں یہی کہتا ہوں کہ اگر آپ کے دل میں
 جس طرح ایک چھوٹے بچے کے لئے اسی طرح ایک ظالم سے ظالم
 شخص کے لئے بھی رحم موجود ہے تب ہی آپ عدم تشدد کو اختیار
 کریں۔ اگر یہ بات نہیں۔ آپ ایسے نہیں بن سکتے یا نہیں بنتا چاہتے
 اگر آپ کا یہ خیال ہے، ظالم پر غصہ تو آئے ہی گا تو آپ اس
 راستے کو چھوڑ دیں۔ یہ بھی آپ کے لئے ایک طرح کی بہادری
 ہوگی۔ آخر آپ پٹھان ہیں۔ بہادری آپ کا جوہر ہے۔ تو یہ بہادری
 بھی آپ میں آنی چاہئے۔ یہ ہندوستان کے لئے برا نہیں کچھ
 اچھا ہی ہوگا، اور اگر عدم تشدد آپ میں نہیں ہے اور اس
 کا دعوے کرتے ہیں تو اس میں ملک کی برائی ہوگی۔ لیکن اگر آپ
 کو دل سے یقین ہو گیا ہے کہ عدم تشدد یعنی روحانی طاقت ہی اصل
 طاقت ہے تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ یہ عافیت خدا سے ملتی ہے۔

خدا دل میں نہیں تو آپ کتنا ہی کلمہ پڑھتے رہیں اور میں گائتیری
 اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ تو ایک طوطے کو بھی سکھایا جاسکتا
 ہے۔ بلکہ طوطا تو گائتیری اور کلمہ دونوں پڑھ سکتا ہے۔ مگر رسنا
 طوطے کا طوطا ہی۔ یہ بنیادی چیزیں میں نے کچھ تفصیل سے آج آپ کے
 سامنے رکھی ہیں۔ کیونکہ باقی سب چیزیں اسی میں سے نکلتی
 ہیں۔“

آٹھواں باب گاندھی جی اور بادشاہ خاں کی گفتگو

گاندھی جی کی صوبہ سرحد کی مہم کا ایک نازک مرحلہ وہ تھا جب کہ پشاور اور مردان کے ضلعوں میں خدائی خدمت گاروں کا معائنہ کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹ اور ۲۰ اکتوبر کو اتان زئی کی سیرکین قیام گاہ میں بادشاہ خاں سے تبادلہ خیالات کیا۔ انھوں نے پوچھا آپ کے خیال میں خدائی خدمت گاروں کا رویہ عدم تشدد کے بارے میں کیا ہے۔ بادشاہ خاں نے جواب دیا ”مہاتما جی میرا خیال یہ ہے کہ جیسا خود انھوں نے ہمارے سامنے اعتراف کیا تھا وہ اناڑی زنگروٹ ہیں، اور ابھی تک معیار سے بہت نیچے ہیں۔ ان کے دلوں میں تشدد موجود ہے اور وہ اسے دور کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج میں خرابیاں ضرور ہیں مگر ان کے خلوں میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر موقع ملے تو ان کو تشکیک

کیا جاسکتا ہے، اور میرے خیال میں اس کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔“

بات یہ ہے کہ بادشاہ خاں کو خود اس معاملے میں بہت فکر ہے۔ انھیں یقین ہے کہ تشدد اُن کی قوم کے لئے ایک لعنت ثابت ہوا ہے۔ یہ ایک ناسور کی طرح اُنھیں کھائے جاتا ہے اور اُن کے زوال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ایک اور موقع پر گاندھی جی سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے اس مسئلے کو چھیڑا۔ وہ اپنے ملک کے قدرتی مناظر کی حسن و دل کشی کا ذکر کر رہے تھے اور ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی جو بے موقعوں پر ہمیشہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ قدرت کا ذکر کرتے کرتے انسان پر اسے تو اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انھوں نے کہا:-

”مہاتما جی! یہ ملک جہاں میوے اور غلے کی اس قدر افراط ہے، دنیا میں جنت کا نمونہ ہوتا مگر آج یہ ایک عذاب میں مبتلا ہے۔ مجھے روز بروز زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ تشدد اس صوبے میں ہم پٹھانوں کے لئے سب سے بڑی لعنت ثابت ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ایکے کو توڑ دیا اور ہم میں خانہ جنگیاں پیدا کر دی ہیں۔ آج کل پٹھان کی ساری طاقت کا مصرف یہی ہے کہ اپنے بھائی کا گلا کاٹ ڈالے۔ اگر ہیں اس لعنت سے چھٹکارا مل جائے تو پٹھانوں کی اس قوت سے کیسے کیسے مفید کام لئے جاسکتے ہیں۔“

اور صوبوں میں چاہے جو کچھ بھی ہو مگر یہ مجھے پورا یقین ہے کہ صوبہ سرحد کے لئے عدم تشدد کی تحریک خدا کی بڑی رحمت ہے۔ پٹھانوں کے لئے عدم تشدد کے سوا نجات کی کوئی اور راہ نہیں۔ میں یہ بات اپنے اس تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ عدم تشدد پر تھوڑا سا عمل کرنے سے ہم میں ایک حیرت انگیز انقلاب ہو گیا ہے۔ مہاتاجی! ہم پہلے بنمول اور کابل تھے۔ انگریزوں کو دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔ ہمارا وقت بے کار گزرتا تھا۔ آپ کی تحریک نے سارا نقشہ بدل دیا ہے۔ اس نے ہم میں ایک نئی روح پھونک دی ہے، اور ہمیں اس قدر محنتی بنادیا ہے کہ جس حکیت میں پہلے دس روپے کی فصل پیدا ہوتی تھی، اب بیس روپے کی ہوتی ہے۔ ہم نے خوف کو دل سے دور کر دیا ہے۔ اور اب ہم انگریزوں سے کیا دنیا میں کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔“

انھوں نے مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کیا۔ سول نافرمانی کے زمانے میں ایک انگریز افسر نے جس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ تھا، سرخ پوشوں کے جلوس کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ دفعہ ۴۴۱ کے ماتحت حکم امتناعی اس کی جیب میں تھا مگر وہ اسے دکھاتا نہیں تھا کیونکہ وہ اپنا دنگ پن ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ ایک سرخ پوش کے ہاتھ سے جو جلوس کے آگے آگے تھا، قومی جھنڈا چھین لے۔ لیکن اس شخص نے جھنڈا نہیں

دیا۔ اس پردہ آپسے باہر ہو گیا اور اس نے سپاہیوں کو
 گولی چلانے کا حکم دیا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کے چھٹے جھوٹ گئے کہ سرخ
 پوش نہایت اطمینان سے سینے پر گولیاں کھانے کو تیار کھڑے
 ہیں۔ اس لئے اُسے کچھ اور کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ بادشاہ غلام
 نے کہا۔ "مہاتاجی اس کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔
 اس کے منہ سے بات تک نہیں نکلتی تھی۔ میں نے اسے اطمینان
 دلانے کے لئے کہا کہ ہم لوگ ہتھتے ہیں، آپ کو ہم سے ڈرنے کی
 کوئی وجہ نہیں۔ اگر آپ اس قدر غرور اور تکبر سے کام لینے اور
 گولی چلانے کا حکم دینے کے بجائے پہلے ہی حکم امتناعی دکھا دیتے
 تو ہم چپ چاپ منتشر ہو جاتے۔ اس لئے کہ ہم احکام کی خلاف
 برداری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ انگریز
 ہمارے عدم تشدد سے ڈرتے ہیں کہتے ہیں کہ ایک غیر متشدد
 پٹھان تشدد کرنے والے پٹھان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔
 اگر ہم عدم تشدد کے اصول کو جس کی آپ نے ہم کو تعلیم دی
 ہے پوری طرح سمجھ سکتے اور اس پر عمل کرتے تو پھر ہماری طاقت اور
 کامیابی کا کیا پوچھنا تھا۔ ہم تباہی کے گڑھے میں گرنے ہی کو تھے
 لیکن خدا نے اپنے فضل و کرم سے عدم تشدد کی تحریک کے ذریعہ
 سے ہمیں بچالیا۔ میں اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ سوراج
 کے نعرے لگانے سے کیا فائدہ۔ اگر تم خوف کو دل سے دور کر دو

اور اپنی قوت بازو سے حلال کی روزی پیدا کر دے تو تم کو وہی تمھارا
سوراج ہے ۛ

گاندھی جی نے بادشاہ خاں کو رائے دی کہ اگر ان کو عدم تشدد
کے اصول کی سچی آزمائش کرنی ہے تو خدائی خدمت گاروں کو
اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ وہ عملی عدم تشدد کی تربیت حاصل
کریں۔ بادشاہ خاں پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اتان زنی کے
قریب اور ہندی کے گاؤں میں خدائی خدمت گاروں کے لئے ایک
ٹریننگ سینٹر قائم کریں۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا تھا کہ خود
اتان زنی میں کتائی اور بنائی کا ایک مرکز کھولا جائے گا اور یہاں
خدائی خدمت گاروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی کتائی اور
بنائی وغیرہ کے مہذب اور پر امن فن سکھائے جائیں گے۔ بادشاہ خاں
نے کہا ”مہاتما جی میرا خیال یہ ہے کہ اتان زنی کو ایک نمونے کا گاؤں
بنایا جائے۔ کتائی اور بنائی کا مرکز گاؤں والوں کی تعلیم کے لئے ایک
منتقل نائش کا کام دے گا۔ خدائی خدمت گاروں کے مرکز میں
ہم یہ کوشش کریں گے کہ اپنی سب ضرورتوں کو خود ہی پورا کریں۔ ہم
صرف اپنے بنائے ہوئے کپڑے پہنیں گے۔ اپنی بولی بولی بھارتی
اور پھل کھائیں گے اور ایک چھوٹی سی ڈیری کھول لیں گے جس سے
دودھ ملتا رہے جو جیڑ ہم خود پیدا نہیں کر سکتے اسے ترک کر دیں
میں۔ گاندھی جی نے کہا ”بہت اچھا خیال ہے بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں

کہ خدائی خدمت گاروں کو اپنے رہنے کے لئے جھونپڑیاں بنانے میں بھی حصہ لینا چاہئے۔ بادشاہ خاں نے جواب دیا کہ تمہارا بھی یہی ارادہ ہے۔“

کارکنوں کے پہلے چٹھے کی ٹریننگ کے لئے گاندھی جی نے یہ رائے دی کہ بادشاہ خاں کچھ خدائی خدمت گاروں کو منتخب کر کے دروہا بھیج دیں جہاں وہ کھاوی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ فرسٹ ایڈ حادثوں کا فوری علاج، حفظانِ صحت، صفائی گاوٹیں سدھار کے دوسرے کام اور ہندوستانی زبان سیکھ لیں گے اس کے ساتھ ساتھ وہ بنیادی تعلیمی اسکیم سے بھی واقف ہو جائیں گے اور وہاں سے آکر عام تعلیم کا کام کر سکیں گے۔ گاندھی جی نے یہ بھی کہا کہ ”خان صاحب آپ کا کام اس کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا آپ آگے آگے چلیں اور خود ان سب چیزوں میں مہارت حاصل کریں بادشاہ خاں نے اس سے اتفاق کیا۔ آخر میں گاندھی جی نے فرمایا ”اگر آپ نے اپنے اس ادارے میں وقت کی پابندی سختی سے نہ کرائی تو سارا کام بگڑ جائے گا۔ دن بھر کے کام کا ایک دستور عمل ہونا چاہیے۔ صبح اٹھنے، رات کو سونے، کھانے، کام اور آرام کے اوقات مقرر ہونے چاہئیں اور ان کی سختی سے پابندی ہونی چاہئے، میں اپنے پروگرامِ وقت کی پابندی پر سب سے زیادہ زور دیتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بھی عدم تشدد کا لازمہ ہے۔“

اس کے بعد ان دونوں نے اس مسئلے پر گفتگو کرنی شروع کی کہ جب خدائی خدمت گار عدم تشدد میں پکے ہو جائیں گے تو وہ سرحد پار کے قبائل کے چھاپوں سے نبٹنے کا کیا طریقہ اختیار کریں گے۔ بادشاہ خاں کا یہ خیال تھا کہ یہ کام پولس اور فوج کی موجودگی کی وجہ سے، جن پر عوام کو پوری طرح اختیار نہیں ہے، بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یا تو حکام کو ہمارے ساتھ پوری طرح اتحاد عمل کرنا چاہئے یا پہلے آزمائش کے طور پر ایک ضلع سے پولس اور فوج کو ہٹا لینا چاہئے۔ اس وقت ہم خدائی خدمت گاروں کے ذریعے امن قائم کرنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ بغیر اس کے امن قائم کرنے کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوں گی۔

لیکن گاندھی جی کا خیال اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے کہا "صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے حکام سے یہ اُمید نہیں کہ وہ ہمارے ساتھ پوری طرح اتحاد عمل کریں۔ انھیں اگر ہماری نیت پر نہیں تو ہماری طاقت پر ضرور شبہ ہوگا۔ یہ توقع بہت زیادہ ہے کہ وہ ہمارے بھروسے پر پولس کو ہٹالیں۔ عدم تشدد ایک عالم گیر اصول ہے اور اس کے عمل میں ناسازگار ماحول سے خلل نہیں پڑ سکتا، بلکہ دراصل اس کی قوت کا اسی وقت امتحان ہو سکتا ہے جب وہ مخالفت کی فضا میں کام کرے۔ اگر ہمارا عدم تشدد اپنی کامیابی کے لئے حکام

کی مرضی کا پابند ہو تو وہ بالکل کھوکھلی اور نکمی چیز ہوگا۔ اگر ہم لوگوں پر پورا اثر قائم کر سکیں تو فوج اور پولس کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ انھوں نے بادشاہ خاں کو بتایا کہ پرنس آف ویلز کے آنے کے موقع پر بھی میں جو فسادات ہوئے تھے، ان میں کانگریس نے فوراً حالات پر قابو پا کر امن قائم کر دیا اور پولس اور فوج کھڑی تاشا دیکھتی رہی۔

بادشاہ خاں "مگر مشکل یہ ہے کہ چھاپہ مارنے والے اکثر وہ بد معاش ہیں جو برطانوی ہندوستان سے بھاگ کر گئے ہیں، ہم کو ان سے ملنے کا موقع نہیں مل سکتا اس لئے کہ حکام ہمیں قبائلی علاقے میں جانے کی اجازت نہیں دیتے۔"

گاندھی جی: "انھیں ضرور اجازت دینی چاہئے، اور میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ جب ہم پوری طرح تیار ہو جائیں گے تو وہ ضرور اجازت دیدیں گے لیکن اس کے لئے ہمیں سچے معنی میں خدائی خدمت گار بننا پڑے گا اور عدم تشدد کو ایک زندہ اصول بنانا پڑے گا۔ عدم تشدد ایک اعلیٰ درجے کی عملی قوت ہے۔ یہ روحانی یا خدائی قوت ہے جو ہمارے اندر موجود ہے۔ ناقص انسان اس جوہر کا مل لاشا ہدہ نہیں کر سکتا۔ اس کی آنکھیں اس کے نور سے خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اگر اس کا ایک ذرہ بھی ہمارے اندر قوت سے فعل میں آجائے تو ایسے ایسے کام کر سکتا ہے جس سے لوگوں کی عقل ذنگ رہ جائے۔"

سورج کی جان بخش حرارت سے ساری کائنات کو فیض پہنچا ہے، لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ قریب پہنچ جائے تو جل کر راکھ ہو جائے یہی حال فناء الہی کا ہے ہم جتنا عدم تشدد پر عمل کرتے ہیں اتنا ہی خدا سے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں۔ عدم تشدد کا عمل ریڈیم کی طرح ہے۔ اس کی ایک خفیف سی مقدار اگر کسی زہریلے پھوڑے وغیرہ کے اندر موجود ہو تو بڑا بڑا خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ سارے خراب گوشت کو ٹھیک کر دیتی ہے۔ اسی طرح سے سچے عدم تشدد کی پھوڑی سی مقدار بھی ہماری نظروں سے پوشیدہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہتی ہے، اور سارے سماج کو بدل دیتی ہے۔ اس کا عمل بغیر کسی خارجی محرک کے آپ ہی آپ ہوتا ہے۔ روح مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اس کا وجود جسم پر منحصر نہیں ہے۔ اس طرح عدم تشدد یا روحانی قوت کو اپنا اثر ڈالنے کے لئے جسمانی وسائل کی ضرورت نہیں۔ وہ بغیر ان کے کام کرتی ہے وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر عدم تشدد ایک جگہ کامیابی کے ساتھ قدم جمائے تو اس کا اثر سب کہیں پھیل جائے گا۔ جب تک اُٹمان زئی میں ایک ڈاکہ بھی پڑے گا، میں یہی کہوں گا ہمارا عدم تشدد صحیح نہیں ہے۔

وہ بنیادی اصول جس پر عدم تشدد کا عمل مبنی ہے یہ ہے کہ جو بات ایک کے لئے صحیح ہے، وہ ساری دنیا کے لئے صحیح ہے۔ سب انسان حقیقت میں ایک ہیں۔ اس لئے جو میرے لئے ممکن ہے وہ سب کے لئے ممکن ہے۔ اس دلیل سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر میں ان مسائل کو جو کسی ایک گاؤں میں پیدا ہوتے ہیں عدم تشدد کے ذریعے سے حل کر سکوں تو جو سبق اس سے ملے گا اس کی بدولت میں سارے ہندوستان کے اس قسم کے مسائل حل کر لوں گا۔

اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ سیوا گرام میں بس جاؤں۔ یہاں کیا قیام میرے لئے ایک درس عمل ثابت ہوا۔ ہر بچوں کے سابلئے سے جو تجربہ مجھے ہوا اس سے ہندو مسلم اتحاد کا بہترین حل ہاتھ آ گیا۔ جو معاہدوں وغیرہ سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح اگر آپ اٹمان نئی میں سب معاملات کو ٹھیک کر لیں تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ہمارے تعلقات انگریزوں کے ساتھ بھی بہتر ہو جائیں گے۔ اگر ہم انھیں یہ دکھا دیں کہ ہم کو اس حفاظت کی ضرورت نہیں جس کے لئے ان کی پولس اور فوج بٹھا ہر رکھی گئی ہے۔

لیکن بادشاہ خان نے ایک شبہ ظاہر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہر گاؤں میں ایسے خود غرض اور لمبییرے موجود ہیں جن کو اپنی ذاتی غرض کے لئے کسی بات میں تامل نہیں۔ کیا یہ بہتر ہو گا کہ ہم ان لوگوں کو بائبل چھوڑ دیں یا ان کو بھی درست کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

گاندھی جی نے کہا "شاید آخر میں ہمیں ان میں سے بعض کو چھوڑنا پڑے لیکن ہمیں یہ حق نہیں کہ کسی کو بھی ناقابل اصلاح سمجھیں ہم کو ظالم کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اکثر وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے صبر اور ہمدردی کے ذریعے سے ہم کہے کم ان میں سے بعض کو انصاف کی طرف لا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ نہ بھولنا چاہئے کہ برائی بھی اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک بھلائی سے مدد نہ لے۔ صرف حق ایسی چیز ہے جس کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کچھ نہ ہو سکے تو آخر میں ہم ان کی بدی کی قوت کو اس طرح کر سکتے ہیں کہ ان سے اتکا و عمل نہ کریں اور ان کو بالکل تنہا چھوڑ دیں۔

یہ بے تشدد عدم تعاون کے اصول کا پتھر ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ عدم تعاون کی جڑ محبت پر قائم ہونی چاہئے۔ اس کی غرض مخالف کو منراوینا یا نقصان پہنچانا نہ ہونی چاہئے۔ اس کے ساتھ عدم تعاون کرتے ہوئے بھی ہمیں اسے یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ہم اس کے دوست ہیں اور جہاں تک ممکن ہو ہمدردی اور خدمت کے ذریعے اس کے دل پر اثر ڈالنا چاہئے۔ سچ پوچھئے تو عدم تشدد کا سب سے بڑا معیار یہی ہے کہ یہ تشدد جنگ کے بعد دل میں بعض نہیں رہتا، اور آخر میں دشمن دوست بن جاتے ہیں اس کا بکھر بکھے جنوبی افریقہ میں جنرل اسٹس کے ساتھ ہوا۔ تشدد میں وہ میرے سخت دشمن

اور نقاد تھے۔ آج وہ میرے پتے دست میں۔ آٹھ سال تک ہم ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن دوسری گول میز کانفرنس کے زمانے میں وہی تھے جنہوں نے جلوت اور خلوت میں میرا ساتھ دیا اور میری پوری پوری مدد کی۔ یہ بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔ زمانہ بدل جاتا ہے اور تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ آخر میں صرف عدم تشدد یا وہ چیزیں جو اس پر مبنی ہیں باقی رہ جائیں گی۔ انیس سو سال ہوئے عیسائیت ظہور میں آئی۔ حضرت عیسیٰ کی پیغمبری کا زمانہ صرف تین سال تک رہا۔ ان کی تعلیم کو خود ان کے زمانے میں بھی لوگوں نے غلط سمجھا اور آج تو عیسائیت ان کی مرکزی تعلیم "اپنے دشمن سے محبت کرو" کی بالکل ضد ہے لیکن ایک بڑے اصول کے پھینکے لئے انیس سو سال کی مدت کیا چیز ہے۔

چھ سو سال گزرنے کے بعد اسلام کا دور دورہ ہوا۔ بہت سے مسلمان مجھے یہ تک نہیں کہنے دیتے کہ اسلام جیسا اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے خالص امن ہے۔ میں نے قرآن کے جو معنی سمجھے ہیں اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اسلام کی بنیاد تشدد پر نہیں ہے مگر یہاں بھی تیرہ سو سال زمانے کے لوح پر ایک دھبے سے زیادہ نہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ دونوں مذہب اسی حد تک زندہ رہیں گے جس حد تک کہ ان کے پروردگار عدم تشدد کے مرکزی اصول کو اختیار کریں گے۔ مگر یہ چیز صرف دماغ سے نہیں سمجھی جاسکتی بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ قلب میں اُتر جائے۔

نواں باب

”رمضان میں“

کچھ دن تک گاندھی جی اتان زئی میں آرام کرتے رہے اور اسی عرصے میں بادشاہ خاں کے ساتھ مل کر یہ سوچتے رہے کہ عدم تشدد کے اس نظریے کے مطابق جس کی انھوں نے تلقین کی تھی خدائی خدمت گاروں کی تحریک کی تنظیم از سر نو کس طرح کی جائے اس کے بعد ۲۱ اکتوبر کو انھوں نے صورتِ سرحد کا دورہ پھر شروع کر دیا۔

اگلے ہفتے گاندھی جی کو کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے اضلاع کا دورہ کرتا پڑا اور بہت سخت مصروف رہے۔ جوں جوں ہم پشاور اور مریطان کے پشتو بولنے والے اضلاع سے دیہ مریخ پویش پہنچتا ہے، اس لئے کہ یہاں خدائی خدمت گاروں کی تحریک کا زور دیا وہ ہے، جنوب کی طرف بڑھتے گئے ہمارے روزانہ سفر کیا ہوتا گیا۔ موٹر کی سواری زیادہ تکلیف دہ ہوتی گئی۔ محبوبوں

کاشور و غل بڑھتا گیا، اور ضبط و نظم کم ہوتا گیا۔ جلسوں میں شرکت کی زحمت اس کے علاوہ تھی۔

اس خیال سے کہ بادشاہ خاں اور خدائی خدمت گاروں کو رمضان کے زمانے میں دورے کا انتظام کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے گاندھی جی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یا تو ان کے دورے کا پروگرام کم کر دیا جائے یا دورے کی رفتار تیز کر دی جائے لیکن بادشاہ خاں نے ایک نہ سہنی وہ اور ان کے خدائی خدمت گار بادجو و رمضان کے اپنے کٹھن فرائض کو ان تھک محنت سے انجام دے رہے تھے۔ اتان زئی میں انھوں نے گاندھی جی کے آرام کے خیال سے اپنے سارے خاندان کو تتر بتر کر دیا۔ اپنے بیٹے کو انھوں نے نوکروں کی کوٹھری میں بھیج دیا، اور خود کہیں اور جا کر سوئے۔ وہ گاندھی جی کی طرف سے دم بھر بھی غافل نہیں ہوتے تھے اور دن رات ان کی حفاظت اس طرح کرتے تھے جس طرح شیرنی اپنے بچے کی کرتی ہے۔ جب گاندھی جی سو جاتے تھے تو ان کا آٹھ کر دے پاؤں چلنا اور ہر چیز کی دیکھ بھال کرنا دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کبھی وہ اپنے رومال سے فرش کے دھبے جو نوکروں کے پاؤں سے پڑ گئے تھے، چھاڑ دیتے۔ کبھی آہستہ سے گاندھی جی کی چادر کو جو ہٹ گئی تھی ٹھیک کرتے یا جب کوئی دوسرا موجود نہ ہوتا تو کھیاں اڑاتے رہتے اور جیسے ہی کوئی ان کے بجائے کام کرنے

کو پہنچ جاتا۔ چپکے سے کمرے سے چلے جاتے۔ گاندھی جی کے لئے بہترین پھل ہیا کرنے کی خاطر انھوں نے اپنے دوستوں، اور ہمسایوں کے باغ کے باغ چھان ڈالے۔ ایک صبح یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ بادشاہ خاں چپکے سے گھر سے نکل گئے اور کئی گھنٹے کے بعد موسم کے پہلے انگوروں کا ایک بڑا سا خوشے لئے دیئے گئے اور اگر گاندھی جی کے سامنے رکھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اتان زئی سے دو تین میل کے فاصلے پر خدائی خدمت گاروں کے سردار کے گھر گئے تھے۔ جہاں انھوں نے ایک خوشہ کو شاخوں کے اندر چھپا ہوا پہلے سے دیکھ رکھا تھا یہ محض اس کی ایک مثال ہے کہ وہ گاندھی جی کی خاطر مدارت میں کس قدر استہمام کرتے تھے۔ کوہاٹ روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دوسرے کے باقی حصے میں آزمودہ کار خدائی خدمت گاروں کی ایک لاری گاندھی جی کے ساتھ رہے گی۔

کوہاٹ کا ضلع شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے وسط میں واقع ہے۔ کوہاٹ کا شہر اور چھاؤنی جو تحصیل کوہاٹ کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ پشاور سے موٹر کے راستے چالیس میل ہے۔ سڑک کا کچھ حصہ درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کے علاقے سے گزرتا ہے۔ کوہاٹ کا درہ لمبائی میں درہ خیبر سے کم ہے۔ خیبر کو لوگ "خونی شاہراہ" "مرگ مفاجات کی راہ" وغیرہ وغیرہ

کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کی تنگ گھاٹیوں کی بھیانک خاموشی سے
 دل پر ہیبت بیٹھ جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے وہی خنجر ہے ”جری
 خنجر خوار، ناقابل تسخیر اور پراسرار“ کو ہاٹ کا دہ خنجر سے
 زیادہ سنگ لارخ ہے۔ اس کا وحشی حسن زیادہ دل کش ہے
 لیکن اتنا ہیبت ناک نہیں۔ اس کی چوٹیاں زیادہ اونچی ہیں اس
 کی سرخ سفید اور سیاہ چٹانیں دھوپ میں چمکتی ہوئی زیادہ حسین
 معلوم ہوتی ہیں، اور نیچے وادی میں زرخیز کھیتوں اور چھوٹی موٹی
 خوش نما جھونپڑیوں کا سلسلہ ایک تصویر کا منظر دکھانا ہے،
 جس میں منفشتی اور سنہری رنگوں کی قلم کاری عجیب لطیف
 پائی ہے۔

بادشاہ خاں پہاڑ کی سرو ہوا کے جھونکوں سے اور
 ان مناظر کے دل فریب حسن سے باغ باغ تھے۔ انھیں یہ گوارا
 نہ تھا کہ کوئی شخص قدرت کے ان شان دار نظاروں سے متاثر
 نہ ہو۔ دفعۃً وہ چلا اُٹھے ”وہ دیکھو عجب خاں کا گھر“ اسی کے
 ساتھ انھوں نے ایک چھوٹی سی صاف ستھری کچی جھونپڑی کی
 طرف اشارہ کیا۔ میں نے یہ الفاظ جو میک من کی کتاب سے
 یاد رکھے تھے۔ دہرائے ”عجب خاں مولی ایلیس کا بھگائے
 جانے والا مشہور ڈاکو جس نے اپنے طول طویل سلسلہ جرائم
 کی پاداش میں پھانسی کی سزا پائی“

بادشاہ خاں ہنسنے لگے ”کیا کہا پھانسی پائی؟ اچی وہ تو اب
 تک زندہ ہے اور ترکستان کی سرحد پر کسی جگہ رہتا ہے۔ کون
 کہتا ہے کہ وہ بد معاشیں تھا۔“ اس کے بعد انھوں نے اس ڈاکو
 کا سارا قصہ سنایا اور ایک شخص نے جو قصے کے سب افراد کو اچھی
 طرح جانتا تھا اور جس نے سب واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے
 تھے اس کی تصدیق کی۔ عجب خاں بغیر لائسنس کے ہتھیار بیچا کرتا
 تھا۔ برطانوی فورس کے مہجر نے اس کے مکان پر چھاپا مگر اس
 نے کہا اور تم جو جی چاہو کرو لیکن اگر زمانے میں قدم رکھا تو اچھا نہ ہوگا
 افسر ہنسنے لگا اور اس نے دنائے میں عورتوں کے برقعہ اُتروانے
 شروع کئے۔ ڈاکو نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔ اُسے ایک
 ہی تدبیر آتی تھی اور وہی اُس نے اختیار کی۔ مجھے فوراً ایک مشہور
 مصنف کی کتاب کے، جو ابھی حال ہی میں پڑھی تھی، یہ الفاظ
 یاد آ گئے۔ اس ملک میں اگر کسی مرد کو مارو یا کسی عورت کی توہین
 کرو تو اس کا ایک ہی نتیجہ ہے، اور وہ موت ہے۔ اگر کوئی شخص
 یہ چاہے کہ سزائے موت چائے تو یہ ناممکن ہے۔۔۔۔۔۔ دشمن
 جہاں ہاتھ آیا، چاہے وہ سورہا ہو یا بیمار ہو کسی حالت میں بچ
 نہیں سکتا۔۔۔۔۔۔ ان عداوتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں
 ہوتا۔ میں نے یہ الفاظ بادشاہ خاں کو سنائے۔ انھوں نے
 کہا ”جانتے ہو کہ جب مس ایس عجب خاں کی حراست میں تھی

تو اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا؟ چاہے جس سے پوچھ لیں وہ خود یہ کہتی تھی کہ گوری قوم کا کوئی شخص اس کی عصمت کا اس قدر احترام نہ کرتا جس قدر عجب خاں نے کیا۔

کوہاٹ میں بہت زیادہ کام تھا اور اتنا وقت نہ تھا کہ ہم گرم اور ٹھنڈے پانی کے مشہور چشموں کو جا کر دیکھتے، یا ان خوشنما پیاروں کی سیر کرتے جو شہر کے آس پاس واقع ہیں۔ دن بھر گاندھی جی کے پاس مختلف لوگوں کے وفد آتے رہے۔ ایک وفد کمیٹی معافی قرضہ کوہاٹ کا تھا جس نے یہ درخواست پیش کی کہ سالانہ کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں ان لوگوں کو جو لوٹے گئے تھے اور جن کے گھروں میں آگ لگا دی گئی تھی حکومت کی طرف سے قرض دیا گیا تھا۔ اب ان وعدوں کے مطابق جو بار بار کئے جا چکے ہیں ہماری درخواست ہے کہ یہ قرض معاف ہو جائے۔ ایک اور وفد کسانوں کی طرف سے تھا جنہوں نے لگان کے متعلق اپنی شکایات پیش کیں۔ ان کے علاوہ ہریجنوں اور سکھوں کے وفد بھی آئے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ایک بڑے کاغذ پر اپنی شکایتیں اور درخواستیں لکھ کر گاندھی جی کو دیدی تھیں تاکہ وزیر عظم کو پہنچا دیں۔ گاندھی جی نے ان سب کو اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔ اور وعدہ کیا کہ جب پشاور واپس جائیں گے تو ان معاملات کے متعلق وزیر عظم سے گفتگو کریں گے۔ — ۲۲ کی شام کو شہر

کے باہر ایک خوش منظر میدان میں جس کے گرد پہاڑوں کا ایک قدرتی
 گول گھر سا تھا، ایک عام جلسہ کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ کا میئر سید
 نے کوہاٹ کے باشندوں کی طرف سے گاندھی جی کی خدمت میں
 ایک ایڈریس پیش کیا۔ گاندھی جی نے خطاب میں ان سب درخواستوں
 کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اس روز ان کے سامنے پیش کی گئی
 تھیں، کہا میں نے آج آپ کی مشکلوں اور تکلیفوں پر غور کرنے
 میں ایک گھنٹہ صرف کیا مگر میں آپ کے سامنے اعتراض کرتا ہوں
 کہ میں اب اس قسم کے معاملات کو طے کرنے کے قابل نہیں ہوں
 ایک طرف تو میرا مجھے رفتہ رفتہ کم زور کر رہا ہے اور دوسری
 طرف میری ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور یہ اندیشہ ہے کہ
 اگر میں بہت سے متفرق کاموں میں پڑ جاؤں تو بڑے بڑے کام رہ
 جائیں گے۔ ان میں سے خدائی خدمت گاروں کی ذمہ داری جو میں
 نے لے لی ہے، بہت اہم ہے اور اگر میں اسے بادشاہ خاں کے
 ساتھ مل کر خاطر خواہ پورا کر سکوں تو یہ سمجھوں گا کہ میرے آخری سال
 ضائع نہیں ہوئے۔

لوگ مجھ پر سننے ہیں اور اس خیال کا مضحکہ اڑاتے ہیں کہ خدائی
 خدمت گار عدم تشدد کے پکے سپاہی بن سکتے ہیں۔ لیکن مجھ پر اس
 ہنسی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ عدم تشدد کو جسم سے تعلق نہیں بلکہ روح
 سے ہے۔ جب اس کے اصلی معنی ایک یار اچھی طرح دل میں بیٹھ جائیں

تو یقینی سب باتیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔ خدائی خدمت گاروں میں بھی وہی انسانی فطرت ہے جو مجھ میں ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی حادثہ کے عدم تشدد پر عمل کر سکتا ہوں تو وہ بھی کر سکتے ہیں اور انھیں پر کیا موقوف ہے ہر شخص کر سکتا ہے۔ اس لئے میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ مل کر خداوند تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ میں نے خدائی خدمت گاروں کے متعلق جو خواب دیکھا ہے اُسے سچا کر دے۔

خدائی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ گاندھی جی نے بات چیت کے دوران میں کہا ہر جگہ میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ خاں بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے مگر میری اور آپ لوگوں کی ذمہ داری ان سے بھی زیادہ ہے۔ آپ لوگوں نے جو قدم اٹھایا ہے، وہ کوئی کھیل نہیں۔ آج تک جس ڈھنگ پر چھان لوگ چلتے آئے ہیں آپ کا ڈھنگ اس سے نرالا تو ہے ہی مگر اس سے الٹا بھی ہے۔ مارنے کی بجائے خود پٹ جانا ایک نئی چیز ہے، اور جو آپ ہمیشہ سے کرتے آئے تھے اس سے اُلٹی چیز ہے جو لوگ کئی پشتوں سے مار پیٹ ہی کرتے آئے ہیں ان کے لئے اسے بھول کر عدم تشدد پر چلنا آسان بات نہیں۔ اس لئے جب سے بادشاہ خاں نے یہ نیا کام شروع کیا ہے۔ میرے دل میں دو طرح کے خیال اُٹھتے رہے ہیں۔ ایک طرف شک تھا دوسری

طرف خوشی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ خود آکر بادشاہ خاں کے کام کو دیکھوں
مگر ایسا نہ کر سکا۔ میں نے اپنے لڑکے کو بھیجا تھا اور اس کے علاوہ
(VERRIAR ELVIN) ویریا یلون بھی یہاں آچکے ہیں۔ ان
لوگوں نے میرا شک دور کیا اور مجھے بتلایا کہ سچ سچ یہ لوگ عدم تشدد
پر چلتے ہیں۔ مگر پھر بھی تھوڑا بہت شک میرے دل میں باقی رہا
کیونکہ مجھے عدم تشدد کے راستے کی مشکلات کا بخوبی تجربہ ہے
اس لئے آج میں خود آپ لوگوں کے پاس اپنی آنکھوں سے آپ کا کام
دیکھنے کے لئے آن پہنچا ہوں۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں مجھے ایک طرف شک تھا تو دوسری
طرف میری خوشی کی بھی کوئی حد نہیں تھی۔ جو لوگ لاکھوں اور تلواریں
ایسے ایسے جوہر دکھاتے ہیں۔ اگر وہ ان کو چھوڑ کر عدم تشدد
کو پکڑ لیں تو یہ ہندوستان کی بڑی خوش قسمتی ہے۔ آج تک اس
ملک میں پٹھانوں کے بارے میں جو خیال چلا آیا ہے اس کی وجہ
سے اور ان کا جو تجربہ لوگوں کو ہوا ہے، اس سے بھی لوگوں کے
دلوں میں پٹھانوں کا ایک بڑا پیدا ہو گیا ہے۔ گجرات (کاٹھیاواڑ)
میں بچے پٹھان کا نام سن کر کانپ جاتے ہیں۔ ساہی سنی اشرم میں

۱۔ گاندھی جی کے ایک انگریز پادری دوست جو کہ ہندوستان کی
آزادی کی تحریک میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہم نڈرتا کی تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن شرم کی بات ہے کہ اسکا کرنے پر بھی ہم پورے طور سے پٹھانوں کا ڈرانے کے دل سے نہیں نکال سکے۔ میں آشرم کی لڑکیوں کو نہیں سمجھا سکا کہ اہیں کسی سو نہیں ڈرنا چاہئے وہ بظاہر نڈرتی بھی تھیں۔ مگر جب کبھی شہزادہ مسلم فساد ہوتا اور کوئی پٹھان آنکھلتا تو ادھر وہ نہیں جاتی تھیں کہ کہیں اٹھانے لے جائے۔ میں انھیں سمجھاتا کہ اگر کوئی پٹھان اٹھا بھی لے جائے تو پھر کیا ہے۔ تم اس کے گلے پڑنا کہ میں تو تیری بہن ہوں۔ تو مجھے کہے گا کیا؟ اور اگر خدا نہ کرے وہ کسی نامناسب بات پر بھی اتر آئے تو دانتوں سے زبان کاٹ کر تم اپنی جان دے دینا۔ مگر اس کے بس میں نہ آنا۔ مرنا تو ایک روز ہے ہی۔ وہ کہتی تھیں "یہ ہے تو ٹھیک۔ لیکن ہمارے لئے یہ ایک نئی بات ہو معلوم نہیں یہ ہم سے ہو سکے گا یا نہیں۔ اس لئے ڈر لگتا ہے جب ان کی یہ حالت ہے تو ایک معمولی لڑکی کتنا ڈرتی ہوگی۔ اس لئے جب میں سنتا ہوں کہ ان لوگوں میں ایک لاکھ خدای خدمت گار ایسے پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے تشدد چھوڑ دیا ہے۔ اور اب کسی کو ان سے ڈرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک بہت بڑی بات ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ باوجود اتنی زیادہ خوشی کے میرے دل میں شک کیوں تھا۔

تشدد چھوڑنے کی کیا شرط ہے اور تشدد چھوڑنے والوں
 کو کیا کرنا چاہئے۔ اس کا مجھے کچھ تجربہ ہے۔ میں نے بادشاہ خاں
 اس بائے میں کچھ باتیں کی ہیں۔ صرف اپنے آپ کو خدائی خدمت گار
 کہتے ہی سے کوئی خدائی خدمت گار نہیں بن سکتا اور نہ سرخ کپڑے
 پہننے سے۔ اگر ہمیں اس امتحان میں پاس ہونا ہے تو ہمیں ایک مرکز
 بنانا ہوگا جہاں آپ کو عدم تشدد کی تعلیم مل سکے۔ آپ میں سے
 اکثر لوگوں کو سرحد سے باہر بھی جانا ہوگا۔ کائنات بننے کا ایک مرکز
 ہمیں اتھان زئی میں قائم کرنا ہوگا۔ جہاں خدائی خدمت گاروں کے
 علاوہ دوسرے لوگ بھی اگر کام سیکھنا چاہیں تو سیکھ سکیں۔ یورپ
 میں لوگوں نے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا اپنا دھرم بنالیا ہے
 وہ کروڑوں روپے اسی کام پر خرچ کر رہے ہیں۔ ان کے اچھے سے
 اچھے سائنس دان رات دن اسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح
 وہ لوگ عیش و عشرت کے سامان پیدا کرنے میں اپنی بے اندازہ طاقت
 اور روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت ہی ایسی ہوتی ہے
 اس کے برعکس خدا پرست آدمی کی کیا علامتیں ہوں گی؟ پرستگار
 و ستکار ہی خدا کی مخلوق کی دن رات خدمت اور خیال اس کا
 شعور ہوگا۔ یہ کام کرتے کرتے آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ اس طرح
 آپ نے کتنی ترقی کی ہے اور عدم تشدد میں کس قدر طاقت ہے
 اس کا بھی آپ کو تجربہ ہوگا۔ اس طاقت کے سامنے تلوار کیا

چیز ہے کہ اس طاقت سے اکیلا آدمی ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ تلوار والا نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا مرکز یہاں بن جائے تو تمام سال تو نہیں مگر سال کا کچھ حصہ میں یہاں آکر گزاروں گا۔

آج تک عدم تشدد کا ہم نے ایک ہی مطلب سمجھا ہے۔ یعنی سرکار کے قانون توڑنا اس کے لئے وہ سختی کرے تو اس کو برداشت کرتا اور تشدد کو بھول جاتا۔ مگر میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ یہ سب چیزیں عدم تشدد کی لڑائی میں ناگزیر ہیں مگر اس کی قابلیت آپ ہی آپ پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ تیاری سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ بعد کی چیز ہے۔ شروع کی نہیں۔ لوگوں کے دلوں میں سرکار کا ڈر پیدا ہو گیا تھا، اس کو نکالنے کا یہ علاج میں نے بتایا تھا۔ ایک اچھا حکیم مریض کو کوئی تیز دوا دے تو ٹھیک وقت پر اسے بند بھی کرنا جانتا ہے۔ ورنہ اس کو مریض سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ میں نے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تیز دوائی تو دی تھی مگر وقت پر روک بھی لی۔ لوگوں نے گالیاں بھی دیں کہ میں چیز کو آخر تک نہیں لے جاتا میں ان پر ہنستا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ پٹنہ میں میں نے اعلان کیا کہ اب سول نافرمانی سوائے میرے کسی کو نہیں کرنی چاہئے جب تک فضانہ سدھرے وہ سب کے لئے بند رہے گی۔ اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ سول نافرمانی بھول جائیں۔

میری عادت ہے کہ ہر چیز میں خدا کا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں
چاہے مجھے کوئی قسمی کہے۔ بادشاہ خاں نے جو آپ کا نام رکھا ہے
اس میں بھی مجھے خدا کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ دیکھئے انھوں نے آپ کو
ستیا گری نہیں بلکہ خدائی خدمت گار کا نام دیا ہے یعنی دل رات
خدا کی خدمت کرنے والا۔ مگر خدا کا جسم تو ہے نہیں تو پھر اس کی
خدمت کیسے ہو؟ خدا کی خدمت تو اس کی مخلوق کی خدمت کرنے
ہی سے ہو سکتی ہے۔

”آدم کو مت خدا کہو آدم خدا نہیں
لیکن خدا کے نور سے آدم جدا نہیں“

اور ہمارا گاؤں ہی تو ہماری دنیا ہے نا؟ اس کی خدمت
کرنے میں دنیا کی خدمت بھی آجاتی ہے۔ بے کار کی بے کاری دو
کر کے اس کی پریشانی کو مٹانا۔ مریض کی تیمارداری کرنا۔ لوگوں
سے گندی عاداتیں چھوڑوانا، اور انھیں صفائی کی تعلیم دینا۔ خدائی
خدمت گار کا شیوہ ہوگا، اور چونکہ اس کے سب کام خدا کے لئے
ہوتے ہیں، اس لئے تنخواہ لے کر کام کرنے والوں سے اس کا
کام اچھا ہونا چاہئے۔

خدائی خدمت گار خوب بے کار رہ بیٹھے۔ اگر اس پاس کہیں
کھوری سی زمین بھی ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے اس میں کھوڑی سی
سنہری سی پیدا کر لیتا ہے تو اس سے کسی غریب مسکین کی مدد ہو جاتی

ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھڑک رہا ہے اور چونکہ خود اس کے پاس پیسہ ہے (یا اس کے ماں باپ پیسہ چھوڑ گئے ہیں) اس لئے وہ بازار سے سبزی خریدے تو وہ ایک حاجت مند کو اس کی ضرورت سے محروم رکھتا ہے جس ایک طرح خدا کی چوری ہے۔ وہ سچا خدائی خدمت گار نہیں۔ خدائی خدمت گار اگر کوئی چیز بھی لیتا ہے تو پہلے سوچتا ہے کہ کیا اس پر میل حق ہے؟ اور اگر ہے تو کیا کسی اور کا حق مجھ سے زیادہ تو نہیں؟ اگر اس کے پاس ایک پلاؤ کا بھرا ہوا تھاں ہے اور ایک کئی وقت کا بھوکا آ جاتا ہے، تو وہ سوچے گا، کہ اگر اس پر اس کا مجھ سے زیادہ حق ہے تو میں چاہے آپ بھوکا رہ جاؤں مگر اس کا پیٹ بھردوں۔ ہاں اگر پلاؤ زیادہ ہے تو اسے کھلا کر خود پیچھے کھاؤں گا۔

اسی طرح خدائی خدمت گار اپنے وقت کا منٹ بھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اپنے ایک ایک منٹ کا وہ پورا پورا اور مناسب استعمال کرے گا۔ ہر گھڑی کچھ نہ کچھ پیدا کرتا ہی ہے گا۔ وقت ضائع کرنا یا اس کا فضول استعمال کرنا بھی خدا کی چوری ہے۔ کوہاٹ کے مغرب میں سڑک کے رستے چھبیس میل کے فاصلے پر ہنگو کا قصبہ ہے، جو تحصیل منہلی کا صدر مقام ہے۔ دو برسے دن گاندھی جی وہاں گئے موسم نہایت شان دار تھا اور دور دراز پہاڑوں کا سلسلہ شفاف ہوا میں بہت صاف نظر آ رہا تھا

اس پاس کی پہاڑیاں جو زیادہ تر سرخ کنکر کی تھیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی بکریوں اور دھول کے بے شمار گلے چرتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور ان کی معصومیت سے بھری ہوئی "میں میں" سے ہوا گونج رہی تھی۔ منہگو میں ایک عام جلسہ ہوا اور ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس ایڈریس میں ایک جملہ یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے پاس ہندوستان کی آزادی کی گنجی ہے۔ گاندھی جی نے اپنی تقریر میں اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ گنجی اس صوبے کے خدائی خدمت گاروں کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گلاب کی دلفریب خوشبو اس پاس کی ہوا کو معطر کر دیتی ہے۔ اسی طرح جب ایک لاکھ خدائی خدمت گار سچے معنی میں عدم تشدد کے پابند ہوں جائیں گے تو ان کی خوشبو سارے ملک میں پھیل جائے گی اور غلامی کی لعنت کو جس میں ہم گرفتار ہیں، دور کر دے گی۔

کوہاٹ کی طرح منہگو میں بھی گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے اہم بات چیت کی انھوں نے کہا:-

"آپ لوگوں نے جس حلف نامے پر دستخط کر کے مجھے دئے

ہیں وہ میں نے پڑھ لیا ہے اگر اسے سمجھ کر اس کے مطابق آپ چل

سکیں تو میں سمجھ لوں گا کہ آپ نے پڑا بھاری کام کیا۔ آج جب

نصرت خیل میں میں نے خدائی خدمت گاروں کے دفتر کی بنیاد ڈالی تھی۔

تو وہاں مجھے ایک پاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ اس میں سول نافرمانی

کی گزشتہ جنگ کا کچھ ذکر تھا۔ تو آپ سمجھیں کہ جنگ تو ہماری آج بھی جاری ہے۔ اور جب تک آزادی نہیں ملتی جاری رہے گی۔ صرف اس کی صورت بدل گئی ہے۔ دوسری بات اس ایڈریس میں یہ تھی کہ ہم نہ تو اس جنگ میں سختیوں سے ڈرتے تھے اور نہ اب ڈریں گے گورنمنٹ نے کافی تشدد سے کام لیا۔ ہم عدم تشدد پر قائم رہے۔ اور اب بھی ہم اس پر کاربند رہیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ تنازعے فی عدلیہ ہندوستانی عدم تشدد کا مطلب اتنا ہی سمجھے ہیں کہ ہم لاٹھی تلوار چھوڑ کر بندوق کا سینہ سپر ہو کر سامنا کریں گے۔ یہ بہت اچھی چیز ہے۔ اس میں بہادری ہے۔ اگر آپ سب اور خاص کر افسر لوگ سمجھ لیں کہ عدم تشدد صرف اسی کا نام نہیں۔ مجھے اس سے بہت زیادہ چیز چاہئے۔ اگر صحیح صحیح عدم تشدد کو سمجھ گئے ہیں تو آپ کو جاننا چاہئے کہ عدم تشدد ایسی چیز نہیں کہ کسی خاص موقع پر صرف کسی ایک جماعت کے لئے کام میں لائی جائے۔ وہ تو ہمیں گھنٹے ہمارے دل میں رہنی چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے دل کا ایک جزو بن جائے۔ غصہ ہمارے دل سے بالکل مٹ جانا چاہئے۔ آخر تشدد غصہ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غصے میں کوئی گولی چلاتا ہے تو کوئی گالی دیتا ہے اور کوئی لاٹھی چلاتا ہے سوا کہ غصہ دل میں سے بالکل مٹا دیا جائے، تبھی ہم دعوے کر سکتے ہیں کہ ہم عدم تشدد کو پورا

سمجھتے ہیں۔ اس کے پابند ہیں اور ہمیشہ پابند رہیں گے۔ جب ہم نے
 سول نافرمانی کی تھی، وہ تو ایک لڑائی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ زندگی
 بھر چلنے والی چیز نہیں تھی۔ مگر آج جو لڑائی ہم لڑ رہے ہیں اصلی لڑائی
 نہیں ہے۔ ہمیشہ سول نافرمانی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر آج ہمیں ہمیشہ
 کے لئے جیل میں بند کر دیا جائے تو کیا ہماری لڑائی بند ہو گئی؟
 وہاں جا کر تو ہمیں بکری کی طرح مسخوم بن کر رہنا چاہئے، وہاں
 کے قانون توڑ کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ بے شک جیل
 میں بھی سول نافرمانی کی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے خاص شرائط
 اور قواعد ہیں۔ ان کا ذکر میں ابھی نہیں کرتا۔ صرف اتنا کہوں گا
 کہ جیل میں جلنے کے بعد بھی ہماری لڑائی بند نہیں ہو جاتی۔ جب
 میں جیل تھا تب بھی میری لڑائی جاری تھی۔ عدم تشدد ایک ایسی چیز
 ہے کہ جو ہمیں گھنٹے کام کرتی ہے، گولی ایسا نہیں کر سکتی۔ گولی دشمن
 کو مار کر صفحہ ہستی سے اس کا نشان مٹا دیتی ہے۔ عدم تشدد
 دشمن کو دوست بنا کر اس کی طاقت کو بھی اپنا کر لیتا ہے۔ سول نافرمانی
 کر کے ہم نے دنیا کو بتلا دیا کہ ہم کسی کے ماتحت ہو کر نہیں رہنا چاہتے
 مگر ابھی ہمیں ایک اور قسم کی ہمت کا ثبوت دینا ہے۔ خلافت
 کے دنوں میں علی بھائیوں کے پاس بڑے بڑے چوڑے پٹھان آئے
 تھے اور میرے پاس بھی۔ مگر وہ ڈرتے تھے کہ افسروں کو پتہ لگ
 گیا تو کہیں نکال نہ دیں اور ان سے وہ مجھ سے بھی زیادہ ڈرتے تھے

جسمانی طور پر وہ اتنے بہادر اور مضبوط تھے۔ مگر جب ان کے مقابلے میں کوئی ان سے طاقت ور آدمی آیا تو وہ ان کے غلام بن کر بیٹھ گئے۔ مجھے تو ایسی طاقت چاہئے کہ میں سمائے خدا کے جو میرا سردار ہے اور کسی کا غلام نہ بنوں۔ اگر میں یہ کر سکوں تبھی سمجھوں گا کہ عدم تشدد کو میں نے پایا ہے۔

جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں عدم تشدد کا حربہ ہمیشہ کام کرتا ہے۔ ہم جیل میں گئے تو وہاں حکومت کے جو غلام بھرے ہیں یعنی وہاں کے عہدے دار، ان کے دلوں کو بدل لیں گے۔ انھیں بتا دیں گے کہ ہم چور ڈاکو نہیں۔ ہم دشمن کو مارنا نہیں چاہتے۔ انھیں دوست بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ان کے سب اُٹے سیدھے حکموں کو مان کر نہیں۔ یہ دوست بنانے کا طریقہ نہیں۔ دوست بنانے کا راستہ یہ ہے کہ ہم ان کو بتا دیں کہ ان کے لئے ہمارے دل میں دشمنی نہیں برائی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خدا ان کا بھلا کرے۔ میں کئی جیلوں میں جا چکا ہوں۔ وہاں میں نے سب کو اپنا دوست بنا لیا۔ آج ہم قانونی طریقے سے لڑ رہے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب اور ہم پورے طور پر عدم تشدد کے ماننے والے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسا موقع ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ اگر خود جیل والے یہ بات سمجھ لیں گے تو سرکار کو بھی بتا سکیں گے۔ کہ ہم ان کے دشمن نہیں دوست ہیں۔ اگر ہمارے سب وزیرِ حق اور عدم تشدد کو سمجھنے والے

ہوں تو ہندوستان کی آج شکل بدل دیں۔ مگر افسوس کہ سب وزیر سچے عدم تشدد کو نہیں سمجھتے، اور سمجھتے بھی ہیں تو اس پر پورے طور پر کاربند نہیں ہو سکتے۔

عدم تشدد کی ایک دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کی تعلیم لینے کے لئے نہ کسی مدرسے میں جانا پڑتا ہے، اور نہ کسی پیر یا گرو کے پاس! یہ ایک سیدھی سادی بات ہے۔ اگر آپ اس کا پہلا سبق سمجھ گئے ہیں یعنی یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ ایک روحانی طاقت ہے جو چوبیس گھنٹے کام کرتی رہتی ہے تو وہ ہمارے گھر میں بھی کام کرے گی، محلے میں بھی دشمن کے ساتھ۔ دوست کے ساتھ اسے سب جگہ کام کرنا ہی ہے۔ تعلیم تو آج آپ اپنے گھر ہی سے شروع کر سکتے ہیں۔ اتنی تعلیم میں نے پالی ہے کہ مجھے دشمن پر کبھی غصہ نہیں آتا۔ مگر دوستوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں تو کبھی کبھی غصہ آ جاتا ہے۔ مجھے جو طاقت اور تعلیم عدم تشدد کی ملی وہ میرے گھر سے ہی ملی۔ اپنی بیوی سے ملی، میں ظالم تھا۔ گویہ میرا ظلم محبت کا ظلم تھا۔ میں اس بے چاری پر کافی غصہ کر لیتا تھا۔ مگر وہ سب برداشت کر لیتی تھی مجھے یہ خیال ہو گیا تھا کہ میری بات ماننا اس کا فرض ہے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ کین سا قاعدہ ہے اگر مجھے بات منوانی ہے تو دھیرج سے سمجھانا چاہئے۔ اس طرح میں نے اس سے عدم تشدد سیکھا۔ اور کسی نے میرا تنا ساتھ نہیں دیا، جتنا اس عورت نے۔ شاید ہی کسی بیوی نے خاوند کا اتنا ساتھ دیا

ہو گا۔ میں نے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ آج ایک گھر والا کل دوسرا
 آج ایک کپڑا پہننے کا حکم صادر کیا۔ کل دوسرے کا۔ وہ اس گھر
 میں پٹی بڑھی تھی۔ جہاں چھوت چھات کے رسم و رواج ملنے جاتے
 تھے۔ میرے گھر میں مسلمان سے لے کر بھنگی تک سب آتے تھے۔ میں
 نے ان سب کی خدمت اس سے کوئی بات اسے پسند نہ
 تھی۔ مگر اس نے کبھی چوں تک نہ کی۔ وہ کچھ بہت پڑھی لکھی تو ہر
 نہیں۔ بھولی بھالی سیدھی سادی ہے، مگر اس کے اس بھولے
 اور سیدھے پن نے مجھے مطیع کر لیا۔ آپ کے گھر میں بھی ماں بہن
 ہیں۔ بیوی ہے۔ لڑکیاں ہیں۔ ان سے آپ ہمیشہ عدم تشدد
 کی تعلیم لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو سچائی پر قائم رہنے کا حلف
 بھی اٹھانا ہے۔ آپ اپنے دل سے پوچھئے کہ آپ کو سچائی سے کتنی محبت
 ہے۔ اور کیا آپ اس کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں؟ جو سچا نہیں وہ
 عدم تشدد کو کیا سمجھے گا۔ جھوٹ تو خود تشدد ہے۔

ابھی رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ رمضان کا
 مطلب ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض روزہ رکھنا اور کھانا پیتا چھوڑ
 دینا ہی کافی ہے۔ اور بات بات پر غصہ کرتے اور گالی دیتے
 ہیں۔ روزہ کھولنے کے وقت بے چاری بیوی سے تیاری میں
 ایک منٹ کی دیر ہو جائے، تو اس کی شامت بلانے میں کوئی
 ہرج نہیں۔ لیکن یہ رمضان کا احترام نہ ہوا۔ اگر آپ عدم تشدد

کی تعلیم سچ سچ لینا چاہتے ہیں۔ تو اس رمضان کے موقع پر عہد کر لیں کہ کچھ بھی ہو کبھی کسی پر غصہ نہ کریں گے۔ گھر والوں پر حکم نہ چلائیں گے۔ اپنی بادشاہت نہ جتائیں گے۔ اور اس طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں میں آپ خود عدم تشدد کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کو سکھاسکتے ہیں۔ فرض کیجئے کھیل میں آپ کے بچے کو کوئی پتھر مارے۔ عام طور پر تو بچان اپنے بچوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ مار کھا کر گھر نہ آنا۔ کوئی پتھر مارے تو جواب میں اسے اور بڑا پتھر مارنا۔ لیکن اگر آپ کو اور آپ کے بچے کو در سراسر طریقہ یعنی عدم تشدد کا طریقہ سیکھنا ہے۔ تو یہ نہیں ہوگا آپ اسے سمجھائیں گے کہ تمہیں پتھر کا جواب اس سے بڑا پتھر پھینک کر نہیں دیتا ہے بلکہ تم جا کر اسے گلے سے لگا لو۔ اپنا دوست بنا لو۔ عدم تشدد کے ذریعے ہندوستان کو آزاد کرانے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم غصے کو بالکل دل سے نکال دیں اور سب کو دوست بنالیں یہ آنا دی حاصل کرنے کا سیدھا سادہ اور آسان ترین راستہ ہے۔ اور میرا یہ دعوئے ہے کہ ہندوستان کی غریب رعایا کے لئے آزادی حاصل کرنے کا اس کے سوا اور سراسر کوئی راستہ نہیں۔

دسواں باب

بنوں

اسی میل کا سفر سوٹر سے طے کرنے کے بعد گاندھی جی بنوں پہنچے۔
 وہاں گاندھی جی کو شہریوں کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔
 عام جلسے میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔
 شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ قریب دو ماہ سو میں پورے چوبیس گھنٹے
 خاموش رہتا ہوں، خاموشی سے مجھے بہت فائدہ ہی ہوا ہے۔
 میرا خیال ہے کہ اس سے ملک کو بھی فائدہ ہی ہوا ہے۔ جب پہلے میں
 نے خاموشی اختیار کی تو اس کی وجہ میری ایک خاص پریشانی تھی۔
 بعد میں میں نے دیکھا کہ خاموش رہ کر میں زیادہ کام کر سکتا ہوں۔ میں
 ارادہ کر کے آیا تھا کہ اس صوبے میں صرف خدائی خدمت گاروں کے
 ساتھ بات چیت کرنے کے لئے ہی خاموشی چھوڑ دوں گا مگر بادشاہ خان
 نے مجھے مجبور کیا، اور مجھے اپنا ارادہ چھوڑنا پڑا۔
 آپ نے اپنے ایڈریس میں میری تعریف کی ہے۔ میں اپنے

کو اس تعریف کے لائق نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں آپ کی امیدوں کو بہت کم ہی پورا کر سکوں گا۔ میں نے تو اس دورے کو آخر تک ٹالنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک جگہ بیٹھ کر جتنی ممکن ہو اتنی خدمت کرنا چاہیے لگتا ہے۔ مگر میری یہ خواہش کہ خود خدائی خدمت گاروں سے مل کر میں دیکھوں کہ انھوں نے عدم تشدد کو کہاں تک سمجھا ہے مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ میری بنوں میں آمد تو اتفاقاً ہی سمجھنی چاہئے۔ آپ نے اپنے ایڈریس میں مجھے مقور اسایاں کا حال سنایا ہے۔ میں نے آج کئی گھنٹے مختلف زندگیاں کے ساتھ بات چیت میں اور جو مسوومے اور کاغذات میرے پاس پہنچے ہیں انھیں پڑھنے میں صرف کئے ہیں۔ میں آپ کی حالت سمجھ گیا ہوں، اور مجھے اس سے بہت قلق ہوا۔ سرحدی صوبہ دوسرے صوبوں سے کچھ مختلف ہے۔ اس کے قریب بہت سے چھوٹے چھوٹے قبیلے رہتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ ہیں جن کا پیشہ ہی ڈاکہ ڈالنا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں پر اکثر زیادتی ہو جاتی ہے۔ مگر فرقہ پرستی کی وجہ سے نہیں۔ ڈاکوؤں کا اصلی مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس طرح اپنی روزی گمانیں۔ مگر اوروں کی نسبت اکثر ہندو ہی ان کا شکار ہوتے ہیں، کیونکہ وہ زیادہ مال و اموال میں غور توں کھٹاٹے جانے کا سبب بھی زیادہ تر رہنے والے کا لالچ ہوتا ہے۔

میری رائے میں ان ڈاکوؤں کی روک تھام نہ ہو سکتا اس بات کا نمایاں ثبوت ہے کہ ہندوستان کے اس حصے میں انگریزی حکومت ناکامیاب رہی ہے۔ میرے دل سے سرکار کی شکایت نکلتی ہے کہ اس نے کروڑوں روپے سرحدی پاسی پر خرچ کر ڈالے ہیں اور ہزاروں جانیں قربان کر ڈالیں۔ سرکار نے سمجھا تھا کہ اس طرح طاقت کے استعمال سے سرحد پار کی دلاور قزاقیں ہمارے تابع ہو جائیں گی۔ مگر انھیں معلوم ہوا کہ تلوار کے دھنی اس طرح قابو میں نہیں آتے۔ اگر جتنی اطلاعات میرے پاس پہنچتی ہیں وہ صحیح ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ضرور میں، تو ماننا پڑے گا کہ اس صوبے کے اکثر حصوں میں آج لوگوں کا جان و مال محفوظ نہیں ہے۔ آج کئی آدمی جن کے عزیز یا رشتے دار یا تو جان سے مارے گئے ہیں یا ان کو ڈاکو "رقم رہائی" حاصل کرنے کی لالچ سے اٹھا کر لے گئے ہیں وہ مجھ سے بے ہیں۔ میں نے ان کی ساری دکھ بھر سی کہانی سنی۔ اس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا ہے۔ مگر جو بھائی میرے پاس آئے تھے، مجھے ان سے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا کہ میرے پاس کوئی ایسا جادو نہیں ہے کہ ڈاکو جن لوگوں کو اٹھا لے گئے ہیں میں ان کو واپس دلا دوں اور نہ سرکار یا کانگریسی وزارت سے اس میں کچھ زیادہ مدد کی امید کی جاسکتی ہے۔ مجھے تو سرکار ان لوگوں کے پاس سرحد پار جانے بھی نہ دے گی۔ ورنہ میرا جی تو چاہتا ہے کہ ان کے پاس بھا کر

قوام کروں اور جیسے میں ہمیشہ کرتا آیا ہوں۔ انہیں سمجھانے کی
 اور ان کا دل گھلانے کی کوشش کروں۔ مگر میرے لئے یہ راستہ
 بند ہے اور سرکار اس کی قائل ہی نہیں۔ آپ یہ مت سمجھئے کہ کوئی
 حکومت بھی اپنی رعایا کے ایک ایک شخص کی حفاظت فوج کے
 ذریعے کر سکتی ہے۔ ایسی کوئی ریاست آج تک دنیا میں
 پیدا نہیں ہوئی۔ اور اگر نیرسہ کار سے تو یہ اُمید رکھنا ہی
 فضول ہے۔ وہ اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں۔ ہاں کسی انگریز
 مرد عورت کی جان بچا رہے یا خطرے میں پڑ جائے تو وہ سر ہی بات
 ہے۔ تب وہ یقیناً اپنے دعوے کے مطابق ساری سلطنت کی
 قوت کے ساتھ چل پڑے گی۔ سب حالات جانتے کے بعد میں اس
 نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کانگریس وزارت کے آنے کے بعد اس صوبے میں
 قبائلی ڈاکوئوں کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ ہمارے
 وزیروں کو پولیس پر کامل اختیار نہیں کہ اس کی پوری پوری مدد
 انہیں مل سکے۔ اور محکمہ فوج پر تو بالکل ہی کوئی اختیار نہیں
 جتنا دوسرے صوبوں میں ہے اتنا بھی نہیں۔ اس لئے میرا خیال
 ہے کہ اگر ڈاکٹر خاں صاحب ان ڈکیتوں کی روک تھام نہیں کر سکتے
 تو ان کا وزارت سے استعفیٰ دے دینا بہتر ہو گا۔ کیونکہ اگر
 ڈکیتیاں اس طرح سے جاری رہیں اور زور پکڑتی گئیں تو کانگریس
 کا سارا وقار ختم ہو جائے گا۔ مگر سوال صرف میری رائے کا

نہیں۔ یہ تو آپ کے طے کرنے کی بات ہے۔ آپ جب چاہیں ان وزارت کو چھڑوا سکتے ہیں۔ آٹھ ڈاکٹر خاں صاحب آپ کے خد مخا ہیں۔ ورکنگ کمیٹی۔ صوبہ کانگریس کمیٹی اور جن وزٹروں کی ہدایت سے انھوں نے وزارت بنائی وہ ان کے ماتحت ہیں۔ بہر حال یہ فیصلہ آپ لوگوں کو کرنا ہے کہ میں نے جن وقتوں کا ذکر کیا ہے ان کے باوجود بھی کانگریس کی وزارت رہے یا کوئی دوسری وزارت اس کی جگہ پر آجائے۔

آج مجھے جو لوگ ملے، ان میں سے کئی نے پوچھا کہ ہم جان و مال کی سلامتی کی خاطر صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے کہیں اور جا سکتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ اگر وہ کسی طرح سے بھی یہاں امن سے نہ رہ سکیں۔ یا اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت نہ کر سکیں تو کسی دوسری جگہ چلے جانا ہی مناسب ہے اور اس کا انھیں پورا پورا حق ہے۔ میرے پاس ایک یہ شکایت بھی پہنچی ہے کہ جب سے صوبہ سرحد سے انسداد جراثیم ایکٹ منسوخ ہوا ہے جن مقامات پر ڈاکے پڑتے ہیں وہاں کی مسلمان آبادی نے ڈاکوؤں کے روک تھام میں پہلے کی طرح مدد دینی چھوڑ دی ہے۔ ممکن ہے یہ سچ ہو۔ مگر میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنی حفاظت کا دار و مدار کسی دوسروں کی مسلح طاقت پر رکھیں گے تو ایک دن آپ کو اسی مسلح طاقت کا محکوم ہو کر رہنا ہوگا۔ آپ خود اپنی

حفاظت کرنا سیکھیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو آپس میں تعاون کرنے کی مشق ہونی چاہئے۔ بہر حال آپ کسی صورت میں بھی بزنس نہ بنیں۔ اپنی حفاظت ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ایک شخص بھی نامرد نظر آئے۔

چوتھا اور آخری راستہ عدم تشدد کا ہے جو میں آج آپ کے سامنے پیش کرنے کو حاضر ہوا ہوں۔ میرا یہ دعوئے ہے کہ اپنی حفاظت کی اس سے بڑھ کر یقینی اور جنگی تدبیر اور کوئی نہیں۔ اگر میل بس چلے تو میں آج ہی سرحد پار کے قبیلے والوں کے پاس چلا جاؤں ان کو محبت کے ساتھ سمجھاؤں بچھاؤں۔ ان کی تکلیفوں کو سمجھوں ان کی عادتیں بدلنے کے لئے جو تعلیم یا مدد چاہئے وہ دوں۔ منجھے ہیں ہے کہ ہمارے اس طرح سمجھانے بچھانے کا اور ہماری محبت کا اثر ان کے دل و دماغ پر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

ڈاکوؤں کو روپیہ ادا کر کے جان چھڑانا سوت غلطی ہے۔ یہ تو ان کو بار بار ڈاکے ڈالنے کا راستہ دکھانا ہے۔ یہ تو ہمارے اور ان ڈاکوؤں دونوں کے لئے زلت کا باعث ہے۔ زیادہ عقل مندی کا راستہ یہ ہوگا کہ ہم انھیں رشوت دینے کے بجائے ان کو دستکاری اور صنعت سکھا کر ان کا افلاس دور کریں اور ایمان داری سے روزی کمانے کا راستہ ان کے لئے کھول دیں۔ تاکہ وہ ڈاکہ زنی پر مجبور نہ ہوں۔

میری آج کل خدائی خدمت گاروں کے ساتھ بات چیت ہو رہی ہے۔ بادشاہ خاں کے ساتھ مل کر میں ایک تجویز تیار کر رہا ہوں۔ اگر میری کوشش کامیاب ہوئی اور خدائی خدمت گار جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے سچ مح خدمت کرنے والے بن گئے تو ان کے طرز عمل کا اثر پھولوں کی مہک کی طرح دور دور پھیل جائے گا۔ اور خود بخود سرحد کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے گا۔

بنوں سے روانہ ہونے سے پہلے گاندھی جی اس جگہ کو دیکھنے کے لئے گئے جہاں ابھی حال میں چھاپہ مارا گیا تھا۔ اس تھوڑی سی دیر میں کئی باتیں ان کے علم میں لائی گئیں جو قابل ذکر ہیں، لیکن چونکہ درکنگ کمیٹی کی ہدایت کے مطابق آصف علی صاحب ان واقعات کی تحقیقات کر رہے ہیں اس لئے میں انہیں چھوڑتا ہوں۔ البتہ میں نے غور جو کچھ دیکھا اور سنا وہ لکھے دیتا ہوں۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اگر مقامی افسر چاہتے تو یہ چھاپہ روکا جاسکتا تھا۔ انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ چھاپہ مارا جائے گا۔ چھاپہ مارنے والے قریب قریب سارے وقت نظروں کے سامنے رہے۔ پھر یہ واقعہ کیوں ہونے دیا گیا؟ یہ ایک معمہ ہے جسے اگر سرکاری کمیٹی نہیں تو آصف علی صاحب ضرور حل کریں گے۔

پڑھنے والوں کو اس کا اندازہ ہوتا چاہئے کہ جس جگہ چھاپہ مارا گیا اس کا محل وقوع کیا ہے۔ یہ زرخیز اور خوش منظر میدان جسے

غم اور کبھیلا دیا سیراب کرتے ہیں، ایک گوناگوں اور دردناک تاریخ
 رکھتا ہے۔ اس کے شمال میں ضلع کوہاٹ کے بے آب و گیاہ
 پہاڑوں کا سلسلہ جو سالٹ رینج (SALT RANG) کہلاتا ہے
 واقع ہے اور جنوب میں ڈیرہ اسماعیل خاں کا ریتلا میدان ہے اور
 مغرب اور شمال مغرب میں وزیرستان کی بھیانک پہاڑیاں ہیں
 جہاں زندگی نام ہے ایک دائمی کش مکش کا نہ صرف انسان اور
 فطرت میں، بلکہ انسان اور انسان میں بھی، ایسے ماحول میں قدرتی
 طور پر یہ اپنے تندخو سرحدی علاقوں کے حلوں کی جولاں گاہ بن گیا
 اس کی ابتدائی تاریخ جس کا اندازہ آپ کو ذیل کی عبارت سے ہوگا
 جوٹھا۔ ربرن کی کتاب سے لی گئی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا
 لگتا ہے کہ یہ انسان انسان کے بیچ نہیں بلکہ چیلوں اور دوسرے
 شکاری جانوروں کے بیچ لڑائی کی خوفناک کیفیت آنکھ کے سامنے
 گذر رہی ہے۔ اس بات سے شاہ فرید (جو شیتک بھی کہلاتے تھے)
 کی اولاد کو بڑی خوشی ہوئی، اس لئے کہ ان لوگوں کو وزیرسی قبیلے
 کے لوگوں نے بہت دق کر رکھا تھا۔ یہ لوگ کمر کس کرتیار ہو گئے
 ان کے ساتھ ان کے بیوی بچے بھی پہاڑ سے اُتر آئے اور وہ ٹوچی
 کے دہانے پر خیمہ زن ہوئے۔ اس کے بعد ان کے سردار جمع ہوئے
 اور انھوں نے کہا "ہم لوگ منگلوں اور مانیوں کے پاس عین کبوتر
 بھیجتے ہیں جس سے ان کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے ہاتھوں

ان کا کیا حشر ہونے والا ہے " اس کے بعد انھوں نے تین کبوتر لئے۔ پہلے کو صحیح سلامت رہنے دیا۔ دوسرے کے چکر اُکھاٹ لئے اور تیسرے کا ایک ایک پر نوچا، اور سر اوپر کاٹ لئے۔ انھوں نے یہ کبوتر ایک قاصد کے ساتھ منگنوں اور ہانیوں کے سرداروں کے پاس اس پیام کے ساتھ بھیجے کہ اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہے اس لئے کہ تم نے پیر صاحب کے ساتھ بے ادبی کی اور اس نے تم کو ہمارے سپرد کر دیا۔ اگر تم بھاگ گئے تو پہلے کبوتر کی طرح صحیح سلامت رہو گے اگر وہاں پھرے رہے تو دوسرے کبوتر کا سا حال ہوگا اور اگر تم نے ہمارا مقابلہ کیا تو وہ حشر ہوگا جو تیسرے کبوتر کا ہوا۔ اس سے منگل اور ہانی ڈر گئے، اور واقعی ان کے ساتھ وہی ہوا جو کبوتروں کے ساتھ ہوا تھا۔

عہدِ وسطے میں یہ جگہ ان بدیشی فوجوں کی آرام گاہ کا کام دیتی تھی جو غزنی سے ہندوستان کی طرف جاتے ہوئے یہاں سے گزرتی تھیں۔ اور حملہ آور فوجوں کے ساتھ جو علیق یعنی رنڈی بھڑتے ہتھک گوتے وغیرہ رہا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کو اپنا مرکز بنا لیا۔ ان لوگوں کی روایات ابھی تک چلی جاتی ہیں۔ تاریخ کے اس پس منظر کا سرحدی علاقے کے چھاپوں اور اغوار کی دارالتوں کے متعلق بحث کرتے ہوئے ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

تشداد اور عدم تشدد کی طاقت کا مقابلہ۔ پہلی دشمن کو ختم کر دیتی

ہے اور دوسری اس کو دوست بناتی ہے، اس لئے وہ بڑی ہے۔
 تعمیری پروگرام اس کا ظاہری یا سماجی روپ ہے جیسے کہ چرخہ چھت
 چھات کو مٹانے۔ شراب اور دوسری قومی اثرات پیدا کرنے کی تحریک
 یہ سب چیزیں عارضی، سیاسی مصلحت کے طور پر نہیں ہونی چاہئیں
 بلکہ عدم تشدد کے سانچے میں ڈھل جانی چاہئیں۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو بنوں میں خدائی خدمت گار افسروں کے
 ساتھ گانڈھی جی کی اہم بات چیت ہوئی، گانڈھی جی نے کہا:
 میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر عدم تشدد پر قائم رہنا
 چاہتے ہیں تو اس میں کون سی چیزیں ہیں جنہیں سمجھنا آپ کے لئے
 ضروری ہے۔ عدم تشدد کی تحریک جب یہاں شروع ہوئی تھی، تو
 لاکھوں لوگوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ سرکار کا مقابلہ ہم تلوار سے
 نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ سرکار کی طاقت ہماری تلوار کی طاقت سے بہت
 بڑی ہے۔ ہم جب تلوار سے کر سکتے ہیں تب بھی مرنے کی تیاری
 کر کے ہی جاتے ہیں۔ تلوار ہاتھ میں ٹوٹ جائے گی تو موت تو
 سامنے کھڑی ہی ہے۔ پھر ہم بغیر تلوار کے مرنے کا علم سیکھ کر باہر
 کیوں نہ نکلیں۔ سرکار ہمیں مارنا چاہتی ہے۔ مارے، قید کرنا چاہتی
 ہے تو قید کرے۔ ہماری جاننا ضبط کرنا ہے تو کرے۔ مگر اکثر لوگوں کے
 دل میں یہ خیال ہے کہ اگر ان کے پاس تلوار کی کافی طاقت ہو تو وہ
 تلوار سے بھی لڑیں گے۔ آج عدم تشدد سے کام لیتے ہیں کیونکہ

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دل میں تو تشدد
 موجود ہے۔ بظاہر اسے ترک کر دیا ہے۔ اس سے ہماری قوت
 بڑھی تو سہی مگر ہمارا عدم تشدد بہادر آدمی کا نہ تھا کمزور کا تھا۔
 جو لوگ عدم تشدد کو اس طرح سے اختیار کرتے ہیں۔ اور عدم تشدد
 کو کمزور کی طاقت سمجھتے ہیں۔ انہوں نے بڑی بھاری غلطی کی ہے۔
 اگر آپ ایک لاکھ خدائی خدمت گار بھی یہی غلطی کریں تو یہ بڑی
 بُری بات ہوگی۔ اگر آپ نے بادشاہ خاں کے کہنے پر بظاہر
 تلوار کو چھوڑ دیا۔ مگر دل میں تشدد بھرا رہا تو آپ کا عدم تشدد
 زیادہ دیر تک قائم رہنے والا نہیں۔ دو چار سال بعد آپ پھر
 تلوار پکڑنا چاہیں گے۔ اور اس وقت عادت چھٹ جائے
 گی وجہ سے آپ کو وقت سپش اُسے گی، اور آپ نہ ادھر کے
 رہیں گے، نہ اُدھر کے۔ خواہ مخواہ بعد میں پھپھتائیں گے اور یہ
 بادشاہ خاں کے میرے اور آپ کے لئے باعثِ شرم ہوگا۔
 آپ لوگ کمزور اور بزدل بن جائیں گے۔ یہ ہم نہیں چاہتے۔ میں جو
 چیز چاہتا ہوں وہ تو سب اُنو کھی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم لوگ اگر تلوار
 چلا بھی سکتے ہوں اور ہماری فتح ہونے میں کوئی شک نہ ہو تو بھی
 ہم دشمن پر تلوار نہ چلائیں گے۔ اور مخالف کے پاس ایک ٹوٹی
 سی تلوار ہو، تب بھی اُسے ہم اپنے گلے پر چلانے دیں۔ دل میں
 غصہ تک نہ لائیں۔ اور یہی نہیں بلکہ محبت سے اس کو اپنے دل میں

جگہ بھی دیں۔ اگر آپ واقعی عدم تشدد کو اسی طرح سمجھ گئے ہیں تو آپ کے لئے یہ سوال آسان ہو جاتا ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ جو شخص سمجھ گیا ہے کہ عدم تشدد کی روحانی طاقت تلوار سے بڑھ کر ہے جو شخص جسمانی طاقت ہے۔ تو وہ کسی پر تلوار چلانا ہی نہیں چاہے گا۔ نہ غصہ کرے گا۔ جو بس گھنٹے خدمت ہی میں بگڑ رہے گا اور اس کا یہی فرض ہے۔ خدا کی خدمت صرف اس کی مخلوق کی خدمت سے ہی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خود خدا کو نہ تو حاجت ہے اور نہ کسی شخص کی خدمت کی ضرورت ہے۔ آپ بنوں میں رہتے ہیں تو آپ کو چاہیے کہ بنوں کے لوگوں کی خدمت کریں۔ وہ گندے رہتے ہیں تو ان کو صفائی سکھائیں۔ صفائی کرنے میں انھیں مدد دیں۔ وہ بیمار ہیں تو ان کی دوا دارو کریں۔ ان کی بیمار داری کریں۔ اگر وہ بے گاہ ہیں تو ان کی بے کاری مٹائیں۔ اس طرح جتنی ہم خدمت اور محبت کریں گے، اتنی ہی ہماری طاقت بھی بڑھے گی۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ سب کام کرنے سے انگریزی حکومت پر کیا اثر پڑے گا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ہر خدمت کر کے ہندوستان کے سب لوگوں کو محبت کے رشتے میں باندھ کر ملک میں ایک نئی فضا پیدا کر سکتے ہیں اور انگریزوں کو بھی اس محبت کی تلوار سے گھائل کر سکتے ہیں۔ آپ کہیں گے انگریزوں پر محبت کی جنگ کا اثر نہیں ہوگا۔ میرا تیس سال کا تجربہ اس کے برعکس ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایسی ہی محبت کی جنگ ہوئی تھی اور وہی انگریز جو شروع میں ہمارے سخت دشمن تھے، آخر میں ہمارے دوست بن گئے یہاں ستر ہزار انگریز ہم تیس کروڑ لوگوں پر حکمراں ہیں۔ کیونکہ ہمارے دل پر ان کا رعب بیٹھ گیا ہے۔ اگر ہم تیس کروڑ لوگ آپس میں اسی طرح محبت سے رہنے لگیں کہ ہندو اور مسلمان چھوٹ اور چھوٹ، لکھ پٹی اور بھکاری کے درمیان تفرقہ مٹ جائے تو مٹھی بھرا انگریزی فوج کی مجال نہیں کہ ہم پر حکمراں رہ سکے۔

جس طرح تشدد کے جنگ میں کچھ قانون و قواعد ہوتے ہیں۔ اسی طرح عدم تشدد کے جنگ میں بھی ہوتے ہیں۔ دنیا آج صرف تشدد کی جنگ کے آداب سے واقف ہے۔ تشدد برائی کرنے والے کو سزا دیتا ہے۔ عدم تشدد برائی کرنے والے کو، شرابی اور چور کو محبت سے سمجھا کر سزا دیتا ہے۔

اگر انگریزی حکومت کو عدم تشدد کے ذریعے ہٹانا ہے تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ تشدد سے کام کرنے کے لئے آپ لوگوں کو قواعد کرنی ہوں گی۔ تلوار اور بندوق کا من سیکھنا ہوگا۔ مگر تلوار کی تو اب کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رہی۔ بندوق کی تھوڑی سی ہے۔ لیکن چند سال میں وہ بھی نہیں رہے گی۔ اب تو ہمارے چوٹی پر سے ہوائی جہازوں کے ذریعے بمب بھینک کر دوسرے کو ذرا کر سکتے ہیں۔ زہریلی گیس چھوڑ کر تباہ کر سکتے ہیں۔ ولایت میں

میں یہ تعلیم عورتوں اور بچوں تک کو دی جا رہی ہے۔ اسی طرح حصول
 نے عدم تشدد کی سائنس کو اختیار کر رکھا ہے انھیں اس کے قانون اور
 قواعد کے مطابق اپنی ساری زندگی بنانی ہوگی۔ ورنہ یہ چیز ان کے
 دلوں کے اندر گھر نہیں کر سکتی۔

عدم تشدد کی لڑائی کا عملی پروگرام میں نے سن ۱۹۴۷ء میں ملک
 کے سامنے رکھا تھا۔ وہ آج بھی کانگریس کے سامنے ہے۔ اس میں
 ایک حصہ پڑا من عدم تعاون کا اور دوسرا تعمیری کام کرنے کا یعنی قومی
 اتحاد پیدا کرنا، چھوٹ چھوٹ کو دور کرنا، شراب اور دوسری مٹی چیزیں
 کو چھوڑنا، کھادی اور چمچے وغیرہ کو اپنانا مگر یہ سب چیزیں ایک سیاسی
 چال کے طور پر نہیں بلکہ عدم تشدد کے ڈھانچے میں ڈھال کر کرنی ہیں
 مثلاً بطور ایک عارضی سیاسی مصالحت کے ہندو مسلم اتحاد ایک چیز جو
 مگر عدم تشدد کے سلسلے میں ایسے ڈھالنا چاہئے کہ دل اس طرح
 مل جائیں کہ کبھی الگ ہی نہ ہوں۔ تب یہ ایک دوسری ہی چیز میں جائے
 گی۔ پہلی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں صرف چند روز تک چل سکتی ہے اس
 میں دھوکا ہو سکتا ہے، چالاکی ہو سکتی ہے۔ مگر دوسری میں صرف
 محبت ہی محبت ہے۔

چرچے کو میں نے اتنی اہمیت دی مگر اس کو بھی اس عدم تشدد
 کے سلسلے میں ڈھالنا ہے۔ ہندوستان میں آج کروڑوں آدمی
 بے کار پڑے ہیں، یا تو ہم ان کو مر جانے دیں تاکہ جو تھوڑے

باقی بچیں ان میں سے ہر ایک کے حصے میں کچھ زیادہ زمین آئے جیسے کہ جنوبی
افریقہ میں ہوا۔ مگر یہ تشدد کا راستہ ہے۔ عدم تشدد پر چلنے والا
انسان تو خدا کی ساری مخلوق کی یکساں خدمت کرنا چاہے گا اس کا دل یہی
کہے گا کہ جو چیز غریب سے غریب آدمی کو نہیں مل سکتی وہ مجھے بھی نہیں
چاہئے۔ وہ لوگ جو مشقت کرتے ہیں وہ اس میں بھی شامل ہوں گے
چرخے کی دریافت اسی خیال کے ماتحت ہوئی۔ جب میں نے ہند
سوراج میں چرخے کا نسخہ پیش کیا تب میں نے چرخہ دیکھا بھی نہ
تھا۔ اسے جانتا بھی نہ تھا۔ میرے سامنے تو ان غریبوں کا تصور
تھا جو فلاس کے بوجھ سے دب گئے ہیں اور بغیر زمین کے بے کار
اور بغیر کھانے کے بھوکے بیٹھے ہیں۔ ان کو میں کیسے پچاؤں؟ یہ سوال
میرے سامنے تھا۔ میں اس وقت یہاں اس محل میں بیٹھا ہوں، لیکن اگر
میرا دل اس میں پھنس جائے تو عدم تشدد کے ایک پیروکار کی حیثیت
سے تو میرا خاتمہ ہی ہو جائے۔

لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں میں مجبوراً بیٹھا ہوں۔ میرا جسم
یہاں ہے مگر میرا دل غریبوں کی جھونپڑیوں میں پڑا ہے۔ اگر کسی
جھونپڑی میں مجھے بیٹھنا نصیب ہو تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔ ہم
تو غریبوں میں مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون
سی چیز ہے جو ہم کو غریبوں سے ملا سکتی ہے۔ اس کا جواب
ہے چرخہ! اسی طرح اگر میں ایک ڈاکٹر ہوں تو بھی میری آنکھوں

کے سامنے غریب لوگوں کی تصویر ہی ہوگی۔ ان کی مصیبت کیسے
کٹے۔ اس کی مجھے فکر ہوگی۔ ایک راجہ کو کیسے اچھا کروں۔ اس کا
چنداں خیال نہ ہوگا۔

جرخہ میری ایجاد نہیں۔ وہ تو ہمارے بزرگوں کے زمانے میں
بھی چلتا تھا مگر چرخے کو عدم تشدد کے ساتھ جوڑنا میری ایجاد
ہے۔ خدا نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اگر تو عدم تشدد سے
کام لینا چاہتا ہے تو تجھے چھوٹی سے چھوٹی، حقیر سے حقیر چیز سے
کام لینا ہوگا۔ بڑی بڑی چیزوں سے نہیں۔ اگر تعمیری پروگرام کی
چاروں چیزوں پر ہم جیسے جاہل دیے ہی بیس سال سے عمل کرتے
آئے تو آج ہم اپنے ملک کے مالک خود ہوتے۔ انگریز، جاپانی
یا کوئی دوسرا ہندوستان کو چھو نہ سکتا۔ اور اگر کوئی یہاں آتا
تو یہاں سے کچھ نہ لے جاسکتا۔ امیر کار خونی ہی محبت سے ہم میں مل جاتا
اگر ہندوستان کے تیس کروڑ لوگوں میں ہمارا دشمن ہی نہ نکلتا تو کیا
باہر سے خدا ہمیں دشمن بھیجے گا اور اگر کوئی دشمن بن کر آئے گا بھی
تو ہمارا عدم تشدد اسے دوست بنا لے گا

ایسے ہی عدم تشدد کی میں آپ سے اُمید رکھتا ہوں۔ سچے
عدم تشدد کی میرے دل میں قدر ہے اگر آپ لوگ سچے عدم تشدد
کو مان لیں۔ اس پر عمل کرنے لگیں تو ساری دنیا کی راہنمائی
کر سکتے ہیں۔ اس لئے میں آپ لوگوں کی تعریف کرتا ہوں۔ میں

دوسری بار یہاں آیا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ آخری بار نہ ہوگی
 اگر آپ چاہیں تو مجھے دھوکہ بھی دے سکتے ہیں میرے ساتھ عدم
 تشہیر کا بند رہنے کے قول و قرار کے بعد باہر جا کر کسی کو لاٹھی بھی مار
 سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو آپ کے اور میرے درمیان عدم تشدد
 کا جو عہد ہوا ہے وہ الٹا بیچارہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ مجھے اور اپنے
 آپ کو دھوکا نہیں دے رہے تو آپ کو اپنے حال چلن سے
 سب پر ثابت کر دینا ہوگا کہ سرخ پوشوں سے کسی کو ڈرنے کی
 مطلق ضرورت نہیں، اور نہ اُن کی موجودگی میں کسی اور سے ڈرنے
 کی ضرورت ہے۔

گیارہواں باب

تشدد اور روحانیت

بنوں کے خوش منظر میدان کے بالکل برعکس مروت کی تکمیل ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ریشملا میدان ہے جو گیارہ سوا گھٹانے مربع میل میں پھیلا ہوا ہے، اور اس کا صدر مقام لکی کہلاتا ہے۔ گاندھی جی گزشتہ ہفتے کی چھپیس تاریخ کو اتالیس میل موٹر کا سفر کے یہاں پہنچے تھے۔ لکی کے پروگرام میں ایک دلچسپ چیز وہ خشک نانچ تھا جو بادشاہ خاں نے خاص طور پر گاندھی جی کے لئے کرایا تھا۔ خشک نانچ جیسا کہ اس کے نام سے دھنک سنکرت لفظ کھٹوگ سے نکلا ہے، جس کے معنی تلوار کے ہیں، (ظاہر ہے شمشیر زنی کے کرتبوں پر مبنی ہے اور خشک قبیلے کے پٹھانوں میں بہت مقبول ہے، جن کا سلسلہ بنوں سے کرباٹ ہوتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے شمال میں اکارہ ضلع پشاور تک چلا گیا ہے۔ عوام کے فنون لطیفہ کے اور بہت سے نمونوں کی طرح یہ نانچ بھی مٹتا جا رہا تھا۔ لیکن

خدائی خدمت گاروں کی تحریک نے جو پٹھانوں کی پرانی تہذیب کے پرانے عناصر کو نئے سرے سے زندہ کرنا چاہتی ہے، اسے بچالیا۔ ان متناسب حرکات میں ڈھولک اور سرنائی کی دلکش آواز کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ اس قدر سادگی اور زور تھا جو سننے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔ اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ سب بچے اور بوڑھے جن میں کہیں کہیں ایک آدمہ ہندو بھی نظر آ جاتا تھا۔ نہایت جوش کے ساتھ ناچ میں حصہ لے رہے تھے خصوصاً ایک زندہ دل بوڑھے کے کرتب نہایت دلچسپ تھے جو اس پرانے گیت کے الفاظ کی مجسم تصویر تھا کیا خوب محفل ہے جہاں، لہرارہی ہوں دلاڑھیاں ناچ کے چکرؤں کے پیچ بچ میں یہ بڑے میاں اپنی بچکے کے پر جسی سفید دلاڑھی لئے ہوئے ایسی بے ساختہ مسخک حرکتیں کرتے تھے کہ بے حس سے بے حس آدمی بھی لوٹ پوٹ ہو جائے۔

رات کو ایک عام جلسہ ہوا جس کے اندر جا بجا ٹوڑے دار بند قوں اور رائفلوں کا ایک جنگل سا نظر آتا تھا جس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ جو لوگ نہایت غور سے گاندھی جی کی تقریر ^{عدم تشدد} پر سن رہے تھے وہ کوئی بوڑھے لوگ نہ تھے۔ یہ اس تقریر کے لئے جس کا موضوع "ترک اسلحہ کی قوت" تھا۔ نہایت ہی موزوں مانا تھا۔ گاندھی جی نے فرمایا: "میں عدم تشدد کا پچاس سال کا تجربہ لئے ہوئے آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ ترک اسلحہ کی قوت بھی قوت

سے بدرجہا زیادہ ہے۔ ایک مسلح سپاہی کی ساری طاقتیں کے ہتھیاروں پر موقوف ہے۔ اگر اس کی صندوق یا تلوار اس سے لے لی جائے تو عام طور پر وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن وہ شخص جس نے عدم تشدد کے اصول کو صحیح معنی علی جامعہ پہنایا ہے ایک ایسی خداوند طاقت رکھتا ہے جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ملتا۔ کبھی کبھی غفلت میں خدا کو بھول جاتا ہے، لیکن خدا ہمیشہ اس کی نگہبانی اور حفاظت کرتا ہے۔ اگر خدائی خدمت گاروں نے اس راز کو سمجھ لیا ہے۔ اگر ان پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہے کہ عدم تشدد دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے تو بہت اچھا ہے ورنہ بادشاہ خاں کے لئے یہ بہتر ہو گا کہ انھیں وہ ہتھیار واپس کر دیں جو ان لوگوں نے ان کے کہنے سے چھوڑ دیے ہیں۔ اس صورت میں وہ کم سے کم اس دنیا کی رسم کی مطابق جو بہیمی قوت کو پوجتی ہے بہادر کہلا میں گئے۔ لیکن اگر وہ ایک طرف اپنے پرانے ہتھیاروں کو چھوڑ دیں، اور دوسری طرف عدم تشدد کی قوت سے بھی محروم رہیں تو یہ ایک ایسا افسوس ناک واقعہ ہو گا جس کے لئے میں تیار نہیں ہوں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے بادشاہ خاں بھی تیار نہیں ہیں۔“

گاندھی جی نے انہیں سمجھایا کہ اس تعمیری کام میں جو کسی سیاسی مصلحت سے لوگوں کی خدمت کے لئے کیا جائے اور اس تعمیری کام میں جو عدم تشدد کے ساتھ کیا جائے، کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ

دوسری قسم کا کام ایک زبردست قوت ہے جو لوگوں کو آزادی کی دولت بخشی ہے۔

لکئی مروت میں خدائی خدمت گار افسروں کے ساتھ گاندھی جی نے بات چیت کے دوران میں کہا :

”جوں جوں مجھے آپ سے واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ہاں کے لوگ اتنے غریب اور سیدھے سادے اور صاف دل ہیں کہ جب ایک بار ان کے دل میں کوئی بات بیٹھ جائے تو پھر آسانی سے نہیں مٹ سکتی، اور ان کو بات سمجھانا بھی کچھ مشکل نہیں۔“

عدم تشدد کی تنظیم کے اصول و قواعد ان اصول و قواعد بالکل برعکس ہوتے ہیں جن پر تشدد کی تنظیم مبنی ہے۔ فوج میں افسر اور معمولی سپاہیوں میں امیج نیچ کی نمیز کی جاتی ہے۔ افسر حاکم اور سپاہی محکوم ہوتا ہے۔ مگر آپ کا جرنیل سب سے بہتر اور سب سے زیادہ سیوا کرنے والا سیوک مانا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو معمولی سے معمولی یا تحت سے بھی کسی طرح بڑا نہیں سمجھتا۔ آپ نے محبت سے خان صاحب کو بادشاہ خاں کا لقب دے رکھا ہے۔ لیکن اگر وہ دل میں اپنے آپ کو سرمج بادشاہ سمجھنے لگیں اور انھیں یہ زعم ہو جائے کہ وہ جہر چاہیں کر سکتے ہیں تو ان کی سرداری ہی ختم ہو جائے۔ خان صاحب آپ کے بادشاہ اس لئے ہیں کہ خدمت کی جتنی طاقت ان میں ہے اتنی اور کسی میں نہیں!

تشداد اور عدم تشدد کی تنظیم میں دوسرا فرق یہ ہے کہ فوج کے افسروں، جرنیل، کرنیل وغیرہ کو بادشاہ مقرر کرتا ہے۔ سپاہیوں کو ان کے چناؤ میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سردار بن کے بیٹھ جلتے ہیں اور انھیں یہاں تک اختیار ہوتا ہے کہ جسے چاہیں ماریں جسے چاہیں رکھیں۔ مگر یہاں بادشاہ خاں کو آپ نے خود بادشاہ بنایا ہے اور آپ جب چاہیں انھیں ہٹا بھی سکتے ہیں۔ پھر امن فوج میں سپاہی خود جرنیل اور افسروں کا چناؤ کرتے ہیں، اور ویسے بھی ان افسروں کی حکومت محض اخلاقی ہوتی ہے۔ ان کا حکم تب ہی تک چل سکتا ہے جب تک سپاہی ان کی سنیں۔

یہ تو آپس کے تعلقات کی بات ہوئی۔ آپ اگر باہر کی دنیا کے ساتھ تعلقات کو دیکھیں تو بھی وہی فرق ان دونوں نظاموں میں نظر آئے گا۔ یہاں ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ باہر ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا ان کو دھکے دے کر ہٹانے کے بجائے آپ نے ادب اور منت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ جب آپ اس میں ناکام رہے تو خود اندر آکے بند ہو گئے، اور انھیں کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن فوجی ضابطے میں اخلاقی دباؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آئیے اب اس سے بھی ایک قدم ادا گئے بڑھیں۔ یہاں جو لوگ باہر سے آئے ہوئے ہیں وہ اگرچہ خدای مہر نہیں ہیں۔ پھر بھی ہماری بات محبت سے سنتے ہیں اور ان کا یہ ہلٹ مچانا بھی ان کی محبت ہی کی ایک نشانی ہے۔ مگر ان کے علاوہ کچھ لوگ

ایسے بھی ہیں جو ہم سے دوستی نہیں بلکہ دشمنی رکھتے ہیں۔ پھر تشدد میں تو ایسے لوگوں کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں دشمن کو دل میں دشمن سمجھنا بھی محبت کی بولی میں گناہ کہلائے گا۔ سو ہم ان سے بدلہ لینے کے بجائے دعا کرتے ہیں کہ ان کی طبیعت بدل جائے اور اگر ان میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو ہم ان کی مار پیٹ کو برداشت کرنے میں، اور یرغولی سے انہیں بلکہ اپنی خوشی سے۔

جنرلی افریقہ کے ستیہ گرہ کے درسان میں میر عالم خاں غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ میں نے قوم سے دغا کی ہے۔ چنانچہ اس نے مجھ پر اچانک قاتلانہ حملہ کیا اور مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا۔ آخر غنڈہ اندہ مزدول ہی ہوتا ہے۔ جب وہ گرفتار کر کے عدالت میں لایا گیا تو میں نے بیان دیا کہ میں اسے گرفتار کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا غلطی کی وجہ سے کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میرا دوست بن گیا۔ اور ایک بڑے مجمع میں اس نے مجھ سے معافی مانگی۔ اگر میں نے بدلہ لینے کی کوشش کی ہوتی تو یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ طبیعت کے بدلنے کی اعلیٰ مثال کہی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر محبت سے دشمن کی طبیعت کو بدلنے کی لگن آپ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے تو آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ عدم تشدد سے کنارہ کشیں۔ یہ چیز آپ کے بس کی نہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اگر کوئی چور ڈاکو آجائے یا کسی بے بس عورت پر کوئی بد معاشرہ حملہ کرے تب کیا اس وقت بھی ہم تشدد کا

استعمال نہ کریں۔ میرا جواب ہے، ہرگز نہیں۔ جان لینے کا حق صرف خدا کی ذات واحد و لایزال ہی کو حاصل ہے۔ اسی کو یہ قدرت ہے کیونکہ اصل حقیقت کو صرف وہی جانتا ہے کہ بے خطا فیصلہ کر سکے نہ کہ غلطی کا تپلا ہے۔ اسے فیصلے کا حق حاصل نہیں۔ عدم تشدد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لاچار ہو کر برائی کو برداشت کر لیں۔ یا اسے نظر انداز کر دیں یا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں۔ اگر ہمارا عدم تشدد سچا ہے اور محبت سے پیدا ہوا ہے تو برائی کو روکنے کے لئے تشدد سے کہیں بڑھ چڑھ کر موثر ثابت ہو گا۔ آپ سے میں اس بات کی توقع رکھوں گا کہ اگر خدا خواستہ ایسا موقع آئے تو آپ ڈاکوؤں کو کھوج نکالیں۔ ان کو ان کی غلطی سمجھائیں، اور اس کام میں اگر جان بھی جاتی ہو تو اس کی پروا نہ کریں۔“

مکی سے ڈیرہ اسماعیل خاں تک موٹر کا پٹرولیا اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ اس علاقے میں ایک وسیع خشک منظر میدان ہے جو دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلا گیا ہے۔ اس کے بیچ میں چکنی مٹی کی پہاڑیاں کسی دقیانوسی جانور کے ڈھانچے کی طرح کھڑی ہیں۔ ان کے پہلوؤں میں ہوا اور بارش نے گہری دراڑیں ڈال دی ہیں۔ اونٹوں کی قطاریں اپنی پیٹھ پر ننھے بچوں سے لے کر مرغیوں اور چلتے کی لکڑیوں تک پورے گھربار کا سامان لادے چلی جا رہی ہیں۔ افغانستان کے موٹے تازے، خوفناک پاسبان کہتے اپنے

مالک کے خاندان کے ساتھ جاڑا بسر کرنے کے لئے برطانوی ہند کے میدانوں کی طرف کا رخ کئے چلے جا رہے ہیں۔ گرم ہوا کے پردے کے پیچھے سراب کی جھلک نظر آتی ہے۔ گرد سے ڈھکی ہوئی جھاڑیاں سڑک کے کنارے تیزی سے دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مگر جب ڈیرہ اسماعیل خاں کے راستے کی سب تصویریں حلقے میں آتی ہیں تو گرد اور دھوپ کا نقش ہی سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

شام کے وقت ہم ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچے۔ یہاں مسلمانوں کے ہندو مسلم فساد، لوٹ مار اور آتش زونی کے واقعات کے آثار ایک باقی تھے۔ مقامی کانگریس محض برائے نام تھی اور بہاؤ کے دلنیز کو بادشاہ خاں کے خدائی خدمت گاروں کے ساتھ مل کر کام کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب گاندھی جی شام کو اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو مجمع کو قابو رکھنے کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا اور ہمارے ہفتن کی صحبت نہیں ہو سکی بعض من چلے چھت پر چڑھ گئے۔ اور گاندھی جی کے کمرے کے روشن دروازے پر بیسیوں تختوں پر آنکھیں اندر جھانکنے لگیں۔ دو دن کے بعد ڈیرہ اسماعیل خاں کے نواب گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کو ان کے ہندو میزبان کی اجازت سے ”گرفٹار“ کر کے اپنے ساتھ لے گئے اور انھیں اپنے مکان میں رکھا جہاں مقابلتا امن تھا۔

دوسرے دن شام کو ایک عام جلسہ ہوا جس میں ۵۰۰۰ سے زیادہ کی تھیلی گاندھی جی کی خدمت میں پیش کی گئی۔ یہ رقم ڈیرہ اسماعیل خاں

جیسے شہر کے لئے کچھ بھی نہ تھی۔ اور اس میں بھی پانچ ہزار روپے ایک ہی شخص کا عطیہ تھا۔

گاندھی جی نے متعدد سپاس ناموں کے جواب میں جوان کے سامنے پیش کئے گئے تھے۔ ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا، آپ لوگوں نے مجھے روپے کی جو بھٹی دی ہے، اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان سے میرا پیٹ نہیں بھرتا مجھے تو کروڑوں آدمیوں کا کام کرنا ہے۔ مگر میں اس وقت پیسے جمع کرنے نہیں آیا ہوں۔ پیسے جمع کرنے آتا تو دوسری طرح کام کرتا۔ امیروں سے پیسے اکٹھا کر کے غریبوں کی جیب میں ڈالنا، یہ میرا پرانا کام ہے۔ بادشاہ خان نے مجھ سے کہا تھا کہ یہاں سے پیسے نہ لینا۔ مگر میں آپ کی بھٹی واپس کر دوں، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اتنا آپ لوگ سمجھ لیں کہ ہماری عورتوں کو دیہاتوں میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا تو ان سے آزادی کی گفتگو کرنا بے کار ہے۔ جب تک ہندو مسلمان، عیسائی سب ایک دل نہیں ہو جائیں گے۔ آزادی صرف نام کی ہی ہوگی۔ عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کرنی ہے تو ہمیں چار طرح کا تعمیری پروگرام پورا کرنا ہو گا۔ یعنی کھادی، قومی اتحاد، چھوٹ، اچھوت کا دور کرنا اور نشہ بندی۔ اس صوبے میں ہندو مسلمان اور انگریز تینوں کا امتحان ہو رہا ہے۔ پہلے میں کہا کرتا تھا کہ ہمارا امتحان پنجاب میں ہو گا۔ مگر اس وقت تک میں سرحدی صوبے میں نہیں آیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو

غلامی کی زنجیر میں جکڑنے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا فیصلہ تو تاریخ
 اگے چل کر کرے گی۔ مگر ہندو مسلمان آج اپنی تاریخ خود بنا رہے ہیں۔
 اگر وہ آپس کے تعلقات ٹھیک کر لیں تو دنیا کے لئے ایک مثال
 قائم کر جائیں گے۔ بس اگر خدائی خدمت گار عدم تشدد کو سمجھ لیں اور
 اس پر قائم رہیں تو یہ سب جھگڑے طے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کھادی کے
 ذریعے سے یہ کوشش کرنی ہے کہ روڑوں روپیہ جو سوت کی خریداری
 کے لئے ہندوستان سے باہر جاتا ہے بچ جائے۔ چرخہ سنگھ نے
 کھادی کے کام کے ذریعے سے اب تک چار کروڑ روپے سے زیادہ
 غریب ہندو مسلمان کا تنے اور بننے والوں کو ضروری کے طور پر ہم
 کیا ہے۔ اس کے علاوہ اچھوت اور ہار کا کام ہے اور یہ بھی ہفت
 خواں سے کم نہیں ہے۔ آپ کا عطیہ اس عظیم انسان کام کی مناسبت
 سے ہونا چاہئے جس کے لئے وہ دیا گیا ہے۔ آپ کا شہر کوئی غریب
 شہر نہیں ہے۔ چندہ زیادہ تر تاجروں نے دیا ہے۔ یقیناً آپ
 لوگ اس سے زیادہ دے سکتے تھے۔ اس کے بعد خدائی خدمت گاروں
 سے مخاطب ہو کر انھوں نے ان کے اندر مقامی والیٹیروں کے تعلقات
 کی کشیدگی کا ذکر کیا جو ان کے علم میں آئی تھی۔ یہ اختلافات بہت
 افسوسناک ہیں، لیکن اگر خدائی خدمت گار اپنے اصول پر جو
 وہ اب اچھی طرح سمجھ گئے ہیں، پورا پورا عمل کریں تو یہ جھگڑے
 اور لڑائیاں داستانِ پارینہ بن جائیں گی۔ یہی ان کے امتحان کا

وقت ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو وہ فرقہ دارانہ اتحاد پیدا کرنے اور سوراخ قائم کرنے میں مدد دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ غصے کو بالکل نکال دینا بہت مشکل کام ہے۔ یہ محض انسان کی کوشش سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے توفیق الہی کی ضرورت ہے۔ آپ سب لوگ میرے ساتھ مل کر خدا سے دعا کیجئے کہ وہ خدائی خدمت گاروں کو اتنی قوت دے کہ اپنے دل سے غصہ اور تشدد کے رہے سہے آثار بھی دور کر دیں۔“

کھاجی اسی نام کی تحصیل کا صدر مقام ہے اور دریائے لوئی کے شمالی کنارے پر ڈیرہ اسماعیل خاں سے ۲۷ میل پچھم میں واقع ہے یہاں کے لوگوں نے ۳۱ اکتوبر کو ایک عام جلسے میں گاندھی جی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اس میں اس تحصیل کے دائمی افلاس کا اور بارش کی کمی کا ذکر تھا جس کا اوسط سال میں چار انچ سے زیادہ نہیں۔ گاندھی جی نے یہ سن کر بے تامل جواب دیا کہ ”پھر خدہ چلانے سے افلاس دور ہو سکتا ہے۔“ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بچان یہ پراسن مشغلے اختیار کریں تو سوت اور اون کی کٹائی کا مستقبل بہت شان دار ہو گا۔“

اگلے دن ٹونک کے عام جلسے میں گاندھی جی نے ان شکایات کا ذکر کیا جو وہاں کے ہندوؤں نے ان کے سامنے پیش کی تھیں۔ ہندوؤں کے ایک وفد نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شکایت کی تھی کہ ان

کا جان مال محفوظ نہیں اگر مقامی خدائی خدمت گاران کی مدد
 کریں تو ان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ گماندہی جی نے کہا۔ ان لوگوں
 کا یہ خیال ہے کہ اس علاقے میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے درمیان
 مٹھی بھر ہندوؤں کی گذر اسی وقت ہو سکتی ہے جب مسلمان ان کے
 ساتھ سچ محبہ یوں کا سا برتاؤ کریں۔ انھوں نے مجھ سے درخواست
 کی ہے کہ خدائی خدمت گاروں کو اس قدرتی فرض کی طرف توجہ دلاؤں
 جہاں پر عام ہو تا ہے۔ میں ان کے اس خیال کی اور اس درخواست
 کی تائید کرتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ توقعات جو میں نے
 آپ سے قائم کی ہیں پوری ہو جائیں تو ان لوگوں کو کوئی ٹھکانہ نہیں
 گا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس صوبے میں ہندو مسلمان
 اور انگریز سب کی آزمائش ہو رہی ہے۔ انگریز جو کچھ کر رہے ہیں
 اس کی اچھی برائی کا فیصلہ تاجیج کرے گی، لیکن ہندو اور مسلمان
 چاہیں تو آپس کے اچھے برتاؤ سے اپنی تاریخ کو بدل سکتے ہیں خدائی
 خدمت گاروں کا راستہ تو صاف ہے انھیں اپنے ہمسایوں کا
 پشت پناہ بن کر رہنا ہے۔

بچے ارادے اور بچے عقیدے کے مٹھی بھر آدمی تاریخ
 کی رو کو بدل سکتے ہیں۔ یہ پہلے بھی ہو چکا ہے اور اب بھی ہو سکتا
 ہے۔ اگر خدائی خدمت گاروں کا عدم تشدد و محض طمع نہیں بلکہ
 کھرا سونا ہے۔

خدائی خدمت گار افسروں کے سامنے بات چیت کے دوران میں
 گماندہی جی نے کہا: "بادشاہ خاں نے آپ لوگوں کا نام خدائی خدمت گار
 رکھا ہے اور ہندوستان کو یہ بات سنائی گئی ہے کہ آپ عدم تشدد
 کے پابند ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو چھپی نہیں رہ سکتی۔ جیسے سورج کی
 نکلنا ہے تو اندھے کو بھی اس کی حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ
 ہی آپ کی محبت کی حرارت ہندوستان بھر میں پھیل جائے گی۔ آج تک
 ایک بھی خدائی خدمت گار مجھے ایسا نہیں ملا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ عدم
 تشدد کا پابند نہیں یا اسے سمجھتا نہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم عدم تشدد
 پر قائم ہیں اور رہیں گے۔ خدا اسے چاہا تو ایسا ہی ہو گا۔ میرے
 جیسا آدمی جس نے تلوار بنادوق کو چھپوا تک نہیں یہ کہے کہ میں عدم تشدد
 پر قائم رہوں گا تو اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ لوگ کہیں گے کہ
 اس سے اور ہوسہ کیا سکتا ہے۔ مگر جب آپ لوگوں کے بارے میں
 میں یہ کہتا ہوں کہ آپ عدم تشدد پر قائم رہیں گے تو لوگ ہنستے ہیں
 اور مجھے بے وقوف بناتے ہیں مگر میں یہ نہیں مانتا کہ میں بے وقوف
 ہوں۔ البتہ اگر کسی پر اعتقاد کرنا ہے تو قونی میں داخل ہے تو ایسا بے وقوف
 بننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ آخر میں کیوں نہ دوسروں کے قول پر اسی طرح
 بھروسہ کروں جیسے میں چاہتا ہوں کہ دوسرے لوگ مجھ پر بھروسہ کریں
 اگر آپ کے بارے میں میرا خیال غلط ہے تو بہت جلد اس کا پتہ چل جائے
 گا یہ ایسی چیز نہیں جس کا اثر دیکھنے کے لئے پچاس سال انتظار کرنا

پڑے۔ یہاں کے ہندو لوگ بھی میرے پاس آتے ہیں۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ آپ سچے خدائی خدمت گار ہیں۔ اگر آپ لوگ پوری طرح عدم تشدد پر قائم ہوں گے تو خود بخود سب لوگ قائل ہو جائیں گے۔ یہ ایک بڑا معجزہ ہو گا۔ دو تین دن ہوئے سرحدی صوبے کے معزز مسلمان میرے پاس آئے تھے۔ کہنے لگے تم بڑے ہوشیار ہو۔ خدائی خدمت گاروں سے میل جول پیدا کر رہے ہو۔ یہ اچھی ترکیب ہے۔ میں تمہاری چال سمجھ گیا ہوں۔ میں چونکا کہ نہ جانے کیا سمجھے ہوں گے۔ وہ کہنے لگے کہ تم خدائی خدمت گاروں کو بہادر بنا رہے ہو۔ یوں تو وہ پہلے ہی سے بہادر ہیں۔ مگر تم ان کی بہادری کو اور بڑھا رہے ہو۔ جہاں تکسین پڑے گا یہ لوگ تلوار سے کام نہیں لیں گے۔ بہادر کو تلوار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ شمشیر کو دیکھو نہ! بغیر تلوار نکالے وہ فتح پر فتح حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ان لوگوں کو تلوار نکالنے کا موقعہ پڑ جائے تو ان کی تلوار سب کو کاٹ کر رکھ دے گی۔

میں دل میں کچھ ہنسنا اور کچھ رویا۔ اگر میری تعلیم آپ کے دل میں اس طرح کا جذبہ پیدا کرتی ہے تو پہلے میرے دل میں یہ جذبہ ہونا چاہئے۔ لیکن میں تو خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ایسی بات میرے دل میں کبھی آتی ہی نہیں۔ تو پھر آپ کے دل میں کیسے آجائے گی خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ نے میرا پیام خود میرے منہ سے سنا ہے۔

مجھ میں غصہ تو کافی ہے۔ مگر بچا پس سال کی کوشش سے میں اسے قابو میں رکھ سکتا ہوں۔ مخالف پر تو مجھے غصہ آتا ہی نہیں ہے۔ مگر دوستوں پر کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔ اتنی کمزوری مجھ میں ضرور ہے۔ میں آپ کو جو سکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرض کیجئے یہاں جنگ چھڑ جائے۔ دشمن معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کر دیں اور ہر طرح سے آپ کو اور مجھے استعمال دلانے کی کوشش کریں۔ اس پر بھی ہم تشدد کا دامن نہ چھوڑیں۔ خدا ہمارا امتحان اسی طرح لیتا ہے۔

اس دوست نے جو کچھ میری بابت سمجھا وہی چیز کسی انگریزوں کے دلوں میں بھی ہے۔ مگر میں تو آپ لوگوں کو اس کے برعکس تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ لوگ غصے کو بالکل دل سے نکال دیں۔ مرنے سے ڈرنا ہی کیا۔ آپ تو پہلے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ اب اور بھی نڈر ہو جائیں گے۔ کوئی ہم کو مار ڈالے، ہمارے معصوم بچوں کو قتل کر ڈالے، تو بھی ہماری تلوار اس پر نہیں چلے گی۔ اس کو غلط راستے سے روکنے کی کوشش میں ہم خود مر جائیں گے مگر اس پر غصہ نہیں کریں گے۔

مجھ سے کسی نے پوچھا تھا کہ فرض کیجئے آپ کی لڑکی کو ڈاکو ٹھاکر لے جاتے ہیں۔ آپ اس کی حفاظت کے لئے مرنے کو چاہتے ہیں۔ مگر وہ آپ کو درخت سے باندھ دیتا ہے، اور مرنے بھی نہیں دیتا۔ تب

آپ کیا کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ تب میں لاچار ہو جاؤں گا اور خدا مجھے معاف کر دے گا۔ مگر میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ جس رسی سے مجھے باندھے جہاں تک ہو سکے گا اُسے توڑ ڈالوں گا۔ لیکن اگر اس کو توڑنے کی طاقت ستر سال کی عمر میں مجھ میں نہ ہوئی تو اس کوشش میں خود ٹوٹ جاؤں گا۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ زندگی کی محبت دل سے نکال دیں۔ اپنی جان دینے کی طاقت تو ہر انسان میں ہوتی ہو رہی ہے۔

تو میں آپ کو جان دینے کا فن سکھانا چاہتا ہوں۔ کوئی آپ کی بیوی بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو بھی آپ کے منہ سے یہی نکلے گا یا خدا اس پر رحم کرے۔ اسے جیوانیت سے بچا۔ اگر آپ سیکھ سکتے ہیں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر نہیں سیکھ سکتے تو بہتر ہوگا کہ آپ پھر تلوار اٹھالیں۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میں آپ سے ہاتھ دھو لوں گا اور صبر کر کے بیٹھ رہوں گا۔ رہی دنیا تو اُسے شکایت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ آپ نے ہزار ہا سال تلوار چلائی ہے۔ آئندہ بھی یہی کرتے رہیں تو اس میں کوئی اٹوٹھی بات نہ ہوگی۔ لیکن اگر میری تعلیم کی وجہ سے آپ تلوار چھوڑ کر بزدل اور نامرد بن جائیں تو اس میں آپ کی، میری خان صاحب کا سب کی ذلت ہے۔

غالباً یہ ایک پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے ان لوگوں سے اس طرح گفتگو کی تھی، اور عدم تشدد کا نکل پیغام ان تک پہنچا یا تھا۔ خود

یہ بات کہ گاندھی جی کو اس کا موقع دیا گیا، پٹھانوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ جب یہ اکھڑ سپاہی اپنے سردار خاں عبدالغفار خاں کی تیز نظروں کے سامنے گاندھی جی کے انوکھے پیام امن کو غور سے سن رہے تھے تو ان کو دیکھ کر بے اختیار کیٹس کے یہ لافانی اشعار یاد آ جاتے تھے جن میں بہادر کورٹیز اور اس کے ساتھیوں کا ذکر ہے۔

اس وقت میری حالت اس شخص کی سی تھی جو درہن لگائے آسمان کو دیکھ رہا ہو اور یکا یک ایک نئے ستارے کی جھلک اس کی نظر پر آن کر پڑتی ہے یا بہادر کورٹیز کی سی جس کی عقاب کی سی تیز نظریں بحر الکابل کو چھپانتی ہوئی یکا یک ٹھٹھکیں گئیں اور اس کے سب ساتھی کبھی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور کبھی ڈارین کی سرزمین پر پہاڑ کی ایک چوٹی کو —

بارہواں باب

آزاد قبائل میں

ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچ کر صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا دورہ ختم ہو گیا۔ اس راہ گزشتہ کو سہ پہر کے وقت ڈیرہ اسماعیل سے روانہ ہو کر ہم نے دورے کا آخری حصہ شروع کیا۔ سیواگرام سے جہاں بیماری پھیل گئی تھی اور آدھے کارکن، صاحب فراسش تھے وہاں کا تقاضا ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کو یہ فکر تھی کہ رمضان کے مہینے میں اپنے دورے کو اس سے زیادہ جاری نہ رکھیں جتنا کہ اسد ضروری تھا۔ جس اہتمام کے ساتھ ہمارے مسلمان میزبان بادشاہ خاں صاحب اور ان کے خدائی خدمت گار روزے کی حالت میں گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے کھانے پینے کا اور آرام و آسائش کا سامان کرتے تھے اس کی وجہ سے گاندھی جی کو اور بھی لگنے لگا کہ جہاں تک ہو سکے ان کا بوجھ ہلکا کرنا شرافت کا تقاضا ہے۔ ایک روز جب ہم دوپہر کے کھانے کے بعد سڑک کے کنارے

ایک چھوٹے سے گاؤں میں ٹھہرے تھے۔ گاندھی جی نے خدائی خندنگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا "میں اس سے بہت متاثر اور شرمندہ ہوں کہ رمضان کے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کے اس گاؤں کے کسی ایک گھر میں بھی چوہا نہیں چلتا۔ ہم لوگوں کے لئے آپ کو کھانا پکوانا پڑا۔ اب میری وہ عمر نہیں کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ روزہ رکھوں۔ جیسے میں جنوبی افریقہ میں ان مسلمان بچوں کی تربیت کی غرض سے رکھتا تھا جو میری نگرانی تھے۔

"اس کے علاوہ مجھے خاں صاحب کے جذبات کا لحاظ تھا۔

جبھیں دن رات میرے آرام کی فکر رہتی ہے۔ میرے روزے رکھنے سے ضرور وہ پریشان ہوتے۔ اس کے سوا کہ میں آپ سے ملتی مانگوں اور کیا کر سکتا ہوں؟

ہمارا باقی سفر بھاگ دوڑ میں گذرا۔ پہلے دن ہم سو میل کا فاصلہ طے کر کے پنبا لے کے گاؤں تک پہنچنا چاہتے تھے جو بڑی سڑک سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ جب ہم میری خیل پہنچے تو اندھیرا ہو چلا تھا اور سڑکیں روک دی گئی تھیں۔ اس سڑک کے اس حصے میں سفر خطرناک سمجھا جاتا ہے اور سہ پہر کے چار بجے کے بعد آمد و رفت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن بادشاہ خاں کی موجودگی ہر جگہ کھل جاو سم سم کا کام دیتی تھی۔ جب ہم پہلی روک پہنچے تو بادشاہ خاں نے اپنے بیٹے ولی خاں سے جو موٹر چلا رہے تھے کہا "ان لوگوں سے

کہہ دو کہ ہم اپنی ذمہ داری پر سفر کرنا چاہتے ہیں اور دیکھو اگر کوئی شخص چلائے کہ ٹھہر جاؤ تو فوراً گاڑی روک دینا۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں تو کوئی ہم سے تعرض نہیں کرے گا۔ لیکن اگر تم نے یہ کوشش کی تیری سے نکل جاؤ تو ممکن ہے کہ پیچھے سے بندوق کی آواز سنائی دے۔" رات کو ہم مقصود جان اور ان کے بھائی کے باغ میں ٹھہرے جنہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم کو دیہاتی وضع اور لمبی سفید ریش میں چھپا رکھا ہے۔ صبح پھر وہی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی، اسی راستے سے ہم ڈیرہ اسماعیل خاں واپس پہنچے اور احمدی بانڈہ نام گاؤں میں دو گھنٹے ٹھہر کر بنوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ساٹ رینج، کی بھوری مٹی کی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، جن کی شکستہ چوٹیوں پر ہمیشہ ایک طلسمی سکوت اور خواب سا چھایا رہتا ہے۔ پھر کوہاٹ کے شہر اور درہ کوہاٹ سے ہوتے ہوئے اس مقام سے گزرے جہاں ایک چھوٹی سی بگ ڈنڈی ایک کوہستانی گھائی سے نکلتی ہے۔ اسی جگہ سے لوگ مولی ایلین کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اب اس مقام پر پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا ہے۔ اس سے آگے ایک سو پچیس میل کا فاصلہ طے کر کے شام کے وقت ہم پشاور شہر کے چوک میں پہنچ گئے۔

جب ہم السیفال کی سڑک پر اڑتے چلے جا رہے تھے، تو بادشاہ خاں مختلف مقامات اور مناظر پر جرتے میں آتے

تھے سہر سہری بٹہرو گرتے جاتے تھے۔ بنوں سے کوہاٹ جانے والی سڑک کی ابے شمار فوجی چوکیوں میں سے ایک کے پاس سے گزرتے ہوئے انھوں نے کہا "کس قدر بے کار اسراف ہے۔ مہاتما جی ذرا جھنڈا مل اور مسلح گاڑیوں اور ٹینکوں کی اس بے جان تلاش کو دیکھئے گا اور اس پر بھی یہ لوگ ڈاکوؤں کے اس چھوٹے سے گروہ کو جدت سے اس علاقے کو تاراج کر رہا ہے۔ گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک سال ڈاکوؤں کے سردار نے اپنا جھنڈا سامنے کی پہاڑی پر برطانوی فوج کے سامنے گاڑ دیا اور پکار کر کہا کہ اگر بہت ہو تو مجھے پکڑ لو، لیکن وہ اب تک پکڑا نہیں گیا۔ یا تو یہ فوج کی انتہائی نالائقی ہے اور یا اس کی مجرمانہ بے پروائی۔"

پنیا لاہ اور احمدی بانڈہ میں گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں سے گفتگو کی اور پنیا لاہ میں ایک عام جلسہ بھی ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ گاندھی جی کی گفتگو کا خلاصہ بیان کروں یہ ضروری ہے کہ جو لوگ ان کے مخاطب تھے ان کی کچھ روایات اور خصوصیات بیان کر دی جائیں۔

لفظ افغان ایک وسیع معنی رکھتا ہے جس کا اطلاق افغانستان کی جدید ریاست کے ہر باشندے پر ہوتا ہے لیکن لفظ پٹھان کا تعلق زبان سے ہے۔ یہ پنجتوں کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی ہیں پنجتوں بولنے والا۔ اس میں جنوبی مشرقی

افغانستان اور ہندوستان کے سرحدی علاقے کے سب لوگ جو پختوں یا پشتو کہلاتے ہیں شامل ہیں۔ ایک چیز جس پر بادشاہ غلام جام جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے اکثر زور دیتے تھے یہ تھی کہ ہر وہ شخص پٹھان ہے جس نے اس صوبے کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور پختون بولتا ہے، چاہے ہندو ہو یا سکھ یا مسلمان۔ واقعی ایسے ہندو اور سکھ مرد عورتیں اور بچے موجود ہیں جو پٹھانوں کے درمیان بس گئے ہیں، پٹھانوں کا لباس پہنتے ہیں اور پشتو کے سوا کوئی زبان نہیں بولتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ناموں میں پشتو زبان کا لاحقہ، زلی بھی لگالیا ہے۔

پٹھان بڑے تنومند ہوتے ہیں۔ ان کا جسم ڈبلا مگر مضبوط اور لچک دار ہوتا ہے۔ سارے دورے میں ایک پٹھان بھی نہیں ملا جس کا پیٹ نکلا ہوا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بے چربی کا گوشت کھاتے ہیں۔ اور ناشائستہ دار غذا میں بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ یہ کبھی بغیر ہتھیار لگائے باہر نہیں نکلتے۔ مولیشی چراسے وقت لادو جانوروں کو ہانکے وقت، کھیت بولتے وقت، میلے ٹھیلے میں، عام جلسوں میں، غرض ہر وقت، ہر جگہ وہ مسلح ہوتے ہیں ان کی رائفل یا بھاری جزائل (پرانی منشی کے پٹھان توڑے یا بندوق کو اس نام سے پکارتے ہیں) عموماً بائیں کندھے سے لٹکی ہوتی ہے۔ کارٹوسل کی پیٹی، چھریاں اور خنجر ان کے جسم میں

جا بجا گئے ہوئے تھے ہیں مثلاً کر کی مٹی پر، گریباں کے نیچے گولی پر
 اس تمام وقت میں جو وہ گھر سے باہر گزارتے ہیں دم بھر بھی الگ
 نہیں ہوتے۔ وہ بڑے باہر نشانہ باز ہوتے ہیں اور گھات میں
 چھپ کر بیٹھنے، چھاپہ مارنے اور ہاڑی لڑائی لڑنے میں کمال رکھتے ہیں
 جو انگریز پٹھانوں پر کرتا ہیں لکھتے ہیں وہ عام طور پہان کی سیڑ
 کو برا کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے اکثر پڑانے فوجی افسر ہوئے
 ہیں جن سے ان کی دشمنی ہے۔ پٹھانوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ
 وہ ”پرے سرے کے چور اور لٹیروں ہوتے ہیں“ لکنا ٹرسٹیفن کنگ
 ہال فرماتے ہیں۔ ”پٹھان سوئے آدمی کے نیچے سے کبیل تک چلا لیتے
 ہیں“ لیکن ڈیویز کا اور اس دلچسپ کتاب ”کاروانِ خیبر“ کے
 مصنف کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ پٹھانوں کو سوتے
 ہوئے شہریوں کے نیچے سے کبیل چرانے سے کیونکر روکا جائے
 بلکہ یہ ہے کہ سنتریوں کی رائفلوں کے چوری کیونکر بند کی جائے۔ یہاں
 تک ہوا کہ رائفل کے چوری جلنے پر مارشل لا کی سزا دی گئی، اور
 پہلے والوں کی بندوبستیں ان کی کلائی یا کر پر زنجیر سے جکڑی جاتی
 تھیں۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہی ہوا کہ رائفل بہت سنتری لاپتہ
 ہونے لگیں۔

اپنے سماجی تعلقات میں پٹھان ”ٹپھن ولی“ کے یعنی تین خلاقی
 ضابطوں کے پابند ہیں جن کا قبائل کے لوگوں کو خیال رکھنا پڑتا ہے۔

www.LaetiaNews.com ۲۳۳
جن کی خلاف ورزی گناہ کبیرہ سمجھی جاتی ہے اور دائمی ذلت اور مسکرتی
مقاطعے کا باعث ہوتی ہے۔

(۱) پٹھان کو چاہئے کہ مفرد کو پناہ دے (نن دتئی) (۲) اس
کا فرض ہے کہ سخت سے سخت اپنے دشمن سے کہاں نوازی (مل مسیتا)
کا برتاؤ کرے (۳) اس پر لازم ہے کہ توہین کا بدلہ توہین سے لے
و بدل، اس آخری اصول کی وجہ سے خون کی عداوت کا سلسلہ چلتا
رہتا ہے جو پٹھانوں کی قوم کے لئے ایک لعنت ہے۔ ہر قبیلے کی چھوٹی
چھوٹی گوتوں میں خانہ جنگی ہوتی رہتی ہے ہر خاندان کسی دوسرے
خاندان سے خون کی عداوت رکھتا ہے اور ہر شخص کے کچھ نہ کچھ جانی
دشمن ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی قتل کی وارداتوں کا شمار رکھتا ہے
ہر قبیلے کا اپنے ہمسایوں سے جانوں کی لین دین کا کھاتا ہوتا ہے
ڈیوینہ لکھتا ہے بد قسمتی سے سرکشن پٹھانوں کو یہ احساس نہیں
کہ اس وحشیانہ رسم کے ہلکے اٹھے ان کے بہت سے بہترین خاندان
قریب قریب ختم ہو گئے ہیں۔ جب تک یہ خانہ جنگیاں موقوف نہ ہوں
نہ تو ایک متحدہ قوم بن سکتی ہے اور نہ امن قائم ہو سکتا ہے۔

بہر حال پٹھانوں کی سیرت کی اچھی یا بُری صفات میں اب تک
عدم تشدد داخل نہ تھا۔ اسی لئے گاندھی جی نے خدائی خدمتگاروں
کو یہ بتانے میں خاص اہتمام کیا کہ وہ جو بات انھیں سمجھانے کے لئے
آئے ہیں وہ ان کے قدیم علم و عمل سے بالکل الگ ہے اور بادشاہِ خا

www.3ct.org
www.3ct.org

کی تعلیم روایات ماضی کے بالکل برعکس ہے۔ انھوں نے پٹیارہ میں
خدا کی خدمت گاروں سے کہا۔

”میں نے جو کچھ بادشاہ خاں سے سنا تھا۔ وہ اب خود آپ
لوگوں کی زبان سے سُن لیا کہ آپ نے عدم تشدد کو مصحت و وقت
کے طور پر نہیں بلکہ ایک عقیدے کے طور پر ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیا
ہے۔ اس نئے محض تلوار کو ہاتھ سے رکھ دینا جب کہ آپ کے دل میں
تلوار موجود ہے، کچھ زیادہ فائدہ نہیں دے گا۔ تلوار کا ترک اس
وقت تک سچا نہیں سمجھا جائے گا جب تک آپ کے دل میں ایسی طاقت
نہ پیدا ہو جائے، جو تلوار کی طاقت کے برعکس اور اس سے برتر ہو۔
اب تک انتقام آپ لوگوں کے ہاں ایک مقدس فرض سمجھا جاتا ہے۔
اگر آپ کی کسی شخص سے خون کی عداوت ہو تو ہمیشہ باقی رہتی ہے
اور باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ عدم تشدد کا اصول
یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کو اپنا سمجھتا ہو تو آپ کو یہ حق نہیں کہ اسے
اپنا دشمن سمجھیں ظاہر ہے کہ انتقام کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“
انھوں نے اپنے مخاطبوں سے پوچھا ”جنرل ڈائر سے زیادہ ظالم اور
خون خوار اور کون ہو سکتا ہے؟ لیکن کانگریس نے جو کمیٹی جلیان والہ
باغ کے معاملے کی تحقیق کے لئے مقرر کی تھی وہ میرے مشورے
سے، یہ مطالبہ کرنے سے باز رہی کہ ڈائر پر مقدمہ چلایا جائے۔
میرے دل میں اس کی طرف سے مخالفت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ میں تو

www.321teetnews.com
 چاہتا تھا کہ اس سے مل کر اس کے دل پر اثر ڈالوں مگر یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کو بتایا کہ خدائی خدمت گاروں کا عدم تشدد اپنے آپ کو کس طرح غلطی کی خدمت میں ظاہر کر سکتا ہے اور اس کے لئے کس قسم کی تربیت کی ضرورت ہے۔

جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو ایک خدائی خدمت گار نے جو گاندھی جی کی تقریر بڑے غور سے سن رہا تھا یہ مشکل سوال پوچھا "آپ ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم ہندوؤں کی چھاپہ مارنے والوں سے حفاظت کریں مگر اسی کے ساتھ آپ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ہتھیاروں سے چوروں اور ڈاکوؤں کے مقابلے میں بھی کام نہیں لے سکتے یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ کیسے ہو سکتی ہیں؟ گاندھی جی نے جواب دیا یہ تناقص محض ظاہری ہے۔ اگر آپ اپنے سچے پیچ عدم تشدد کی روح کو جذب کر لیا ہے تو آپ چھاپہ مارنے والوں کے حملے کا انتظار نہیں کریں گے بلکہ ان کے علاقے میں جا کر انھیں دھونڈ نکالیں گے اور ایسی کوشش کریں گے کہ ان کے حملے رک جائیں۔ اگر اس پر بھی وہ چھاپہ ماریں تو آپ ان کا سامنا کریں گے اور ان سے یہ کہیں گے کہ وہ آپ کے ہندو ہمسایوں کے مال کو اس وقت تک ہاتھ نہیں دھکا سکتے جب تک آپ کی لاشوں پر سے نہ گزریں۔ اگر سینکڑوں خدائی خدمت گار اپنے ہندو ہمسایوں کی حفاظت پر

تیار ہوں تو چھاپہ مارنے والوں کو اس میں بہت تامل ہوگا کہ ان سب بے گناہ خدائی خدمت گاروں کو جو عدم تشدد کے ذریعے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں بغیر کسی اشتعال کے قتل کر دیں۔ آپ کو شیخ عبدالقادر جیلانی کا اور ان چالیس اشرفیوں کا قصہ معلوم ہے جو ان کی ماں نے انھیں بغداد جلتے وقت دی تھیں۔ راستے میں قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور حضرت عبدالقادر کے ساتھیوں کے پاس جو کچھ تھا لوٹ لیا۔ خود عبدالقادر اتفاق سے بچ گئے تھے مگر آپ نے جو چھاپہ مارا۔ مارنے والوں کو پکار کر کہا کہ میری ماں نے چالیس اشرفیاں میرے کرتے کے استر میں سی دی ہیں، روایت یہ ہے کہ ڈاکوؤں پر اس لڑکے کے (حضرت شیخ ہنس رومانے میں بہت کم سن تھے، بھوکے بن کا اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے نہ صرف اس کو بے لوثے چھوڑ دیا بلکہ اس کے ساتھیوں کا بھی سدا مال واپس کر دیا ۱۱

احمدی بانڈہ میں گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں کو یہ سمجھایا کہ عدم تشدد کے پروگرام میں سہولت نافرمانی کی کیا حیثیت ہے اور وہ عملی پروگرام سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ گاندھی جی اس تقریر کو اپنے اخبار میں شائع کر چکے ہیں۔ اس لئے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

پشاور کے بارائیسوی ایشین نے گاندھی جی کی موجودگی

سے فائدہ اٹھا کر وزیر اعظم کے مکان پر ان کی خدمت میں ایک ایڈریس
پیش کیا اس میں انھوں نے بڑے فخر سے یہ دعوے کیا کہ گاندھی
جی ان کی بلوری کے رکن ہیں اور ضمناً اپنے پیشے کے بعض ممتاز
لوگوں کی سیاسی خدمات کا ذکر کر کے اپنی تعریف بھی کر دی۔ گاندھی
جی نے ایک مزاحیہ تقریر میں اس عزت کا شکریہ ادا کیا جو انھیں بخشی
گئی تھی اور کہا کہ میں اس رستے کا مستحق نہیں ہوں۔ اس لئے کہ ایک
تولڈن کی اس قانونی ایجنٹ نے جس سے میں نے سند لی تھی مجھے
اپنی رکنیت سے خارج کر دیا ہے، دوسرے میں نے جو کچھ قانون پر
تھا وہ سب مدت ہوئی بھلا دیا۔ کچھ زمانے میں میرا شغل عدالتوں
میں قانون کی تشریح کرنے سے زیادہ قوانین کی خلاف ورزی
رہا ہے۔ ایک اور وجہ جو سب سے اہم ہے یہ کہ میں وکیلوں اور
ڈاکٹروں کے بارے میں کچھ انوکھے خیالات رکھتا ہوں جو میں نے
اپنی کتاب انڈین ہوم رول میں ظاہر کئے ہیں۔ میرے خیال میں سچا
وکیل وہ ہے جو حق اور خدمت کو مقدم سمجھتا ہے اور معاوضے کو مؤخر
جانتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں نے بھی اس نصب العین
کو اختیار کیا ہے یا نہیں۔ لیکن اگر آپ یہ حلف اٹھائیں کہ اپنی قانونی
قابلیت کو ایثار کے جذبے کے ماتحت خدمت میں صرف کریں گے
تو میں سب سے پہلے آپ کے سامنے ہر یہ عقیدت پیش کروں

پشاور سے روانہ ہونے سے پہلے گاندھی جی صوبہ سرحد کے
 وزیروں سے ملے اور وعدے پورے کرنے کے لئے جو انھوں نے
 مختلف اوقات پر کئے تھے، ان کے ساتھ بعض سیاسی اور انتظامی
 معاملات پر گفتگو کی جن کے بارے میں پبلک میں بڑی بحثیں ہو رہی
 تھیں۔ اس گفتگو کے بعض معاملات صاف ہو گئے اور وزارت
 نے گاندھی جی کے ملاحظات کی روشنی میں بعض امور کا قطعی فیصلہ
 کر دیا۔

جنوبی ہند کے ایک اعلیٰ انگریز عہدے دار پشاور میں گاندھی
 جی سے ملنے کے لئے آئے اور انھوں نے ان سے ایک مشکل سوال
 پوچھا "جنوب سے شمال کی طرف آتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا
 ہے کہ بالکل دوسری قسم کے انسان رہتے ہیں۔ یہاں کئے لوگوں
 میں اور جنوب کے لوگوں میں کوئی چیز مشترک معلوم ہی نہیں ہوتی
 کیا یہ دونوں کبھی مل سکتے ہیں؟" گاندھی جی نے جواب دیا کہ ظاہر
 میں یہ اختلاف ضرور ہے لیکن عدم تشدد وہ سنہری پل ہے جو تشدد
 اور جنگ جو پٹھانوں کو جنوبی ہند کے ذہین اور علیم لوگوں سے
 ملاتا ہے۔ وہ خدائی خدمت گار خیموں نے عدم تشدد کا عقیدہ
 اختیار کر لیا ہے اب ہندوستان کے دوسرے حصے کے لوگوں سے
 مختلف نہیں رہے، اگر کچھ فرق ہے تو تشدد سے پاک بہادری کے
 مدارج میں ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں کے میل جول کا مسئلہ ہو

یا کوئی اور پیچیدہ سوال ہو، عدم تشدد کا نقطہ نظر اختیار کرنے
 ہی ساری مشکلات غائب ہو جاتی ہیں۔

ضلع ہزارہ جو دریائے سندھ کے اس پار واقع ہے آخری
 ضلع تھا جس کا گاندھی جی نے دورہ کیا۔ یہ صوبہ سرحد کا انتہائی شمالی
 ضلع ہے اور سارے صوبے میں یہی ایک علاقہ ہے جو دریائے سندھ
 کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ برطانوی علاقے کے ایک سو بیس میل
 لمبی ایک گاؤں دم پٹی ہے جس کے مشرق میں کشمیر کا علاقہ اور مغرب
 میں علاقہ آزاد کی پہاڑیاں ہیں۔

اس ضلع میں داخل ہونے سے پہلے ہر نو میر کو گاندھی جی
 تھوڑی دیر کے لئے بھجوتی علاقہ چچ میں گئے تھے۔ یہ علاقہ اگرچہ
 سیاسی اور جغرافیائی حیثیت سے پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ لیکن زبان
 رسم و رواج اور عادات و خصائل کے لحاظ سے یہاں کے باشندے
 سرحد کے لوگوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ درخواست
 کی کہ ان کے علاقے کے پشتو بولنے والے لوگوں کو صوبہ سرحد
 کی خدائی خدمت گاروں کی تحریک میں شریک ہونے کی اجازت
 دی جائے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا اس میں کوئی دشواری نہیں
 ہے۔ خدائی خدمت گاروں کی ایک انجمن ہے جس کا صدر مقام
 اتان زئی ہے۔ ہر شخص جو ان کے حلف نامے پر دستخط کر دے
 اور پشتو بول سکتا ہو اپنا نام خدائی خدمت گاروں میں لکھا سکتا ہو۔

صرف یہ شرط ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ کسی اور شخص کا ممبر نہ ہو جس لئے آپ لوگوں کو پورا حق ہے کہ خدائی خدمت گاروں میں داخل ہو جائیں اور اس کے لئے کسی خاص اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

بھوتی جلتے ہوئے گاندھی جی کی موٹر کو ایک حادثہ پیش آیا جس میں ایک بچہ گر کر کچھ تھوڑا سا کچل گیا۔ مقامی کانگریسیوں نے جو یاد شاہ خاں کے ساتھ تھے بے تامل اس حادثے کا سارا الزام اپنے مخالفوں پر یا حکومت پر رکھ دیا۔ گاندھی جی کے نزدیک کانگریسی دوستوں کے اس طرح جھٹ پٹ اپنے مخالفوں کو نصیہ کافی وجوہ کے تصور دار ٹھہراتے ہیں تعصب اور تنگ دلی پائی جاتی تھی جو عدم تشدد کے ساتھ نہیں کھیتی تھی۔ گاندھی جی نے کہا "جب محبت کا بیج ہلکے دل میں پھوٹ ائے گا تو ہمارے فساد راسے جھگڑے اور آپس کی توہمیں ایک داستان پارینہ بن جائے گی جب خدائی خدمت گاروں کے دل محبت سے پھر جائیں گے تو ہمیں آزادی مل جائے گی۔ لیکن آندھی ہمیں اس وقت تک نہیں ہوگی جب ہماری محبت روزمرہ کے کاموں میں نہ چھلکے۔"

جب جلسہ ختم ہو گیا تو گاندھی جی نے بادشاہ خاں سے کہا ہم کو یہ چاہئے کہ جہاں یہ حادثہ ہوا تھا وہاں کسی شخص کو بھیج کر بچہ کے مالک کو معاوضہ دیں اور بچہ کے علاج کے لئے سالوٹری کے پاس بے جائیں۔ بادشاہ خاں نے کہا "بے شک" اور فوراً اس کا انتظام کر دیا۔

گاندھی جی ہر نویر کی شام کو ہری پور پہنچے اور راستے میں سکھوں کے مشہور مندر پہنچے صاحب میں گئے۔ جہاں مندر کے منتظموں کی طرف سے ان کو اور بادشاہ خاں کو سراپا دیا گیا، ہری پور میں ویسی ہی گڑ بڑ تھی جیسی ڈیرہ اسماعیل خاں میں ہوئی تھی۔ شہر کے اندر سے گاندھی جی کا جلو نکالا گیا حالانکہ انھوں نے اس کی ممانعت کر دی تھی اور ان سے وعدہ کر لیا گیا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ گاندھی جی کے اسباب کے پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ اس مجمع کی وجہ سے جس نے ان کے میزبان کے گھر کو گھیر رکھا تھا، ہم کو وہاں پہنچنے میں گھنٹے ہو گئے تھے کہ لوگ دروازے کے اندر کھس آئے اور دوسرے دن صبح کے مقررہ وقت سے کئی گھنٹے پہلے گاندھی جی ایسٹ آباد روانہ ہو گئے۔

چھ تاریخ کی شام کو ہری پورہ میں ایک جلسہ ہوا یہاں بھی ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا جس کی طرف گاندھی جی نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا۔ جلسے سے پہلے ایک مقامی ہائی اسکول کے سپرنٹنڈنٹ گاندھی جی کے پاس پہنچا جس میں نرمی سے اس بات کی شکایت کی گئی تھی کہ کانگریس کے مقامی عہدہ داروں نے اسکول کی زمین پر جلسہ کرنے کے لئے ان سے باضابطہ اجازت نہیں لی تھی۔ گاندھی جی نے اپنی تقریر میں کہا کہ مکمل اخلاق اور ضابطے کی پوری پابندی بھی اسی طرح عدم تشدد کے اجزاء ہیں جس طرح اور بڑی بڑی چیزیں جو ان کے سامنے بیان کی گئیں، سائنس داں کہتے ہیں کہ ہم لنگو

کی اولاد وہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن انسان کو خدا نے اسی لئے نہیں بنایا کہ وہ حیوان مطلق کی حیثیت سے زندگی بسر کرے جس نسبت سے وہ عدم تشدد اور رضا کارانہ ضبط کی عادت ڈالتا ہے اسی نسبت سے وہ حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے اور اس درجے پر پہنچتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ عدم تشدد دینے جو ذمہ داریاں ہم پر عاید کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم کمزور سے کمزور آدمی یہاں تک کہ بچے کے حقوق کا بھی احترام کریں۔

سوشلسٹ خیال کی ایک چھوٹی سی جماعت نے ایک چھوٹا سا

نہ گامہ برپا کر دیا انھوں نے بادشاہ خاں کو ایک ایڈریس دیا جو وہ گاندھی جی کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن چونکہ جلسہ شروع ہو چکا تھا اس لئے انھیں اجازت نہیں دی گئی۔ اس پر وہ ناشائستہ نعرے لگاتے ہوئے جلسے سے چلے گئے۔ گاندھی جی نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس بات پر زور دیا کہ عدم تشدد میں ٹکڑی بہت ضروری ہے۔ ہمیں گالیوں کا جواب ٹکڑی سے دینا چاہئے۔ انسانی فطرت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگر ہم غصے یا گالی کا بالکل ٹوٹس نہ لیں تو دوسرا شخص جلد تھک کر خاموش ہو جائے گا۔ ہمیں ان لوگوں کی طرف سے جینھوں نے گڑبڑ مچائی تھی دل میں ناراضگی نہیں رکھنی چاہئے انھوں نے بلا ارادہ ہمیں ٹکڑی کا ایک قابل قدر سبق دیا، سستی گری ہمیشہ دشمن کو امکا فی دوست سمجھتا ہے۔ عدم تشدد کے نصف

۲۴۳

صدی کے تجربے میں میں نے ایک مثال بھی ایسی نہیں دیکھی کہ کامل
عدم تشدد کے مقابلے میں عداوت زیادہ دیر تک باقی رہ
سکی ہو۔

۳۱ نومبر ۱۹۴۵ء

تیرھواں باب

عدم تشدد کی وضاحت

سرحد پار کے اضلاع پشاور، مردان، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے برخلاف ہزارہ کے ضلع میں نہ تو آبادی میں پٹھانوں کا غالب حصہ ہے اور نہ یہاں کے پٹھان اتنے اچڑ ہیں جتنے دوسرے اضلاع کے۔ یہ ضلع مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے بہاڑی خطوں اور ہری پور کی سیراب تحصیل پر مشتمل ہے۔ یہ کم و بیش قدیم ٹیکشا سلا کا علاقہ ہے جو سندھ کے اس پار ایک خوش حال ہندو ریاست تھی اور جس کے دارالسلطنت ٹیکسلا میں وہ مشہور و معروف یونیورسٹی تھی جہاں نہ صرف ہندوستان کے دور دراز مقامات سے بلکہ وسط ایشیا میں صحرائے گوبی کے آگے کے ملکوں تک سے بھی طلباء اُڈے چلے آتے تھے، گاندھی جی کے پروگرام میں یہ بھی شامل تھا کہ تینوں تحصیلوں کے صدر مقامات میں جائیں۔ رنومبر کی صبح کو وہ ہری پور سے مقررہ وقت سے کئی گھنٹہ پہلے روانہ ہو کر ٹیکسا

میں اپنے میربان رائے بہادر پرمانند کے یہاں اچانک پہنچے۔ ایبٹ آباد
 سطح سمندر سے چار ہزار ایک سو دو فٹ بلند ہے۔ اس کے شمال میں
 وادی لگن کے خوش نما مناظر ہیں اور منہرہ کی طرف برف پوش
 پہاڑ کی چوٹیوں کا سلسلہ ہے۔ ایبٹ آباد بڑی دلچسپ جگہ
 ہے لیکن اس کے ساتھ ماضی کی ناخوش گوار یاد دہاں ہے۔
 ہندوستان میں بہت کم مقامات ہوں گے جنہوں نے خلافت کے
 زمانے میں عدم تشدد کے پہلے سبق کی اتنی بھاری قیمت ادا کی ہو جتنی
 ایبٹ آباد نے کی تھی۔ آج بھی اگر کوئی شخص ایک بار اس شہر سے
 گذر جائے تو اس پر یہ تکلیف دہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ دوسرے
 پہاڑی مقامات کی طرح یہاں بھی فوج والوں کے سوا عام شہری دولت
 کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سب اچھی جگہیں فوج کے لئے اور حکمران طبقے
 کے لئے محفوظ ہیں۔ سمجھے یہ بتایا گیا ہے کہ ایک معزز ہندوستانی
 کو اپنے ذاتی بنکے میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس لئے
 اس سے ملے ہوئے دونوں بنکوں میں جو اسی کی ملکیت تھے صاحب
 لوگ کرانے پر رہتے تھے، اور ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی "نینٹو"
 ان کے بیچ میں رہے۔

فقیر بادشاہ خاں کا دل ہمیشہ غریبوں میں پڑا رہتا ہے۔ یہ بات
 ہم پر ایک روز صاف ظاہر ہو گئی، جب وہ صبح تڑکے ہم میں سے
 چند نوجوانوں کو پہاڑ پر چڑھنے کے لئے لے گئے۔ انہوں نے کہا

چلی پہاڑ کی چوٹی سے سورج نکلنا دیکھیں اور یہیں زبردستی صبح کی
 سخت سردی میں کھیسٹتے ہوئے باہرے گئے۔ پہاڑ کی اطراف کا
 منظر جہاڑوں کی تازگی بخش اور شان دار صبح کو دکھائی دیا ایک
 جان فزا منظر تھا۔ وادی کی دھندلی گہرائی سے لے کر پہاڑوں کی
 چوٹی کی درختوں سے ڈھکی ہوئی سرفیلک چوٹیوں تک، کھیتوں کی
 سیڑھیاں اس کی شہادت دے رہی تھیں کہ آخر کار عدم تشدد
 لاکھوں انسانوں کے صبر، محنت اور اتحاد عمل کی شکل میں اس جنگ
 میں فتح حاصل کرتا ہے جو ان پہاڑیوں میں قدرت کی تہی دستی سے
 ہمیشہ سے ہوئی ہے۔ بادشاہ خاں نے ہم کو لے جا کر ان کھیتوں میں
 سے ایک کھیت دکھایا تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہو کہ پہاڑیوں کے پہلو کی
 بنجر پتھریلی زمین کو کاشت کے قابل بنانے میں کس بلا کی محنت کرنی
 پڑتی ہے۔ یہ کشمکش نہایت وقت سے آہستہ آہستہ قدم بہ
 قدم آگے بڑھتی ہے۔ کھیت کی ایک تنگ پٹی سے چٹان کو صرف
 ہاتھ کی قوت سے ہٹانے میں سالہا سال صرف ہو جاتے ہیں اور پھر
 جیسے ہی زمین سے کچھ پیداوار ہونے لگتی ہے حکومت فوراً اگر دکان
 کا مطالبہ کرتی ہے۔ بادشاہ خاں جوش میں چلا اٹھے۔ ”یہ بڑی بے
 انصافی اور سنگ دلی ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہو تو میں اس قسم کے
 کام کے لئے جس میں زمین کو قدرت سے چھیننا پڑتا ہے، امداد دیتا
 بجائے اس کے کہ اس پر محصول لگاؤں۔ یہ ایک شرمناک لوٹہر ہے۔“

کھیت کے بیج میں ایک جھونپڑی کھڑی تھی۔ بادشاہ خان نے
 اصرار کیا کہ ڈاکٹر سوشیلانا راجوہارے ساتھ کھتیں اس جھونپڑی
 میں رہنے والے کسانوں کے خاندان سے ملیں اور علوم کریں کہ ان
 کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے اور جب انھوں نے کھڑی
 دیر بعد واپس آکر یہ بتایا کہ انھوں نے اس خاندان کے ایک مرد
 کو جسے کوئی چھوٹی موٹی بیماری تھی ایک سہل نسخہ بتا دیا تھا تو
 بادشاہ خان بہت خوش ہوئے۔ دورے کے زمانے میں انھوں نے
 بارہا گاندھی جی سے کہا تھا "مہاتاجی مجھے سیاست سے نفرت
 ہے یہ ایک بھول بھلیاں ہے جس میں آدمی بے کار چکر کھاتا رہتا ہے
 میں چاہتا ہوں کہ اس سے بھاگ کر غریب سے غریب لوگوں کے
 گھروں پر جاؤں اور ان کی خدمت کروں" واپسی میں ہم نے دفعتاً
 دیکھا کہ دم غائب ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کو اپنی پسند کا ایک کام مل گیا
 تھا۔ ایک پٹھان لڑکا ایک گدھے پر پیچر لانے ہوئے جا رہا تھا
 گدھے نے ٹھوکر کھائی اور بوجھ اس کی پیٹھ پر سے گر گیا۔ یہ دیکھ کر کہ
 لڑکے کو پیچر لادنے میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ بادشاہ خان
 اس کی مدد کے لئے رک گئے۔ انھوں نے دوسرے ساتھیوں کو بھی
 مدد کرنے کے لئے بلا لیا اور جب اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے
 پہاڑی سے اترنا شروع کیا لیان کے دل میں اس بات کی تسلی تھی کہ
 انھوں نے دن کا آغاز اس طرح کیا جیسا ایک خدائی خدمت گار کو

زیب دیتا ہے۔

ایٹ آباد کے قیام میں جتنے اہم کام تھے وہ سب دوسرے دن کے پروگرام میں جمع ہو گئے تھے۔ مانسہرہ میں اٹھ تاریخ کو ایک جلسہ تھا جس میں گاندھی جی کی خدمت میں ایک ایڈریس قصبے کے باشندوں کی طرف سے اور ایک وہاں کی کسان کمیٹی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا آخر انہوں نے گاندھی جی کو اس طرف توجہ دلائی کہ مانسہرہ تحصیل کے بعض حصوں میں نظام مال گزاری کے بعض تکلیف وہ دنیا نوی طریقے رائج ہیں اور ان کی منسوخی کی درخواست کی۔ مثلاً موروثی کاشتکاروں کو ۱۱ روپے میں چار اُنے سے لے کر بارہ اُنے تک لگان کے علاوہ مالکانہ کے نام سے زمیندار کو دینا پڑتا ہے۔ ۱۱ سال میں کچھ دن بغیر کسی اجرت کے بیگار کرنی پڑتی ہے لیکن بیگار یوں کی تعداد کھیت کے رقبے کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ اس پر موقوف ہے کہ وہ کتنے آدمیوں میں تقسیم ہوا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ چالیس کنال کا ایک کھیت ہے اور اس پر پانچ بے گاری دینے پڑتے ہیں۔ اب اگر زمیندار کے مرنے کے بعد اس کے پانچ بیٹوں میں تقسیم ہو جائے تو ان میں سے ہر ایک کسان سے پانچ بیگاری مانگے گا۔ اس زمین ساری کی ساری ورثے میں لڑکوں کو ملتی ہے۔ لڑکیاں بالکل محروم رکھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایڈریس میں کئی ابواب اور ناجائز رقموں

ادراں دھوکوں اور زیادتیوں کا ذکر تھا جو زمیندار کی طرف سے کاشتکاروں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان بیانات کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ اگر ان کا ایک حصہ بھی صحیح ہے تو یہ ایک شرمناک ظلم ہے جسے فوراً ختم کر دینا چاہیے خصوصاً ایسے زمانے میں جب حکومت کانگریسی و دربار کے ہاتھ میں ہے۔

مانسہرہ کے عام باشندوں کی طرف سے بھڑاٹ پٹیس دیا گیا وہ ان تمام ایڈریسوں میں جو سارے دورے میں گاندھی جی کی خدمت میں پیش کئے گئے سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ بھڑاٹ جی نے اس کے جواب میں لوگوں کو یقین دلایا کہ آپ نے عدم تشدد کے میدان میں جو کچھ کر دکھایا ہے، اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں لیکن میں اس پرانی مثل کا قائل ہوں کہ جو دیتا ہے اس سے اور زیادہ مانگا جاتا ہے۔ میں آپ کو قتلے دیتا ہوں کہ میں اس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک آپ اپنے عدم تشدد کے ذریعے نہ صرف اپنی بلکہ ہندوستان کی آزادی نہ حاصل کر لیں۔ میں آپ کے صوبے میں دو بارہ آیا ہوں تاکہ آپ سے اور اچھی طرح واقف ہو جاؤں اور یہ دیکھ لوں کہ آپ کے ہاں عدم تشدد کس طرح برتا جاتا ہے اور میرا ارادہ تیسری بار آنے کا بھی ہے اور اس وقت میں ان مسئلوں کو جو بیچ میں چھوٹ گئے ہیں پھر سے اٹھاؤں گا۔

اس سے پہلے خدائی خدمت گاروں کے افسروں کو مخاطب

کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا :- آپ لوگوں نے مجھے ابھی بتایا ہی کہ اپنے ہمیشہ کے لئے تشدد کی جگہ عدم تشدد اختیار کر لیا ہے۔ کل اس بارے میں بات چیت کرتے ہوئے میرے منہ سے نکل گیا کہ ہمیں عدم تشدد کی جگہ محبت لفظ استعمال کرنا چاہیے یعنی آج تک جو کام تشدد سے کیا جاتا ہے وہ ہمیں اب محبت سے کرنا ہو اس کے یہ معنی ہو جاتے ہیں کہ جیسے ہم دشمن سمجھتے تھے اس کے متعلق دشمنی کا خیال بالکل دل سے نکل جانا چاہئے۔ مگر صرف اتنا ہی کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کی جگہ کون سی چیز لے گی۔ آج دنیا میں لاکھوں آدمیوں کے پاس لاکھی نہیں۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عدم تشدد کے پابند ہیں۔ عدم تشدد تو تپ و جود میں آتا ہے جب ہم محبت میں وہ طاقت پیدا کر لیں جو لاکھی میں تھی۔ یا تو ہماری سب طاقت نازل ہو جاتی ہے اور ہم کسی کام کے نہیں رہتے یا ڈرپوک بن جاتے ہیں اور اس طرح اپنی انسانیت ہی کھیر بیٹھتے ہیں۔

آج کل یہ کہنے کا رواج ہو گیا ہے کہ دنیا کا کاروبار تو تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دئے بغیر نہیں چلتا۔ میری رائے میں یہ بات ٹھیک نہیں ایک بچہ اپنے تھپڑ کا جواب تھپڑ سے نہیں دیتا۔ وہ اپنے باپ کا حکم مانتا ہے۔ مگر اس کے تھپڑ کے ڈر سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تھپڑ مارنے پر بھی اسے اس کی محبت نے مجبور کیا ہے اور وہ اس محبت کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا۔

میرا یہ دعوئے ہے کہ دنیا کا کاروبار اسی طاقت کے سہارے پر چلتا ہے اور چلایا جاسکتا ہے۔ دنیا کو خاندان کا ایک وسیع ترین نمونہ سمجھنا چاہئے۔ جو قانون خاندان پر عام ہوتا ہے وہ دنیا پر بھی ہوتا ہے۔ باقی یہ تو ہم ہی نے دنیا کو باہم مخالف گروہوں میں بانٹ کر دوست دشمن کی تمیز پیدا کر دی ہے۔ مگر اس کے باوجود دنیا چلتی تو محبت کی طاقت سے ہی ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ یہاں کے خدائی خدمت گار محض نام ہی نام کے ہیں۔ ان کا کچھ بھروسہ نہیں۔ آج سرخ پوش بن جاتے ہیں اور کل دوسرا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو میرا آپ سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ الزام چھوٹا ہوگا۔ اگر آپ میں سچائی نہیں جو کچھ آپ کرتے ہیں وہ سچے دل سے نہیں کرتے تو آپ کی سرخ و روی کس کام کی۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ خاں کو اس بات نے کافی پریشان کر رکھا ہے کہ آپ کی جماعت میں کئی نالائق اور مطلبی آدمی گھس آئے ہیں مجھے بھی اس سے پریشانی ہوئی ہے۔ میں بادشاہ خاں کی رائے سے بالکل متفق ہوں کہ اگر ہمارے آدمی سچے نہیں ہیں تو صرف تعداد بڑھانے سے ہماری طاقت بجائے بڑھنے کے گھٹے گی۔ خدائی خدمت گاروں کی تحریک کا کام ہندوستان بھر میں اور اس کے باہر بھی دور دور مشہور ہو چکا ہے۔ آپ نے عدم تشدد کو جہاں تک

سمجھا ہے وہاں تک تو اس پر عمل کر لیا ہے۔ مگر اس کے اندر ابھی اور بہت کچھ ہے، اور وہ بہت بڑی چیز ہے۔ بادشاہ خان لہٹین ولایت ہیں اور میں اُسے مانتا ہوں کہ آپ عدم تشدد کا پورا پورا مطالب سمجھنے اور اس پر مکمل طور پر عمل کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کو بہت سے ہمارے کانٹے اور وادیاں عبور کرنی ہیں۔ عدم تشدد کا جو تعمیری پروگرام آپ کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اس پر اگر ہم ایک بار ٹھیک طور پر عمل شروع کر دیں تو پھر آگے گا آپ کا راستہ خود بخود نکل آئے گا۔ اس سے آپ کی سچائی اور شوق کا بھی پتہ چل جائے گا۔ سہ پہر کو ایسٹ آباد واپس آ کر گاندھی جی مقامی ہرچین مندر میں گئے اور انھیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کم سے کم ایسٹ آباد میں ہرچینوں پر اپنے بچوں کو مدرسے میں داخل کرانے یا کنوینس سے پانی بھرنے وغیرہ میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ گریٹر گرلز اسکولوں میں بھی گئے جو ان خاتون کے خلیص اور محبت کا نتیجہ ہے، جن کے گھر ہم ایسٹ آباد میں ٹھہرے تھے۔

سہ پہر کو اقلیتوں کا ایک وفد گاندھی جی کے پاس آیا تاکہ ان مشکلوں کے بارے میں گفتگو کرے جن کا سامنا اقلیتوں کو صوبہ سرحد میں کرنا پڑتا ہے۔ سب سے زیادہ پریشانی ان کو یہ تھی کہ جب سے سرحد کا علیحدہ صوبہ بنا ہے تشدد کے جرائم

کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ اُن کی تجربہ یہ تھی کہ بد امنی کے روز افزوں خطرے کو دیکھتے ہوئے ان اقلیتوں کو جو سرحدی علاقے میں آباد ہیں بلا معاوضہ ہتھیار دئے جائیں اور ان کا استعمال سکھایا جائے تاکہ ان کو اپنی حفاظت میں آسانی ہو۔ لیکن انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ سرحد پار کی بد امنی کا مسئلہ قطعی اور مکمل طور پر صرف اسی طرح حل ہو سکتا ہے کہ اس جماعت کو جس کی اکثریت ہے فلیٹ کی دستگیری کے فرض کا احساس دلایا جائے۔ گاناڑھی جمی نے جواب میں فرمایا کہ میں آپ کے مطالبے کی تائید کر سکتا ہوں کہ اسلحہ کے لئے بے تکلف لائسنس تقسیم کئے جائیں لیکن حکومت سے یہ توقع کرنا بے جا ہوگا کہ وہ سرحد کے قریب رہنے والے سب لوگوں کو مفت ہتھیار بانٹے۔ اگر آپ چاہیں تو مفت میں ہتھیار بانٹنے کے لئے چندہ جمع کر سکتے ہیں، لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ بلا معاوضہ ہتھیار بانٹنے اور ان کا استعمال سکھانے سے سرحد پار کی بد امنی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اگر اس تجربے کو جو حال میں بنوں کے چھاپے میں ہوا ہے پیش نظر رکھا جائے تو اس طرح کی کارروائی محض فضول خرچی ہوگی مجھے بتایا گیا ہے کہ بنوں کے حملے کے وقت شہریوں کی طرف سے صرف ایک بندوق استعمال کی گئی حالانکہ شہر میں بندوقوں کی کمی نہ تھی اور اس ایک بندوق سے بھی چھاپہ مارنے والوں سے زیادہ پبلک کو نقصان پہنچا۔ البتہ آپ نے

اکثریت کے فرض کے متعلق جو کچھ کہا اُس سے مجھے اتفاق ہے۔ بادشاہ
خاں خدائی خدمت گاروں کو اس کے لئے تیار کر رہے ہیں کہ شہریوں
کو ان چھاپوں سے محفوظ رکھنے کا فرض انجام دے سکیں۔ وفد کے
ارکان نے گاندھی جی سے چند اور امور کے متعلق بات چیت کی
گاندھی جی نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور غالباً ان کے ساتھ
بالیرا چندر پرشاد کوورکنگ کمیٹی نے صوبہ سرحد میں آنے کی
ہدایت کی ہے۔ آپ ان سے ان چیزوں کے متعلق گفتگو کیجئے گا۔

صوبہ سرحد میں اقلیتوں کی جو حیثیت ہے یہاں اس کے متعلق
چند باتیں کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس صوبے کی کل آبادی ۷۷ لاکھ
ہے جس میں سے ۲۲ لاکھ مسلمان ہیں ۵۵ لاکھ سہندو ہیں ،
۴۰ لاکھ ہزار سکھ ہیں۔ ۴۷ لاکھ ہزار عیسائی ، ۶۲ پارسی ۱۱
یہودی اور ۳ بلوچ ہیں۔ فی صدی کے حساب سے مسلمانوں کی
آبادی ضلع ہزارہ میں ۹۰ فی صدی سے لے کر ڈیرہ اسماعیل خان
میں ۸۶ فی صدی تک ہے۔ لین دین اور تجارت اب تک عموماً
مہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ پہلے وہ تعلیم میں
مسلمانوں سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے ملازمتوں میں
بھی ان کا حصہ اپنی تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ کچھ عرصے
سے انھیں مسلمانوں کے مقابلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور مقابلے کی
وجہ سے آپس میں مخالفت پیدا ہو گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے

کہ جو لوگ کامیاب ہیں انہیں اپنی کامیابی کا تاوان اور بھی زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک کامیاب رائے بہادر جس نے فوجی ٹھیکوں سے بہت بڑی دولت جمع کر لی ہے، قدرتی طور پر سرحد پار کے وزیر بری اور محسور قبائل کی لالچ کو بھڑکاتا ہے اور یہ لوگ اپنی غارتگری کے جذبے کو جائز ثابت کرنے کے لئے رائے بہادر پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اس فوجی مشین کو تیار کرنے میں بالواسطہ مدد دیتا ہے جو ان کو کھلنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مسلمان سیاسی کارکنوں کو خواہ وہ کانگریسی ہوں یا غیر کانگریسی اس سے یہ شکایت ہے کہ اگرچہ اس نے اپنی ساری دولت اسی صوبے میں پیدا کی ہے اور اقلیت کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی حفاظت کا اور خاص مراعات کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن اس کو صرف حکومت کی نظر عنایت حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے۔ وہ کبھی صوبے کی ترقی کے کسی کام میں مدد پے سے یا ہاتھ پاؤں سے مدد نہیں کرتا۔ اقلیت میں ذہانت اور قابلیت کے ساتھ ساتھ ایثار اور خدمت کی روح نہ ہو تو یہ اس کے پاؤں میں زنجیر ہو کر رہ جائیں گی۔ اگر وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کو اس صوبے کی خدمت میں صرف کریں جس کو انھوں نے اپنا وطن بنایا ہے تو اکثریت بہت جلد انھیں محبت اور قدر کی نظر سے دیکھنے لگے گی۔ لیکن اگر وہ ان چیزوں کو جاہ و منصب حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے تو لوگوں کے دل میں مخالفت کا

جذبہ بھڑکانے کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہو گا۔

ایک جگہ یہ شکایت کی گئی کہ ہندو اور سکھ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑنے سے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسے مذہب کے حقیقی جذبے کے مسخ ہو جانے کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ دوسروں کے مذہب کا اسی طرح احترام کرنا جیسے ہم اپنے مذہب کا کرتے ہیں، ایک ایسا فرض ہے جسے ہم ہر وقت اور ہر جگہ عطا ہوتا ہے۔ مگر جہاں ایک چھوٹی سی اقلیت دوسرے مذہب والوں کی بہت بڑی اکثریت کے بیچ میں رہتی ہو، وہاں تو اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ لیکن اگر اقلیت مجبور ہو کر ایسا کرتی ہے تو اکثریت کی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ دل سے اقلیتوں کے جذبات اور عقائد کا احترام کرے۔

جس چیز سے گاندھی جی کو دلی خوشی ہوئی وہ یہ تھی کہ سارے دوسرے میں موجودہ وزارت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کرنے والوں نے بھی خان عبدالغفار خاں یا اُن کے بھائیوں پر نہ سب کا تعصب کا الزام نہیں لگایا اور ان کے خلوص میں شبہ نہیں کیا۔

”آئین ساز مجلس کے اندر بھی اور باہر بھی ایک متفقہ پروگرام کی بنیاد پر جو نئی ریاست کی سلامتی استحکام اور فلاح و بہبود کے لئے بنایا جائے“

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ جب تک اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ ہو اس پارٹی کی پالیسی یہ ہوگی کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کا ساتھ دے۔ بہت جلد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ پاکستان کی حکومت نئی عوامی پارٹی کے قیام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ صوبہ سرحد کے وزیراعظم خان عبدالغفور خان نے سرخ پوشوں کے لیڈر خان عبدالغفار خان کو ایک ایسا دشمن قرار دیا جو پاکستان کی حکومت کی جڑ کھودنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ اور اس حلف و فاداری کے متعلق جو انھوں نے اور ان کی پارٹی نے اٹھایا تھا یہ کہا کہ ”یہ ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں“ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ معنی خیز جملہ کہا ”جب کبھی ہم اپنے امن پسند شہریوں کی بھلائی کے لئے مناسب سمجھیں گے۔ ضروری تدبیریں اختیار کریں گے“

باو شاہ خاں پر انتشار پیدا کرنے کا الزام لگایا گیا مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ میں بہت سوچتا ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے ارباب اختیار کدھر جا رہے ہیں۔ وہ اسلام کا نام لے کر ریاست کے قوت اور استحکام کی اپیل کرتے ہیں لیکن اسی کے

ساتھ وہ ان لوگوں سے جو پاکستان کی ہمت اور خوش حالی کے بنیادی مسئلے میں ان سے متفق ہیں لیکن اس کے طریقے کے بارے میں ایمان داری کے ساتھ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تنگ دلی اور تنگ نظری سے پیش آتے ہیں۔

ہمارے ہمسایہ ڈومینین ہندوستان میں تقسیم سے پہلے ہندو جہاں سبھا اور ڈاکٹر امبیڈکر کا اچھوتوں کا فیڈریشن برابر ہر قدم پر کانگریس کی مخالفت کرتا تھا۔ لیکن جیسے ہی ہندوستان آزاد ہوا سب مخالف پارٹیاں مل گئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر شیاما پریو مکرجی اور امبیڈکر اب نیٹ نہرو اور سرواڑی پٹیل کے رفیق کار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی جماعتوں کو کانگریس پارٹی میں ضم نہیں کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے وہ بہت افسوسناک ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں کو بلکہ خود قوم کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ میں نے بارہا ان بیانات میں جو اخباروں کو دئے جو ان تقریروں میں جو مجمع عام میں کیں پاکستان کی وفاداری کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں باہم تفریق کی جاتی ہے اور میری پارٹی کے لوگوں کے ساتھ مخالفت بلکہ دشمنی کا برتاؤ ہو رہا ہے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا :- ہم آپ کے نظم و نسق میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ ہم کو حکومت کی ہوس نہیں۔ وزارت آپ کو

مبارک ہو ، ہم تو صرف اس کی اجازت چاہتے ہیں کہ اپنے تعمیری طریقے سے اپنے بھائیوں کی خدمت کر سکیں ۔ مگر اس پر بھی وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے ۛ

..... بادشاہ خاں صوبہ سرحد میں واپس آئے تاکہ نئی جمعیتہ العوام کا پروگرام اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ انھوں نے ضلع مردان میں ایک بہت بڑے جلسے کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا " میں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا تاشادیکھ لیا۔ پاکستان کے لیڈروں میں اور پرانے انگریز حکام میں کوئی مطلق فرق نہیں ہے۔ اس حکومت کی حمایت میں جو دلیل نظام سب سے زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے اور عموماً پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نئی ریاست ابھی ایک نوزائیدہ بچہ ہے میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کو دیکھو جس کے لیڈروں نے سخت طوفان کے باوجود ریاست کی کشتی کو کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے اپنا نیا آئین بنا لیا ہے۔ درآن حالیکہ پاکستان میں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا ہے " ۛ

اس سے ہم صرف یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ لیڈر جمہوری نظام سے ڈرتے ہیں۔ یہ لیڈر جنھیں اپنے اپنے فائدے کی فکر ہے۔ پاکستان کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں، افسوس کی بات ہے کہ یہ سب مجاہدین ہیں اور پاکستان کے

اصلی باشندے نہیں ہیں۔

میں اس موقع پر تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی یا قرآنی قانون جس کے لئے تم اتنے دن سے چلا رہے ہو، اور جس کی خاطر تم نے اور تمہارے عزیزوں نے اپنی جانیں قربان کی ہیں، پاکستان میں کبھی نافذ نہیں ہوں گے۔

انھوں نے اپنی تقریر کو ان پر زور الفاظ پر ختم کیا "میرے افغان بھائیو! میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم پاکستان کی ریاست میں حصہ دار ہو، اس کا چوتھا حصہ تمہارا حق ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم مل کر اٹھ کھڑے ہو، اور یہ عہد کرو کہ اپنا حق لے کر رہیں گے۔ تم متحد ہو جاؤ اور مضبوط ارادے سے کام لے کر ان ریت کی دیواروں کو گرا دو جو پاکستان کے لیڈروں نے تمہارے گرد کھڑی کر دی ہیں۔ ہم موجودہ صورت حال کو اب برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنی کمریں کس لو اور اپنی منزل کی طرف بڑھے چلو۔ تمہاری منزل ان پٹھانوں کی آزادی ہے۔ جنہوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ ہم اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک پٹھانستان یعنی پٹھانوں کی حکومت پٹھانوں کے ذریعے سے اور پٹھانوں کے لئے قائم نہ کر لیں۔"

تین دن بعد وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے بیٹے عبدالولی خاں اور دو اور سرخ پوش لیڈر بھی پکڑ لئے گئے۔

بندہ داؤ شاہ کے چھوٹے سے کچے ڈاک بنگلے میں جو بنوں کی بڑی سڑک پر واقع ہے۔ اُن کے مقدمے کی سرسری تحقیقات ہوئی۔ اُن پر "بغاوت" کا اور پاکستان کے دشمن فقیر ایسی کے ساتھ تعاون کا ارادہ رکھنے" کا الزام لگایا گیا۔ کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے جس کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تھا اُن سے کہا کہ اپنی صفائی پیش کریں۔ انھوں نے ارتکابِ جرم سے انکار کیا۔ مگر اس کے سوا اور کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ اس پر مجسٹریٹ نے پوچھا کہ کیا آپ صوبہ سرحد کے ضابطہ فوجداری دفعہ ۱۴۰ کے مطابق تین سال کے لئے نیک چلنی کا مچلکہ دینے پر تیار ہیں۔ بادشاہ خان نے جواب دیا کہ "میں نے ایسے مچلکے نہ کبھی دئے ہیں اور نہ اب دوں گا۔" چنانچہ انھیں تین سال کی قید یا مشقت جو اس جرم کی کم سے کم سزا ہے دی گئی۔

بادشاہ خان کی گرفتاری کے فوراً بعد صوبہ سرحد کی حکومت نے اپنے اس اقدام کی توجیہ کے لئے ایک کمیونکے شائع کیا جس میں کہا گیا کہ باوجود اس کے کہ ہندوستان کی تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی رضامندی سے ہوئی، عبدالغفار خاں پاکستان کے قیام کے قطعاً مخالف ہیں "یہ بات صحیح نہیں تھی۔ عبدالغفار خاں ستمبر ہی میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ وہ پاکستان کو قبول کرتے ہیں البتہ وہ یہ چاہتے تھے کہ پشتو بولنے والے لوگوں کو اپنے وطن

میں جس کا نام انھوں نے پشمانستان رکھا، وہی حیثیت اور حقوق حاصل ہوں جو سندھیوں کو سندھ میں، پنجابیوں کو پنجاب میں اور بنگالیوں کو بنگال میں ہیں۔ بہر حال اس کمیونٹے میں یہ لکھا تھا "انھوں نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا کہ ۱۵ اگست کے جشن آزادی میں شرکت نہ کریں" اور پاکستان کی نئی ریاست کا حلف و فاداری نہ اٹھائیں۔ اسی لئے ان کے بھائی کی وزارت جو ان دنوں برسر حکومت تھی، پاکستان سے غدارمی کی بنا پر برخاست کر دی گئی تھی۔" ظاہر ہے کہ یہ الزام اسی وقت غلط ثابت ہو گیا جب بادشاہ خاں نے کراچی میں حلف و فاداری اٹھایا، اور صاف صاف الفاظ میں پاکستان کی ریاست سے سچی وفاداری کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو الزام ان پر لگایا گیا اُسے ان کے بھائی کی وزارت سے "جو ان دنوں برسر حکومت تھی" کیا تعلق ہے؟ کیا یہ وہی چرانا قصہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بھڑیے نے میمنے پر یہ الزام لگا کر کہ وہ اس کا پانی گدلا کر رہا ہے اُسے ہڑپ کر لیا تھا۔ اس کے بعد کمیونٹے میں یہ الفاظ تھے "اسی کے ساتھ انھوں نے نام نہاد جمعیت العوام کو قائم کر کے اپنے دائرہ عمل کو وسیع کر لیا" کوئی پوچھے کہ یہ کون سا جرم تھا اور پاکستان کے پرانے کانگریسی عناصر کیا کٹھا کر لیا۔ ظاہر ہے جسے سزا دینا ہو، اس پر کچھ الزام تو لگانا ہی چاہئے۔ "دوسری بار کراچی جانے کے بعد..... بادشاہ خاں

نے سوچ سمجھ کر اور پورا انتظام کر کے صوبے میں شور شرک کرنے کی
 کوشش کی۔ عین اس وقت جب ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت
 کچھ اشتہار دیا گیا تھا، صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی۔ اگر کوئی کسی
 سازش تھی کہ بادشاہ خاں کی مفروضہ جد و جہاں اسی وقت شروع ہو
 جب ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت کچھ اشتہار دیا گیا تھا،
 صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی۔ ”در اصل یہ حملہ کمیونٹیکس مصنف
 کے ذہن کی پیداوار تھی) تو پاکستان کی حکومت بھی اسی سازش
 میں ضرور شریک رہی ہوگی، تبھی تو اس نے آئین ساز اسمبلی کا جس میں
 بادشاہ خاں جلف و فاداری اٹھانے کے لئے گئے تھے ٹائم ٹیل
 ایسا بنایا کہ وہ اس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ٹھیک وقت پر
 اپنے صوبے میں پہنچ سکیں۔ ”گڑھی حبیب اللہ کی ہم یاری“ جو ہندوستان
 کی ہوائی فوج نے کھڑکی وجہ سے غلطی سے کر دی تھی اور جس کے نتیجے
 میں ہندوستان کی حکومت نے فوراً علانیہ معافی مانگی تھی۔ ”بادشاہ خاں
 کو اور کسایا“ دیکھ اس شخص کا ذکر ہے جس نے حال ہی میں گراچی میں کہا
 تھا کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد سے وہ پاکستان کے فائدے
 کو اپنا فائدہ اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا ہے۔“ اور
 وہ گاؤں گاؤں بھر کر لوگوں سے کہنے لگے کہ پاکستان ایک ریل کے
 پل کی طرح ہے جو ایک ہی دھکے میں بیٹھ جائے گا۔ ”یہ بات ان کے
 الفاظ کو زبردستی توڑ مروڑ کر کہی گئی۔ حقیقت میں انہوں نے“

کہا تھا کہ سچانوں کو متحد ہو کر ان ریت کی دیواروں کو گرا دینا چاہئے
 جو پاکستان کے لیڈروں نے ان کے گرد کھڑی کر دی ہیں۔ تاکہ ان کے
 حقوق کو محدود کر دیں۔ کمیونٹیکے کے آخری الفاظ یہ تھے "اپنی تقریروں
 میں جو وہ آخری سے کر رہے ہیں وہ نہ صرف حکام کو برا بھلا کہتے ہیں
 بلکہ لوگوں کو واقعی افسوس رہے ہیں کہ اس حکومت کے خلاف جو جائز
 طور پر قائم ہوئی ہے شورش برپا کریں۔ اب آپ ان الفاظ کا مقابلہ
 بادشاہ خاں کے اس بیان سے کیجئے جو انھوں نے صاف دلی سے ۶ مئی
 ۱۹۷۷ء کو یعنی اپنی گرفتاری سے ایک مہینے پہلے دیا تھا "مجھے مجبوراً
 یہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اس اپیل کے جو میں نے حال میں اپنے مخالف
 پارٹی کے دوستوں سے اخباروں اور تقریروں کے ذریعے سے کی تھی
 انھوں نے جمعیتہ المسلمان کے قیام کو سہروردی کی نظر سے نہیں دیکھا
 بلکہ وہ میری پارٹی والوں کی نیت پر بار بار شبہ کا اظہار کر رہے
 ہیں۔ محض اس لئے کہ وہ ایک زمین میں منہرستان کی نیشنل
 کانگریس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات اس وجہ سے اور بھی زیادہ
 افسوس ناک ہے کہ اس جمعیت نے اپنے خاص رزولوشن میں جب
 وطن کے جذبے کے ساتھ غیر مشروط طور پر حکومت کی طرف دوستی کا
 ہاتھ بڑھایا تھا۔ ہمارے حریفوں کے نزدیک ریاست سے وفاداری
 کا معیار یہ ہے کہ ایک پارٹی کی حکومت کے سامنے بے چون و چرا سر
 جھکا دیا جائے "دنیا سے یہ توقع کرنا بے جا ہے کہ وہ اس بات کو

مان لے گی کہ وہ شخص جس کو ساری عمر اپنی قوم کو تشدد سے باز رکھنے کی لگن رہی جو اسے اُن کے لئے مسلک سمجھتا تھا جس نے خوفناک پٹھانوں کو عدم تشدد کا پابند بنا کر دنیا کو حیران کر دیا جس کے خلوص اور سچائی کی گماندہی جی نے اچھی طرح جانچ کرنے کے بعد شہادت دی تھی۔ اس جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ ہزار بار خالص عدم تشدد کا اور پاکستان کی وفاداری کا دعوے کرنے اور مجمع عام میں اس کی خیر خواہی کا اعتراف کرنے کے بعد ایک دم سے اپنے عقیدے سے پھر جائے گا اور ان اصولوں کو جن کا وہ عمر بھر پابند رہا چھوڑ دے گا راقم الحروف جسے بادشاہ خاں کی دوستی اور ہم طعامی کا فخر حاصل ہے اور جو گاندھی جی کے زیر سایہ اُن کے گھر میں خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے رہ چکا ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ آج ہندوستان یا پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بادشاہ خاں کی طرح گاندھی جی کے حق اور عدم تشدد کے اصولوں کا اور اُن کی گہری روحانیت کا مجسمہ ہو جو ان کی طرح خدا پر عقیدہ رکھتا ہو اس کی مرضی کے سامنے تسلیم خم کرتا ہو اور اس کے بندوں کی دل و جان سے خدمت کرتا ہو۔

اب نہاد یوڈیسیائی نے جو گاندھی جی اور بادشاہ خاں دونوں کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے جتنا کوئی اور نہیں جانتا ہوگا، لکھا تھا "مجھے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو پاکبازی اور زہد و تقویٰ اور اسی کے ساتھ رقت قلب اور خدا پر سچا عقیدہ رکھنے میں بادشاہ خاں سے بڑھ کر بلکہ ان کے برابر بھی ہو۔"

"وہ خدائی خدمت گار" از نہاد یوڈیسیائی

خان بھائیوں کی مسلسل اسیری مہذب دنیا کے ضمیر کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اگر بے گناہوں کی جنموں نے اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ قربانی کی مثال دیکھنی ہو تو ان ذلیل بھائیوں کو خصوصاً بادشاہ خاں کو دیکھئے۔ ان کے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی کا جذبہ نہیں بادشاہ خاں کی کوئی ذاتی غرض نہیں، کوئی شخصی حوصلہ نہیں "میں ساری عمر ایک سپاہی رہا ہوں اور مرتے وقت تک سپاہی رہنا چاہتا ہوں" ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں کانگریس کا صدر بننے سے انکار کیا تھا۔ انھوں نے اپنی خوشی سے ضبط نفس کے لئے ہر طرح کی جسمانی تکلیفیں اٹھانے کی عادت ڈالی۔ سفر کے زمانے میں وہ اپنا سلطان خود اٹھاتے تھے اور تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملنے کے لئے بورسہ آئے تو ان کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا تھا "جب فاصلہ اتنا ہو جیسے وہ پیدل طے کر سکیں تو کبھی سواری استعمال نہیں کرنے، لیکن جب اس کے بغیر کام نہ چل سکے تو وہ بے بسی سواری ڈھونڈتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے تعیشات سے پرہیز کرتے ہیں اور نہایت سادی غذا استعمال کرتے ہیں۔ انھیں لوگوں کی اطاعت اور سچی وفاداری حاصل ہے۔ اس لئے کہ وہ خود ان صفات کا مجسمہ ہے۔"

خان بھائیوں کو پاکستان کی حکومت سے جو اختلاف بھی ہو

مگر ان کی دیانت داری شبہ سے بالاتر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تقسیم کے بعد جب میں آخری مرتبہ گاندھی جی کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۷ء اور جنوری ۱۹۴۸ء میں ٹھہرا تھا تو بادشاہ خاں نے گاندھی جی کو یہ پیام بھیجا تھا کہ آپ میری طرف سے یا ڈاکٹر خان صاحب کی طرف سے کوئی فکر نہ کیجئے۔ ہم آپ سے ملنے یا آپ کو خط لکھنے سے خاص کر کے پرہیز کرتے ہیں تاکہ پاکستان کے ساتھ ہماری وفاداری کے بارے میں کوئی شبہ نہ کیا جاسکے۔ ان دونوں کے ساتھ یہ بڑا ظلم ہوگا کہ ان پر دھوکے یا دوغلے پن کا شبہ کیا جائے۔ وہ اس قسم کی حرکتیں کر ہی نہیں سکتے۔ انھیں اپنے ملک سے اور اپنی قوم سے گہری اور دالہا نہ محبت ہے۔ بادشاہ خاں فطری طور پر سیدھے سادے اور کھڑے واقع ہوئے ہیں اور کبھی کبھی ایسے بھولے پن کی بات کرتے ہیں کہ دوسرا آدمی گھبرا جاتا ہے۔ ایسا شخص کبھی اس پست کا دشمن نہیں ہو سکتا جو اپنے آپ کو اسلامی ریاست کہتی ہے۔

خان بھائی اس مٹی کے بنے ہیں جس سے ہیر و اور شہید بنتے

ہیں۔ وہ اس مقصد کی خاطر جس کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی گزار دی، خوشی سے جان دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ مجھے پوری طرح یقین ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ جب تک وہ مجھ سے جیل کے باہر کام لینا چاہتا تھا اس نے مجھے جیل سے باہر رکھا۔ اب اس کی مرضی یہ ہے کہ میں اندر رہ کر کام کروں میں اسی میں

خوش ہو جو اس کی خوشی ہو، یہ الفاظ بادشاہ خاں نے اس وقت کہے تھے جب وہ وار دھارے اس زمانے کی بھی حکومت کے حکم سے گرفتار کر کے بے جائے گئے تھے اور انھیں تین سال کی قید سخت کی سزا دی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی وہ یہی الفاظ دہراتے ہوں گے۔ اس لئے وہ جہاں ہیں اچھے ہیں۔ لیکن انصاف سے کہئے کہ کیا اے خدائی خدمت گاروں سے اس سے بہتر کام نہیں لیا جاسکتا تھا کہ انھیں جیل کی دیواروں کے اندر زندہ دفن کر دیا جائے کاش آج ہندوستان کا کوئی خدمت کرنے والا بادشاہ خاں کی طرح با خدا بے نفس، حق شناس اور سچی تنقید کرنے والا ہوتا جو حکومت کو تنبیہ کرتا رہتا اور اُسے سیدھے راستے پر چلاتا جو ان کی سی کھری سیرت، بے لاگ دیانت رکھتا اور جسے حضرت مسیح کی طرح غریبوں اور بے کسوں سے محبت اور مہم دردی ہوتی اور جو اپنی زندگی کے ہر سانس کو ان کی آزادی اور خدمت کے لئے وقف کر دیتا۔ اگر دونوں ملکوں میں ایسے دو آدمی ہوتے تو یہ ان دونوں بلکہ شاید سارے ایشیا اور پوری دنیا کے لئے امن اور سلامتی کی بہترین ضمانت ہوتی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بادشاہ خاں میں کوئی خامی یا کمزوری نہیں ہے۔ کون انسان اس سے خالی ہے؟ ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ انگریزوں کی بات پر شبہ کرتے ہیں۔

حساس ہیں اور کبھی کبھی اُن کے مزاج میں چڑچڑاہٹ آ جاتا ہے۔ وہ صاف گو اور منہ بھٹ ہیں، اور جب کبھی انھیں غصہ آ جاتا ہے تو اُن کے منہ سے گرم لاوا کی طرح الفاظ ابلنے لگتے ہیں اور حسنے دلے کی روح کے اندر جھوٹ کی کھیتی جل جاتی ہے۔ لیکن اُن کے غصے میں عداوت نہیں ہوتی۔ انھیں غصہ برائی پر آتا ہے۔ برے آدمی پر نہیں آتا۔ پھر بھی ستیہ گرہ کے نقطہ نظر سے یہ ایک خامی پر اس لئے کہ ستیہ گرہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ سچی بات جب محبت بھرے دل سے نکلے تو اس میں سختی نہیں ہوتی چاہئے۔ سارا معاملہ یہ ہے کہ انسان کو اس کا ڈھب آتا ہو۔ اسی طرح ان کی بعض اور کمزوریاں بھی گنائی جاسکتی ہیں۔ خدا اپنے سچے خدمت گزاروں کی غلطیوں کو درست کر دیتا ہے۔ مگر اُن سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ عدم تشدد کا قانون اُٹل ہے۔ اور اگر اس پر عمل کرنے میں نا تجربہ کاری سے کام لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ فوری مقصد میں کامی ہو، مگر یہ نام نہاد ناکامی عدم تشدد کی نہیں ہوتی بلکہ اس ناقص ذریعے کی ہوتی ہے۔ جس سے وہ ظاہر کیا جائے۔ بجائے اس کے کہ اس سے انسان کا عقیدہ کمزور ہو یا اس پر مایوسی غلبہ ہو عدم تشدد کے پیرو کو چاہئے کہ توفیق الہی کے لئے۔ جس کے بغیر انسان کوئی چیز نہیں، اور زیادہ دعا کرے۔

”انسان کو اس سے زیادہ نہیں دیا گیا۔“

اس کی روح میں صرف اتنی ہی طاقت ہے
کہ جو آج سیکھے، اس پر کل عمل کرے۔

اس کے لئے یہ کام کیا کم ہے
کہ صنائع حقیقی کو کام کرنے ہوئے دیکھے
اور اس سے کاری گری کے حقیقی گرو

اور اوزاروں کا صحیح استعمال تھوڑا بہت سیکھ لے۔“

اب رہے خدائی خدمت گار تو جو خبریں اس کے بارے
میں مل رہی ہیں کہ بادشاہ خاں کی اسیری کے زمانے میں انھیں
اپنے سردار کی وفاداری کے جرم میں کیا کچھ بھگتنا پڑ رہا ہے
اگر ان کا ایک شہمہ بھی صحیح ہے تو انھیں بڑی سخت آزمائش کا
سامنا کرنا ہے۔ انھیں گاندھی جی کے یہ الفاظ جن میں آئندہ کی
خبر دی گئی ہے، یاد رکھنے چاہئیں :-

”اگر آخری مقابلے میں خدائی خدمت گار اس عسیدے
میں سچے ثابت نہ ہوئے جس کی پابندی کا وہ دعوے کرتے
ہیں تو ظاہر ہو گا کہ دراصل عدم تشدد ان کے دل میں نہ تھا
یہ آزمائش کا موقع بہت جلد ملے گا۔ اگر وہ جویشن اور خلوص
سے تعمیری پروگرام پر عمل کرتے رہے تو ان کے لئے کوئی
خطرہ نہیں۔ وہ امتحان کے وقت دنیا کے سب سے زیادہ
بہادر آدمی ثابت ہوں گے۔“

”عدم تشدد کسی کی اجازت کا پابند نہیں۔ وہ آپ ہی اپنی
 جہر اور اپنی سند ہے۔ وہ بے گناہ قربانی اور ظاہری شکست
 کے ذریعے سے ہر معرکے کو سر کر لیتا ہے۔ وہ کبھی ناکام نہیں
 ہوتا۔“

جس کی قیمت صرف پانچ آنے تھی۔ مگر اس کے لگانے سے معمولی پنجابی چرنے کی گردش پچاس سے لے کر ایک سو چالیس تک بڑھ جاتی تھی۔ ایک اور حصے میں کاغذ سازی اور گٹے کے رس اور تاڑی سے گڑ بنانے کے طریقے دکھائے جاتے تھے۔ حکومت کے محکمہ جات صحت، زراعت اور صنعت بھی اپنی اپنی چیزیں نمائش میں لائے تھے۔ ایک صاف ستھرے بالترتیب گاؤں کے مٹی کے ماڈل کے مقابلے میں ایک گندے اور بے ترتیب گاؤں کا ماڈل بنا کر فرق دکھایا گیا تھا، اس کے علاوہ دیہاتی مکان باغ اور کھیت کے بھی مٹی کے ماڈل بنائے گئے تھے۔

نمائش میں داخلہ مفت تھا۔ جیسا کہ گاندھی جی نے بتایا یہ

طریقہ غلط تھا۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی رقم کی ادائیگی ایک صحت مند دہی پیدا کرنے کی باعث ہوتی ہے۔ پہلے دن اتنے لوگ آئے کہ سوائے عورتوں کے سب کا داخلہ بند کر دینا پڑا۔ اس کے باوجود لوگ دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ چھ دن میں ۴۴۰۰ روپے سے زیادہ کی کھاد سی فروخت ہوئی یہ دیکھتے ہوئے کہ پچھلے بیس سال میں مقامی کھاد ہی بھنڈار کی سالانہ بکری کبھی بھی ۶۰۰ روپے سے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی۔

ریلوے گاڑی اور چنگی وغیرہ کے اخراجات کے علاوہ نمائش پر
۲۲۰ روپے خرچ ہوئے۔ ان میں سے کتبوں، خاکوں اور دوسرے
آرائش کے سامان کی قیمت منہا کر لینی چاہئے۔ کیونکہ یہ سامان نمائش
کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا۔

سولھواں باب

جس کے تخیل میں ضی کا نقشہ ہو وہ مستقبل کی تصویر نہیں دیکھ سکتا۔
(رفائیل سیٹینی)

ٹیکسلا

(۱)

گاندھی جی نے اپنا سرحد کا دورہ ختم کرنے کے بعد ٹیکسلا ٹیشن سے وردھا روانہ ہونے سے پہلے ٹیکسلا کے کھنڈروں کی سیر کی۔ اس کے غیر ان کا دورہ نامکمل رہ جاتا جس طرح اس بات کے سمجھنے کے لئے کہ خدائی خدمت گاروں کی عدم تشدد کی تحریک کوئی سطحی اور عالمی چیز نہیں بلکہ ایک ارتقائی منزل ہے جو ان کی معاشرتی زندگی کے اندرونی تقاضے سے پیدا ہوئی ہے۔ بادشاہ خاں اور ان کے خدائی خدمت گاروں کے ساتھ چار ہفتے مل جل کر رہنے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح پٹھانوں کے متعلق ایک عالم گیر غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ٹیکسلا جانا لازمی تھا۔ بعض نکتہ چینوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ عدم تشدد صرف ہندو میں ایک خارجی چیز ہے۔ اور وہ یہاں کے ناسازگار ماحول میں بنی نہیں سکتا۔ ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ایک ہزار سال تک اس خطے میں بودھ

کا دور دورہ رہا ہے۔ وادی سوات، وادی کابل اور اس کے اُگے
افغانستان سے ختن تک کے علاقے میں آج بھی قدم قدم پر استوپ
خانقاہیں، ستون اور بوودھ مت کی دوسری یادگاریں باقی ہیں۔ جوزبان
حال سے اپنی داستان سناتی ہیں۔ ٹیکسلا اور گندھارا ہی کے راستے
سے شمالی بوودھ مت چین تک پھیلا تھا اور جب آج کل خدائی خدمت گار
خیال، قول اور فعل میں عدم تشدد کی پابندی کے حلف نامے پر دستخط
کر رہے تو وہ گویا اپنے ان بزرگوں کی تقلید کر رہا ہے جو ٹیکسلا قدیم کے
گرشہ عافیت میں چین کے ان جاٹری طالب علموں کے ساتھ جو صحرائے
کوہی کو پار کر کے آتے تھے، بیٹھ کر غصے کو تخیل سے دبانے کے مسئلے کے
پراسرار معنی پر غور کیا کرتے تھے۔

سرجان مارشل (SIR JOHN MARSHAL) نے اور ان
سے پہلے کرین کرافٹ (CRANCRAFT) ڈیل میسرک
(DELMERICK) اور کننگھم (CUNNINGHAM) نے
جو محض شوقیہ آثار قدیمہ کی تحقیقات کرتے تھے اس کام میں جو محنت
کی ہے اس کی بدولت ہم آج صدیوں پیچھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے
سے تھیل سے کام لے کر صوبہ سرحد کی تاریخ کے اس دل کش دور
کا جیتا جاگتا نقشہ دیکھ سکتے ہیں۔ راول پنڈی سے بیس میل
شمال مغرب میں ٹیکسلا اسٹیشن کے مشرق اور شمال مشرق کی طرف
تین الگ الگ شہروں کے آثار ہیں یہ تینوں قدیم ٹیکسلا

کے کھنڈر ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر از سر نو تعمیر ہوتا رہا
 مہا بھارت میں جنم جیے کی سانپ کی قربانی کے سلسلے میں ٹیکٹا شیل
 کا ذکر کیا ہے۔ ایریس (ARRIAN) نے اس کا ذکر ایک عظیم نشان
 اور خوش حال یونیورسٹی ٹاؤن کی حیثیت سے کیا ہے "در اصل
 یہ ان سب شہروں میں جو انڈس (INDUS) اور ہیدسپس
 (HYDASPAS) (جہلم) کے درمیان واقع ہیں سب
 سے بڑا شہر تھا اور اس زمانے میں اور اس کے بعد صدیوں تک
 علوم و فنون کے مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔
 ان تین شہروں کے کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور متفرق آثار
 زیادہ تر بودھ، استوپ اور خانقاہیں۔ جو اس سارے خطے
 میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے گاندھی جی نے جوہلیاں کی بودھ
 خانقاہ کے کھنڈر کو دیکھا۔ یہ خانقاہ تین سو فٹ اونچی پہاڑ کی
 چوٹی پر واقع ہے اور کسی زمانے میں بودھ سنگھ کے لوگوں اور
 جاتری طالب علموں کے لئے جنھوں نے "عیش و راحت سے
 منہ موڑ کر کلفت و مشقت کی زندگی بسر کرنے کا" حلف اٹھایا
 تھا، بہترین گوشہ عافیت تھی۔ اس کا اس اونچی پہاڑی پر واقع
 ہونا جہاں سے دور دور تک کا منظر نظر آتا ہے، اس کی خاموشی
 اور تنہائی اور اس کی "ٹھنڈی اور گردوغبار سے پاک" ہوا
 ان لوگوں کے ذوق جمال کو تسکین دیتی ہوگی جو اپنے گمان وھیان

کے لئے پاک اور بے داغ فطرت کی صحبت کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ یہ
 یادگارا ایک خانقاہ اور دو استوپوں کے چوبندوں پر جو مختلف
 سطحوں پر واقع ہیں مشتمل ہے۔ استوپوں کے چوبندے کھلے مربع
 میدان ہیں جن کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوئلیاں بنی ہیں جن میں
 مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ خانقاہ کے کھلے چوک کے چاروں طرف
 چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں جو مراٹھے اور مطلقے کے لئے استعمال
 ہوتی تھیں یہاں سے ہم وہ باورچی خانہ جہاں یہ لوگ کھانا کھاتے
 تھے۔ رسومی، کھانے کا کمرہ۔ پہاڑی کے نیچے کنوئیں جہاں سے
 پانی آتا تھا اور وہ پگ ڈنڈیاں دیکھ سکتے ہیں جن سے یہ لوگ
 قریب کے شہر بسرکھ میں بھیک مانگنے جایا کرتے تھے۔ کوٹھریوں
 میں گھڑے اور پانی پینے کے آب خورے آج تک اسی طرح رکھے
 ہوئے ہیں جیسے اب سے دو ہزار برس پہلے رکھے تھے۔ اس خانقاہ
 میں گندیہار آرٹ کے بعض بہترین نمونے ملتے ہیں جو اب تک بہت
 اچھی حالت میں ہیں۔ اس سے تھوڑی دُور کے فاصلے پر سرکاپ
 کے آثار کھود کر نکالے گئے ہیں۔ یہ ان تین مقامات میں سے دوسرا
 مقام ہے جہاں ٹیکسٹائل کا شہر دوسری صدی قبل مسیح
 کے شروع میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے گرد ایک پتھر کی دیوار ہو
 جس کا گھیر چھ ہزار گز اور چوڑائی پندرہ سے لے کر بیس فٹ تک
 ہے۔ یہ شہر پہاڑی سے لے کر وادی تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے

احاطے کے اندر سلسلہ ہتھیال کی تین کھڑی چٹانیں ہیں اور ایک چبھٹی پہاڑی ہے جو سب سے الگ واقع ہے۔ یونانیوں کے بیان کے مطابق یہ شہر وسعت میں نینوا کے برابر تھا اور اس میں ایک سورج کا مندر اور ایک شاہی محل تھا۔ اس کا نقشہ موزوں اور سڈول ہے۔ سڑکیں اس زمانے کے یونانی شہروں کی طرح تنگ اور بے قاعدہ ہیں۔ مکانوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھنے میں ایک منزل کے معلوم ہوتے تھے لیکن اصل میں ان میں تین کے اندر بھی ایک منزل ہوتی تھی۔ ستلئے میں غامبیاں نے اس شہر کو اور اس کے آس پاس بودھ مت کے معبدوں کو اچھی خاصی حالت میں دیکھا تھا۔ بودھ آرٹ اور تہذیب موریا سلطنت کے زمانے میں عروج کو پہنچی اور ستلئے کے بعد سن قوم کی ظالمانہ تاخت و تاراج سے برباد ہو گئی۔

میدیزیم میں ان باقیات کو دیکھ کر جو کھدائی سے حاصل کی گئی ہیں، انسان بڑی آسانی سے اس زندگی کا ہو بہو تصور کر سکتا ہے جو ان سڑکوں پر چلنے والے اور ان مکانوں میں رہنے والے کسی زمانے میں بسر کرتے تھے۔ ان کے لباس کا پتیل کے برتنوں کا جس میں وہ کھانا کھاتے اور پکاتے تھے، وہ چکیاں، اوکھلیاں اور تین چار فٹ اونچی مٹی کی گولیاں جو یہاں صحیح و سالم پائی گئیں، بالکل ویسی ہی ہیں جیسی کہ آج ہندوستان

کے گاؤں میں استعمال ہوتی ہیں اور اگر کوئی چکے سے ان میں اول بدل کر دے تو کسی کو کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ ایک عجائب گھر میں مٹی کے کھلینے، گاڑیاں، سیاہی اور سا دھو نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی ان بچوں کے ہاتھوں نے جو ان سے کھیلے تھے ان کو چھوٹا ہے۔ اگر آج کوئی گاؤں کا بچہ ان کو دیکھے تو یہ کہے گا کہ کسی نے پھرے کھلینے چھڑائے۔ وہ برتن وغیرہ اور دوسرا سامان جو گھر یلو رسموں میں استعمال ہوتا تھا نظروں کو آیا مانوس معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایچ، جی، ویلز کی "وقت کی مشین" کا ایک چکر ہیں تین ہزار سال قبل کے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچا دے جہاں یہ رسمیں ہو رہی ہوں تو ہم بغیر اجنبیت کے ان کے ان میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کی زینت اور آرائش کی چھوٹی چھوٹی چیزیں کنگے، آئینے، استرے وغیرہ چھوٹی چھوٹی سینڈ کی ڈبیاں، سرمے کی سلاریاں، اور چاندی سونے کے زیورات بھی زلمے کے ہاتھوں ہم تک پہنچے۔ گاندھی جی کو میوزم کے نگراں نے چاندی کے بھاری کپڑوں کا ایک جوڑا دکھایا تو محبت کے جذبے سے ان کا دل پھر آیا اور ایک ٹھنڈا سانس کھینچ کر انھوں نے کہا "یہ تو ہو ہو ویسے ہی ہیں جیسے میری ماں بہنتی تھیں" ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان لوگوں کے خیالات اور عقائد اور رسم و رواج کیا تھے۔ اسٹریو ایرین

(STRABO'ARRYAN) اور دوسرے یونانی فاضلوں نے جو سکندر کی فوج کے ساتھ آئے تھے اپنے زمانے کے ان رسوم و قوائد کا حال لکھا ہے۔ ان سب میں بھی بڑھ مت کے امنہ کے عقیدے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس نظام معاشرت میں انفرادی آزادی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ امیرین لکھتا ہے کہ بہت سی عجیب رسموں میں جو ہندوستان میں رائج ہیں، ایک رسم قدم حکما کے زمانے سے چلی آئی ہے، اور حقیقت میں بہت قابل تعریف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قانون کی رو سے کوئی شخص کسی حال میں بھی دوسرے کا غلام نہیں ہو سکتا ہر شخص خود آزاد ہو گا اور دوسرے کے حق آزادی کا بھی احترام کرے گا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ وہی لوگ جو نہ تو دوسروں پر حکومت کرتے ہیں اور نہ ان کی خوشامد کرتے ہیں۔ ایسی زندگی گزار سکتے ہیں جو تھدیہ کے تشدید و خزانہ کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے کہ جب دولت کی غیر مساوی تقسیم جانہ رکھی گئی ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ اسے قانون بتائے جائیں جن کی پابندی بلا تفسیق سب پر لازم ہو۔

غیر ملکیوں اور اجنبیوں کی خاطر مدارات کا خاص اہتمام تھا اور ان کی حفاظت کی اسی طرح ضمانت کی جاتی تھی جیسے ملکیوں کی حفاظت کی۔ بعض افسر خاص طور پر اس کام کے لئے مقرر کئے گئے تھے کہ غیر ملکیوں کا خیال رکھیں اور ان کے ساتھ کوئی

زیادتی نہ ہونے دیں۔ اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو جائے تو یہ لوگ اس کے دیکھنے کے لئے طبیب کو بھیجتے ہیں اور اس کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اگر وہ مر جائے تو اُسے دفن کراتے ہیں اور اس کی چھوڑی ہوئی املاک اس کے رشتہ داروں کو پہنچا دیتے ہیں عدالت کے حاکم ان مقدمات کے فیصلے میں جن کا تعلق غریبوں سے ہو۔ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اور جو لوگ اُن سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں اُن سے وہ بہت سختی سے پیش آتے ہیں۔

سود خواری کا نام تک نہ تھا اور قوانین میں لمبی چوڑی مقدمہ بازی کی گنجائش نہ تھی۔ ایک پرانی عبارت میں جوہیک کرنڈل نے ڈھونڈھ کر نکالی ہے لکھتا ہے ”ہندوستانی نہ تو سود پر روپیہ قرض لیتے ہیں اور نہ دیتے ہیں۔ ہندوستان کے دستور کے مطابق نہ کوئی شخص دوسرے کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور نہ اپنے اوپر زیادتی ہونے دیتا ہے۔ اس لئے ان کو نہ معاہدے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ضمانتوں کی“

ایک اور ٹکڑا یہ ہے ”ہندوستانیوں میں جو شخص قرض یا امانت واپس نہ لے سکے اس کے لئے کوئی قانونی تدبیر نہیں و یہی کر سکتا ہے کہ اپنے آپ کو کو سے کہ کیوں ایک بد معاشرہ پر بھروسہ کیا“

طب کا اچھا خاصہ رواج تھا لیکن ملک اور خصوصاً متعدد ہمای
 کو لوگ ایک قسم کی ناپاکی اور جسمانی فساد سمجھتے تھے اور اس کا
 علاج ہی سمجھا جاتا تھا کہ بیمار اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ کرے ہندوستانی
 حکیم کلاؤس جو معسوب ہو گیا تھا سکندر کی ہندوستان سے واپسی
 کے وقت اس کے ساتھ تھا جب سحیح پیش میں مبتلا ہوا تو اس نے
 چتا میں جل کر جان دے دی۔ حالانکہ سکندر اس کو بہت خوشامد
 سے روکتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں علاج دواؤں سے زیادہ
 غذا کے اعتدال سے کیا جاتا تھا۔ سب سے اچھا علاج مرہم اور
 بلاسٹر کا استعمال سمجھا جاتا تھا۔ علاج کے اور طریقے بڑی حد
 تک مضر سمجھے جاتے تھے۔

اطرائی بالکل موقوف تو نہیں ہوئی تھی مگر صرف سپاہیوں
 کے طبقے تک محدود تھی۔ کاشتکاروں کا طبقہ ”جو اوروں سے
 تعداد میں کہیں زیادہ تھا“ جنگی خدمت اور دوسری عمومی خدمات
 سے مستثنیٰ تھا۔ حملہ آور دشمن کو اگر کوئی کسان کھیت میں کام کرتا
 ہوا ملے تو اسے نہیں چھیڑتا تھا۔ اس لئے کہ اس طبقے کے لوگ جو
 خلق خدا کے محسن سمجھے جاتے تھے ہر طرح کے نقصان سے محفوظ
 تھے۔ زمین تیار ہی سے بچی رہتی تھی۔ فصلیں اچھی ہوتی تھیں اور
 لوگوں کی ضرورت کی سب چیزیں جو زندگی کو خوش گوار بناتی
 ہیں۔ میسر تھیں۔

ریورٹی کا حسب ذیل بیان آج کل کے سرحدی پٹھانوں کے متعلق اوپر کے بیان کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے و اس خطے کے پٹھان باہمی لڑائیوں کے سلسلے میں ایک دوسرے کے زرعی مزدوروں کو یا عورتوں بچوں، مہمانوں اور اجنبیوں کو کبھی نہیں ستاتے اس مثال سے وہ لوگ سبق لے سکتے ہیں جنہیں برتر تمدن کے مالک ہونے کا دعوئے ہے۔

یہاں سے دور پانچویں تیر میں معاشیات کا ماہر کوٹلیہ جو اپنے جنم بھوم ٹیکسلا سے ہجرت کر کے گیا تھا۔ ایک ایسے معاشی نظام کی بنیاد ڈال رہا تھا جس میں ادنیٰ تر کا بھی اتنا ہی لحاظ رکھا جاتا تھا جتنا اعلیٰ تر کا۔ اس کے ارتھ شاستر کا یہ ٹکڑا سنئے۔

”ان عورتوں کے لئے جو اپنے گھروں سے نہیں نکل سکتیں جن کے شہر پر پولیس گئے ہیں، جو چلتے پھرتے سے معذور ہیں ان لڑکیوں کے لئے جو اپنی روزی کمانے پر مجبور ہیں (سوت کاتنے کا) کام عزت کے ساتھ کٹائی کے مرکزوں کی ملازمہ عورتوں کی معرفت مہیا کرنا چاہئے جو عورتیں خود کٹائی کے مرکز میں جاسکتی ہیں ان کے لئے ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ صبح ۸ بجے کے اپنا سوت دے کر اجرت لے سکیں۔ وہ صرف اتنی روشنی ہو کہ سوت کے تار نظر آجائیں۔ اگر واروئے ان عورتوں کی طرف یا کسی اور معاملے کے متعلق گفتگو کرے تو اسے سخت سزا ملنی چاہئے۔ اجرت کی ادائیگی میں دیر ہو یا بغیر کام کے

کمل ہونے کے اجرت دے دی جائے تب بھی وہ سزا کا مستوجب ہے۔

نصف صدی بعد میکسلا میں اشوک کے فرمانوں کا دور دورہ تھا جن میں سے بعض آج بھی شہباز گڑھ میں موجود ہیں۔ ہم ان کے کچھ ٹکڑے نقل کرتے ہیں جو آج دنیا کی قوموں کے لئے دستور العمل کا کام دے سکتے ہیں :-

”نیکی کرنا مشکل ہے، لیکن کرنے والے اس مشکل کام کو کر ڈالتے ہیں۔۔۔۔۔ اپنی تخت نشینی کے سترہ سال بعد میں نے دھرم ہمارا مقرر کئے۔ ان کا کام یہ ہے کہ چھتریوں اور برہمنوں، امیروں وغیرہ اور بوڑھوں، یونانیوں، افغانوں اور دوسری سرحدی قوموں کے لوگوں سے ملیں۔ وہ اس شخص کو جس کے پاؤں میں زنجیر ہے تسکین دیتے ہیں۔ اس کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں اور اس کو رہائی دلاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بال بچے ہیں جن کا اُسے پیٹ بھرنا ہو وہ مکر و فریب کا شکار ہے اور اس کی کمر بڑھا پے سے جھک گئی ہے۔“

عدل و انصاف کے متعلق یہ ہدایت ہے :-

”میں نے یہ کیا ہے ہر وقت اور ہر جگہ کھانے کے وقت، سونے کے وقت، زلنے میں، خلوت خانے میں، باغ کی آرام گاہ میں، وہ افسر جن کا کام ہے کہ مجھے اپنی رعایا کی خبریں میرے پاس آتے ہیں اور میں اپنے فرائض انجام دیتا ہوں۔ چنانچہ میں نے حکم دیا ہو

کہ یہاں کہیں ہیکشوروں کی کسی مجلس میں اختلاف یا تھکڑا ہونو مجھ
 فوراً اطلاع دی جائے۔ اس لئے کہ عدل و انصاف کے معاملے میں
 جتنا اشتہام کیا جائے کم ہے رفاہ عام کی جڑ مستعدی
 اور عدل گستری ہے مری ساری کوششوں کا ایک ہی
 مقصد ہے کہ جو ذمہ داری مجھ پر اپنی رعایا کی طرف سے
 عائد ہوتی ہے۔ اسے پورا کروں !!

ذیل کی سرحدی پالیسی ہمارے حکمرانوں کی توجہ کی مستحق ہے
اس پر عمل کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے کبھی نہ تھی۔ یہ مذہبی کتبہ اس
مقصد سے لکھوایا گیا ہے کہ ہمارے بیٹے اور پوتے یہ نہ سمجھیں
..... کہ جو فتح تلوار سے حاصل کی جاتی ہے وہ فتح کہلانے
کی مستحق ہے۔ تاکہ انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ تشدد اور
تباہی کے سوا کچھ نہیں..... تاکہ غیر مفتوح سرحدی علاقے
مجھ سے ڈریں نہیں بلکہ مجھ پر اعتماد کریں اور انھیں مجھ سے رنج نہ
پہنچے بلکہ راحت

اور ان میں سب سے زیادہ شان وارفیل کی ہدایت ہے
جو مذہبی روافداری کے متعلق ہے :-

یہ سچ ہے کہ مختلف فرقوں کے نزدیک مختلف نیکیاں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی ایک مشترک بنیاد ہے اور وہ حلم اور نرم گفتاری ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو یہ نہیں چاہئے کہ اپنے فرقے کی بہت زیادہ

تعریف کرے اور دوسروں کی تحقیر کرے۔ ان کو خواہ مخواہ بُرا نہیں کہنا چاہئے۔ بلکہ ہر موقع پر ان کا وہ احترام کرنا چاہئے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو دوسروں کی بھلائی کے ذریعے اپنے فرقے کا بھلا کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کے خلاف کرتا ہے، تو دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے فرقے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ جو کوئی شخص اپنے فرقے کی محبت میں اور اس کی ترقی کے خیال سے اس کو بہت بڑھاتا اور دوسروں کو گراتا ہے اور اصل خود اپنے فرقے کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ اس لئے ثواب صرف اس میں ہے کہ آپس میں اتفاق ہو۔ ہر شخص دوسروں کے عقیدے سے زیادہ اوجھڑے اور سچے دل سے برتنے۔“

آخر میں میں ایک اور ہدایت نقل کرتا ہوں جس پر ہندو مسلم اتحاد اور گنور رکھشا کے حامیوں کو غور کرنا چاہئے۔ ”لوگوں میں مذہب دو طریقوں سے رواج پاتا ہے۔ ایک تو مقررہ ضابطوں کے ذریعوں سے اور دوسرے مذہبی جذبات کے ذریعے سے جو ان کے دل میں پیدا کئے جائیں۔ ان دونوں میں سے مقررہ قاعدے کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ کامیابی و اصل اسی سے ہوتی ہے کہ دل میں مذہبی روح پیدا کی جائے۔ مقررہ قاعدے وہ احکام ہیں جو میں جاری کرتا ہوں۔ مثلاً بعض جانوروں کو ذبح کرنے کی ممانعت یا بعض مذہبی ہدایات جو میں نے بہت سے لوگوں کے لئے جاری

کی ہیں۔ لیکن صرف دلی جذبات میں انقلاب پیدا کرنے ہی کے ذریعے
 مذہب جمیور رکھنا کو رواج دینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس
 خیال سے میں نے کتبہ شائع کیا ہے تاکہ وہ میرے بیٹوں اور بیٹیوں
 کے وقت تک باقی رہے..... کیونکہ صرف اس طریقے سے نہایت
 دنیا میں اور آخرت میں سچی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ جہاں کہیں یہ فرمان
 پتھر کے ستونوں پر کھڑا ہوا ہے، خدا کرے ہمیشہ باقی رہے۔
 ظاہر ہے کہ اس پر ہر انسان آمین کہے گا۔

سترھواں باب

ٹیکسلا

(۲۲)

سکندر اعظم کے ماتحت یونانیوں کے ہندوستان پر حملے کرنے کی داستان میں تاریخ ہند کے بہت سے دلچسپ حاشیے ملتے ہیں لیکن غالباً ان میں سب سے زیادہ دلچسپ راوی ٹیکسلا میں مقدونیہ اور ہندوستان کے حکیموں کی ملاقات کا قصہ ہے جسے مختلف یونانی مورخوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس قصے کی اہمیت اس کے تمثیلی پہلو کی وجہ سے ہے۔

جنگ میں فریقین کو بہادر دی دکھانے کے بڑے بڑے موقع ملے جس کا دونوں نے اعتراف کیا۔ راجہ پوروچھ کو یونانی پورس کہتے ہیں، لڑائی ہار گیا لیکن جو کچھ اس نے میدان جنگ میں کھویا تھا اچھی ہمت اور استقلال کی بدولت اس سے زیادہ حاصل کر لیا جب سکندر نے اس سے پوچھا کہ فاتح کو مقتدر کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے تو اس نے جواب دیا ”اس سبق کو سامنے

رکھ کر جو آج کے دن حاصل ہوا ہے۔ جب کہ تمہاری اپنی آنکھوں سے
دیکھا کہ دولت و اقبال کتنی جلدی خاک میں مل جاتا ہے۔ "مورخ لکھتا
ہے کہ سکندر اس ٹیکے جواب سے اس سے زیادہ خوش ہوا جتنا کہ وہ
لجاحت سے ہوتا۔"

میدان جنگ میں یونانیوں کو کامیابی ہوئی اور سکندر کی
طاقت نے ہر ایک کو مغلوب کر لیا۔ لیکن اس عالم گیر فتح سے کچھ نہ
بن پڑی۔ جب اُسے اُن لوگوں سے مقابلہ پڑا جنہوں نے اُسے
اپنی حاضر جوابی کی قابلیت سے چکر میں ڈال دیا اور پھر ایک ایسا
شخص ملا جس نے ہتھ ہونے کے باوجود اپنی روح کو ایسی سپر نیا
جس پر دنیا کا کوئی ہتھیار اثر نہیں کر سکتا تھا۔

پشاور کے قریب سکندر نے دس سنیا سیوں کو گرفتار کیا
جنہوں نے راجا سنہاس کو اس کے مقابلے پر آمادہ کیا تھا، اور
"دوسرے طریقے سے بھی اہل مقدونیہ کو نقصان پہنچایا تھا" یعنی
عام طور پر لوگوں میں مزاحمت کی ایسی روح پیدا کر دی تھی جو کسی
طرح دبائی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے اُن کے سامنے چند مشکل مسئلے
حل کرنے کے لئے پیش کئے اور یہ کہا "جو شخص سب سے کمزور
جواب دے گا اس کو پہلے قتل کیا جائے اور ترتیباً دوسروں کو۔"
اس نے پہلے شخص سے پوچھا "تھارے خیال میں کون تعداد میں
زیادہ ہیں۔ دندے یا مروے؟" اس نے جواب دیا "زندے" اس

لئے کہ مریوں کا تو وجود ہی نہیں۔ دوسرے سے پوچھا کہ ان زیادہ جانوروں میں سمندر میں یا زمین پر؟ اس نے جواب دیا "زمین پر اس لئے کہ سمندر اسی کا ایک حصہ ہے۔" تیسرے سے پوچھا گیا "کون جانور سب سے زیادہ ہوشیار ہے؟" اس نے کہا "جس سے ہناؤ واقف نہ ہو۔" چوتھے سے پوچھا کہ "سبھاس کو کس وجہ سے محتاج ہے؟" اس نے جواب دیا "اس لئے کہ میں چاہتا تھا وہ عزت سے چمے اور عزت سے مارا جائے۔" پانچویں سے پوچھا "تمہارے خیال میں کون پہلے تھا، دن یا رات؟" اس نے کہا "دونوں، ایک دن پہلے تھا۔ بادشاہ یہ سن کر متعجب ہوا تو اس نے کہا "جہل سوالوں کا جواب بھی جہل ہونا چاہیئے۔" اب سیکندر چھٹے کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پوچھا "آدمی کس طرح ہر چیز پر چڑھ سکتا ہے؟" اس نے جواب دیا "اس کے پاس بہت بڑی طاقت ہو مگر وہ اس کی کوشش نہ کرے کہ لوگ اس سے ڈریں۔" اب گھنٹا بقیہ رہ گئے تھے، ان میں سے ایک سے پوچھا "انسان دیوتا کیوں کہتا ہے؟" جواب ملا "ان کاموں کو کرنے سے جو انسان نہیں کر سکتا۔" دوسرے سے پوچھا "دونوں میں سے کون زیادہ طاقتور ہے؟" زندگی یا موت؟ اس نے کہا "زندگی اس لئے کہ وہ اتنی بہت سی برائیوں کا بوجھ اٹھاتی ہے۔" آخری شخص سے پوچھا "آدمی کے لئے کتنے دن تک زندہ رہنا مناسب ہے۔" اس نے جواب دیا

موجب تک وہ زندہ رہنے کو مرنے پر ترجیح دے۔ "اب سکندر نے
 جج کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ تم فیصلہ کر دو۔ جج نے کہا کہ سب نے ایک
 سے بدتر جواب دئے ہیں۔ سکندر نے کہا "اگر تمہارا یہ فیصلہ ہے
 تو سب سے پہلے تم ہی کو قتل کرنا چاہئے۔ اس نے کہا "نہیں بلکہ
 بادشاہ اگر ایسا ہوا تو آپ کا قول غلط ہو جائے گا۔ اس لئے کہ آپ
 نے کہا تھا کہ جو شخص سب سے بدتر جواب دے گا اُسے پہلے
 قتل کیا جائے گا۔"

نیکسیلا پہنچ کر سکندر کو یہ شوق پیدا ہوا کہ ان دانش ورانہ
 میں سے ایک اس کے ساتھ رہے اس لئے کہ اس کو ان کا صبر و تحمل
 اور جفاکشی بہت پسند تھی۔ اونیکسیٹس (ONESIKRITOS)
 جو وقیانوس کے مذہب کا ایک فلسفی تھا بادشاہ کا پیام لے کر
 ڈنڈامیس (DANDAMIS) کے پاس گیا جو اس علاقے کے
 سنیاسیوں کا گرو تھا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں اس ہندوستانی
 حکیم سے زیادہ دلکش شخصیت کوئی نہیں تھی۔ اس میں ساوانرولا
 (SALAYAROLA) کا سا خلوص سلی ہے جس (TELMACHOUS)
 کی سی صفت گوئی اور ان دونوں سے بڑھ کر دانش مندی اور روحانیت
 تھی۔ مسلسل ریاضت سے اس نے مکمل ضبط اور بھروسہ کا وہ درجہ حاصل
 کر لیا تھا جس کے آگے بادشاہوں کی شان و شوکت ماتر ٹپڑ جاتی تھی
 اور اپنشد کا یہ جملہ یاد آ جاتا تھا "وہ حکیم جس نے برہمن کی معرفت حاصل

کر لی ہے۔ خوف کا نام تک نہیں جانتا۔ شاہی پیام پر نے اس جید حکیم کو پھیل میں پتوں کے بستر پر لیٹا ہوا پایا اور اس سے گفتگو شروع کی۔

حکیم کی گفتگو کا منشا یہ تھا کہ سب سے بہتر فلسفہ وہ ہے جو انسان کے نفس کو سنج و راحت سے آزاد کر دے۔ رنج اور محنت میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر انسان کے لئے مضر اور آخر الذکر مفید ہے۔

اس پر اونیسیکریٹس نے کہا کہ فیثاغورث نے بھی اس قسم کی تعلیم دی تھی اور اپنے شاگردوں کو ترک حیوانات کی ہدایت کی تھی اور ستر اور دقتیانوس کا بھی یہی خیال تھا۔ ڈنڈا میں نے جواب دیا کہ میں ان بزرگوں کو اور تو ہر لحاظ سے دانش مند سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ ان کا غلطی تھی کہ ”رسم و رواج کو فطرت پر ترجیح دیتے تھے“۔ ورنہ وہ انتہائی سادگی کی زندگی بسر کرتے اور سادہ غذا کھانے سے نہ شرماتے تھے۔ اس لئے کہ سب سے اچھا مکان وہ ہے جسے سب سے کم مروت کی ضرورت ہو۔ اس کے بعد اونیسیکریٹس نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور کہا ”اے برہمنوں کے گرو۔ زریں دیوتا گا بیٹا سکندر جو سب انسانوں کا شہنشاہ ہے، تم کو اپنے ہال بلاتا ہے۔ اگر تم اس کے حکم کی تعمیل کرو گے تو وہ تمہیں بہت بڑا صلہ دے گا۔ لیکن تم نے انکار کر دیا تو وہ تمہارا سر کٹا دے گا“۔

حکیم نے مسکراتے ہوئے اس کی پوری بات سنی۔ اس

نے تپوں کے بستے ترک نہ اٹھایا یہ بلکہ بیٹے لیتے جواب دیا کہ اگر سکندر
 زلیں کا بیٹا ہے تو میں بھی ہوں۔ مجھے اس سے کسی چیز کی ضرورت
 نہیں، جو کچھ میرے پاس ہے وہی بہت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جو
 لوگ سکندر کے ساتھ ہیں وہ بے کار سمندر اور خشکی میں گھومتے پھرتے
 ہیں اور ان کا چکر کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ پھر اس نے بہت حقارت
 سے کہا "جاؤ سکندر سے کہہ دو کہ شہنشاہ خدا ہے جو کبھی ظلم نہیں
 کرتا، بلکہ رہنمائی کا، امن کا، زندگی کا، پانی کا اور انسان کے جسم و
 روح کا خالق ہے۔ جب موت ان کو آزاد کر دیتی ہے یہ خدا سے مل
 جاتی ہیں، جو مرض اور فساد سے بری ہے۔ وہی خدا میری عیادت
 کا سرادار ہے جو خوں ریزی سے نفرت کرتا ہے اور لوگوں کو لڑائی
 کے لئے نہیں اکساتا۔ سکندر پر خارا نہیں ہے اس لئے کہ اسے خود فنا
 کا چام پینا ہے۔ بھلا ایسا شخص دنیا کا مالک کیوں کر ہو سکتا ہے،
 جو ابھی تک سب ملکوں کو فتح نہیں کر سکا۔

اس کے علاوہ کیا سکندر نے آخرت کی زندگی کا مسئلہ حل کر لیا
 ہے؟ وہ نہ تو اب تک زندہ ہیڈریس یعنی ہم لوگ میں داخل ہوا ہے
 اور نہ یہ جانتا ہے کہ زمیں کے اندرونی حصے میں سورج کا راستہ
 کیا ہے۔ ان قوموں نے جو سطح ارض پر رہتی ہیں کبھی ان کا نام تک
 نہیں سنا۔ اگر اس کی موجودہ تعلیم رو اس کے حصے سے کم ہو تو گنہگار
 کے پار چلا جائے۔ اگر ادھر کے علاقے میں اس کی سمائی نہیں ہے

تو ادھر اس کو ایسا خط نظر آئے گا جس میں اس کی ساری فوج سما جائے گی۔

”تم یہ جان لو کہ جو انعام و اکرام مجھے دینے کا وعدہ کرتا ہے ان کی میری نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ میں جن چیزوں کی قدر کرتا ہوں اور جنہیں مفید سمجھتا ہوں وہ یہ پتے ہیں جو میرے لئے گھر کا کام دیتے ہیں۔ یہ ہرے بھرے پودے ہیں جن سے مجھے کھانا ملتا ہے اور یہ پانی ہے جو میں پیتا ہوں۔ ان کے علاوہ اور سب چیزیں اور وہ اہلک جو بڑی مشکل سے جمع کی جاتی ہے۔ جمع کرنے والے کے لئے تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ اس سے سوار سچ اور تکلیف کے چھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو گی فانی انسان کے لئے یوں ہی کچھ کمی نہیں جہاں تک میرا تعلق ہے میں جنگل میں پتوں کے بستر پر لیٹ جاتا ہوں اور چونکہ میرے پاس کچھ نہیں جس کی حفاظت کرتی ہو اس لئے بڑے چین سے سوتا ہوں۔ لیکن اگر میرے پاس نگہبانی کرنے کے لئے کچھ ہوتا تو میری نیند اڑ جاتی۔ زمین مجھے سب کچھ دے دیتی ہے، اسی طرح جیسے ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ میں جہاں جی چاہتا ہے جاتا ہوں۔ مجھے کوئی فکر نہیں جسے غراہ مخراہ لادے لادے پھر جائے۔“ اگر سکندر میرا سر بھی کاٹ لے تو میری روح کو برباد نہیں کر سکتا۔ میرا جسم سر سے الگ ہو کر خاموش ہو جائے گا۔ اور میرا جسم پھٹے ہوئے لباس کی طرح زمین پر رہے گا اور اسی مٹی میں مل جائے گا

جس سے وہ پیدا ہوا تھا مگر میں روح بن کر اپنے خدا کے پاس چلا جاؤں گا۔ جس نے مجھے جسم خاکی عطا کر کے زمین پر بھیجا تھا تاکہ وہ اس کا امتحان کرے کہ آیا ہم اس دنیا میں اس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں۔ جب ہم یہاں سے رخصت ہو کر اس کے پاس جائیں گے تو وہ ہم سے ہماری زندگی کا حساب لے گا۔ وہ ہر سرکشی اور ظلم کا انتقام لینے والا ہے۔ مظلوم کی آہیں ظالم کے لئے سزا بن جاتی ہیں۔

سکندر یہ دھکیاں ان لوگوں کو دے جو مال اور دولت کے طلب گار ہیں اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہمارے خلاف یہ دونوں ہتھیار بے کار ہیں۔ اس لئے کہ برہمنوں کو نہ روپے کا لالچ ہے نہ موت کا خوف۔

پس تم سکندر سے جا کر یہ کہہ دو ڈنڈا میں کو تم سے کچھ نہیں چاہئے۔ اس لئے وہ تمھارے پاس نہیں آیا۔ اگر تم اس سے کچھ چاہتے ہو تو خود اس کے پاس چلے جاؤ۔“

مورخ لکھتا ہے کہ سکندر کو اونیسیکریٹوس سے ملاقات کا حال سن کر ڈنڈا میں سے ملنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہو گیا۔ یہ وہ بوڑھا اور برہمن حریف تھا جس سے بہت سی قوموں کے فاتح سکندر نے زک اٹھائی۔

اٹھارھواں باب

خاتمہ

مطلع پر بادل چھل گئے

واقعات کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اس کی ضرورت پیش آئی کہ کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ کا اضافہ کیا جائے اور اسے اُس کے غیر متوقع اور افسوس ناک انجام تک پہنچایا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق جو بادشاہ خاں نے گاندھی جی کے مشورے سے بنایا تھا انھوں نے سرداریاب میں خدائی خدمت گاروں کی ٹریننگ کے لئے ایک مرکز قائم کیا، ان کی درخواست پر گاندھی جی نے پہلے شرمی میرا میں (مس سلیٹ) اور پھر بی بی امہ السلام کو دیہ ایک مسلم خاتون ہیں۔ جو ان کے آشرم میں داخل ہوئی تھیں اور جنھیں وہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے، اس غرض سے بھیجا کہ وہ بادشاہ خاں کو ان کے کام میں خاص طور پر مسلمان عورتوں کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح میں مدد دیں۔ مسئلہ یہ کہ گاندھی جی پھر صوبہ سرحد گئے

لیکن اس عرصے میں ان کی صحت بہت بگڑ گئی تھی اور وہ اضلاع کا دورہ نہیں کر سکے یہاں تک کہ خدائی خدمت گاروں کے مرکز میں بھی نہیں جاسکے۔ اس لئے انھیں اپنے اور بادشاہ خاں کے اس ارادے کی تکمیل کو آئندہ کے لئے ملتوی کرنا پڑا کہ سچانوں اور خدائی خدمت گاروں کے ساتھ جا کر رہیں اور انھیں بیادروں کا عدم تشدد سکھانے کا تجربہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کی کبھی نوبت نہ آ سکی۔

۳۰ ستمبر ۱۹۳۹ء کو انگلستان اور فرانس نے محوری طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۳۱ اکتوبر کو کانگریس نے حکومت چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ورکنگ کمیٹی نے صوبوں کی کانگریسی وزارتوں کو ہدایت کی کہ وہ ان دو باتوں کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفیٰ دیں۔ — ایک یہ کہ ہندوستان کو اس کی رضامندی کے بغیر جنگ میں شریک کر دیا گیا اور دوسرے یہ کہ بڑا بڑی حکومت نے اس اصول کو جس کے لئے وہ جنگ کرنے کا دعوے کرتی تھی ہندوستان پر عائد کرنے سے مسلسل انکار کیا۔ اس ہدایت کے مطابق صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت نے ۱۲ نومبر کو استعفیٰ دے دیا، جو ایک ہفتہ کے بعد منظور کر لیا گیا۔ اس استعفیٰ کے بعد کوئی دوسری وزارت نہیں بن سکی اور ۱۹۴۰ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کے مطابق صوبے پر گورنری راج مستط کر دیا گیا۔ یہ الجھن مئی ۱۹۴۱ء تک جاری رہی۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء

کو باعزت سمجھوتے کی ساری کوششوں کے ناکام ہونے کے بعد کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں انفرادی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان جنگی کوششوں میں حصہ نہ لے اور تقریر کی آزادی کا حق دیا جائے۔ اس کے بعد واقعات کی رفتار بہت تیز ہو گئی جس کا لفظ عروج اگست ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک تھی۔

بادشاہ خاں اس وقت کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے جب اس نے پینا کے اجلاس میں جنگی کوششوں میں مشروط تعاون کی پیشکش کی اور گاندھی جی کو اپنے اہنسا کے اصول کی بنا پر اس سے الگ ہونا پڑا۔ بادشاہ خاں نے اسی بنا پر استعفاء دے دیا۔ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کے دوران میں وہ گاندھی جی اور دوسرے ممتاز کانگریسیوں کے ساتھ گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیے گئے۔ گاندھی جی اپریل ۱۹۴۴ء میں چھوڑ دیے گئے۔ اس عرصے میں صوبہ سرحد میں نقشہ بدل گیا تھا۔ اورنگ زیب وزارت جس نے ستمبر ۱۹۴۳ء میں گورنر کے کانگریسی وزارت کی جگہ سنبھال لیا تھا اور جو اپنے آپ کو صرف اس طرح قائم رکھے ہوئے تھے کہ اس قانون ساز مجلس کے مخالف ممبروں کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا تھا، اپنے لالچ، نالائقی اور بے ایمانی کی وجہ سے بے حد غیر مقبول ہو گئی تھی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۴ء کو ایک علم بردار

ہے ایک اور موقع پر کہ اچھی میں انہیں پبلک کی طرف سے جو ایڈریس دیا گیا اس سے "سلطان" کے لقب سے خطاب کیا گیا۔ انہوں نے اس کا جواب اپنے مخصوص انداز سے دیا: "بھائیو..... میں اس ایڈریس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ تم نے مجھے "سلطان" کہا..... ہماری خدائی خدمت گاروں کی تحریک سلطانوں کے پیدا کرنے کے لئے نہیں ہے، تم جانتے ہو کہ سلطان کے معنی بادشاہ کے ہیں، اور لفظ بادشاہ..... سب کہیں عوام کے لئے..... افلاس اور مصیبت کے معنی رکھتا ہے..... جب تم سلطانوں کا ذکر کرتے ہو تو دراصل خدائی خدمت گار تحریک کے بنیادی اصول سے انحراف کرتے ہو!"

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں گاندھی جی نواکھلی روانہ ہوئے تاکہ اس طبقہ کے بعد جو دو قوموں کے نظرئے کے حامیوں نے فرقہ وارانہ نفرت کی تلقین سے مرپا کیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میں ملاپ کا سنہری پل باندھیں، نواکھلی کے بعد اس قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ہندوستان کے اور حصوں میں بھی شروع ہو گیا یعنی بہار، کلکتہ، یوپی اور اس کے بعد پنجاب، صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ اور سندھ میں۔ اس سے خان بھائیوں کے دل ہل گئے، لیکن ان کا عقیدہ اور زیادہ مضبوط اور واضح ہو گیا۔ جنوری

۱۹۲۷ء میں بادشاہ خاں گاندھی جی کے امن کے مشن میں ان کا ساتھ دینے کے لئے یہاں گئے۔ ان کا وقار، توازن، چٹان کی سی مضبوطی انسانی فطرت کی بنیادی، نیکی کا عقیدہ اور خدا پر سچا ایمان، طوفانی رات کی تاریکی میں ایک روشن رہنما مینار کی طرح تھا۔

ایک اخبار نویس نے جو کوئی جذباتی آدمی نہ تھا لکھا ہے "اس شخص کے خلوص نے جو اس کے ہر ایک لفظ میں شیشے کی طرح بھلکتا ہے۔ سینے والوں کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا ہے۔ یوں دیکھو تو اس کی تقریر میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ پھر بھی چند سیدھے سادے لفظ جو ایک غم گین دل سے نکلے ہیں سینے والوں کے دلوں کے تار کو چھیڑ دیتے ہیں۔ سرحدی گاندھی کے ایک جلسے میں ہندو مسلمانوں کا بھائیوں کی طرح گلے ملنا، اور عبادت گاہوں میں اکٹھا جانا خلافت کے دلوں کو یاد دلاتا ہے۔ آگے چل کر یہ نامہ لکھا کہتا ہے "یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں، لیکن وہ اس گہنی تاریکی میں روشنی کی کرن بن کر چمکتے ہیں۔"

بادشاہ خاں کو پٹنہ شہر میں ہرمندر کے گوردوارے میں جو گوردو گروند سنگھ کی ولادت کی جگہ ہے بلایا گیا یہاں انہوں نے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے ایک مشترک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "ہندوستان آج دیوانگی کا ایک جہنم نظر آتا ہے اور میرا دل یہ دیکھ کر روتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ سے اپنے گھروں کو آگ

لگا رہے ہیں آج مجھے ہندوستان پر تاریکی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ میری آنکھیں روشنی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہیں۔ گروہ کہیں نظر نہیں آتی۔ انھوں نے کہا کہ وہ طاقت کی سیاست کو اکتانے ہیں، اور انھیں نفرت کے سبق سے جو سارے ہندوستان میں پڑھایا جا رہا ہے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ایک "خدائی خدمتگار" کی حیثیت سے انھیں صرف اس کا شوق ہے کہ وہ کھ پھرنے والی انسانیت کی خدمت کریں۔ جلسے کے ختم ہونے کے بعد ہندو مسلمان اور سکھ ان کے ساتھ ایک مسجد میں جو گوردوارے سے متصل تھے گئے اور ایک دوسرے کو سلام کر کے گھٹے۔

بادشاہ خاں نے مونگیر میں ایک موقع پر یہ کہا "میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے جس میں سہرو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ بعض صوبے ایسے ہیں جن میں ہندو ایک بہت چھوٹی سی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اور بعض میں مسلمانوں کی یہی حیثیت ہے۔ جو کچھ یہاں ہوا ہے اگر وہی دوسری جگہ بھی ہوا تو اکثریت اقلیت کو پھینکے اور قتل کرنے کی کوشش کرے تو پھر قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لئے غلام بن کر رہ جائیں گے" اپنے خاص صاف گوئی کے انداز میں انھوں نے سب کو کھری کھری سنائی، کانگریسی وزیروں کو بھی نہیں چھوڑا، ظاہر ہے کہ ہندوستان کے قوم پروروں کو تنبیہ کرنے کا ان سے زیادہ اور کسے حق تھا

لیکن یہ ایک عام جنون کا زمانہ تھا اور ان کی آواز صدا بہ صحرایں
ثابت ہوئی۔ وسمیر ^{۱۹۷۰} عہد ہی میں بہار نے آتش زبان فتنہ پردازوں
نے فرقہ دارانہ نفرت کی آگ صوبہ سرحد تک پہنچا دی تھی اور مارچ میں
ضلع ہزارہ میں بد امنی پھیل گئی۔ اس لئے بادشاہ خاں کو بڑی
عجلت میں اپنے صوبے میں واپس جانا پڑا۔ انھوں نے لیشاور
میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا "شاید یہ ہمارے ملک کی تاریخ میں
سب سے نازک وقت ہے۔ ساری فضا میں تشدد پھیل گیا ہے
ہم میں سے بہت سے لوگ انسانیت سے گذر گئے ہیں، ہم وحشی
بن گئے ہیں۔" انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ صوبہ سرحد میں اپنا سارا وقت
اس کوشش میں صرف کریں گے کہ اپنے ہم مذہبیوں کو صوبے کے اندر

بھی اور قبائلی علاقے میں بھی، وحشیانہ حرکتوں سے باز رکھیں مجھے مسلم لیگ سے یا یورپین افسروں سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ میری تو بس یہ آرزو ہے کہ پٹھانوں کو اور کچھ انھیں پر موقوف نہیں بلکہ دنیا کی ساری قوموں کو غیروں کے تسلط سے آزاد دیکھوں۔

انھوں نے بہار میں ساڑھے تین مہینے رہنے کے بعد پہلے عام جلسے میں کہا "میں ان لوگوں کو جو ہمارے پیارے ملک میں آگ لگا رہے ہیں، متنبہ کرتا ہوں کہ ان کی لگائی ہوئی آگ انھیں بھی جہنم کر دے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عبادت گاہوں میں آگ لگانے سے اور بے گناہوں کو مارنے اور نوٹنے سے اسلام کی خدمت کیسے ہو سکتی ہے۔"

مگر ان کے مجروح دل کو اس سے بڑی تسکین ہوئی کہ مارح کے فسادات میں خدائی خدمت گاروں نے ان کی ساری تہمتیں پوری کیں اور ان میں سے دس ہزار جو اپنے عہد کے سچے تھے اپنے مصیبت زدہ ہندو اور سکھ بھائیوں کی مدد کے لئے پہنچ کر ان کے جان و مال کی حفاظت کی۔

جتنا زیادہ وہ اس بات پر غور کرتے تھے کہ آخر بے گناہوں کے اس قتل اور خانناں بربادی کی اصل وجہ کیا ہے، اتنی ہی زیادہ ان کے دل کو تکلیف ہوئی تھی، مگر انھوں نے کبھی نہایت نہیں ہاری سب صحیح العقل عناصر کو تاکید کرتے رہے کہ وہ مایوس نہ ہوں

اور امن کی کوشش برابر جاری رکھیں۔ انھوں نے ایک شک سے
 جوان باتوں پر ہنستا تھا کہا "تم ہندو مسلم اتحاد سے ایسے کیوں ہر
 کوئی کوشش جو سچے دل سے کی جائے بے کار نہیں جاتی۔ ذرا
 اس کھیت کو دیکھو! جو بیج اس میں بویا جاتا ہے وہ کچھ عرصے تک
 زمیں میں رہتا ہے اس کے بعد ایک دن پھوٹ نکلتا ہے اور اپنے
 وقت پر اپنے جیسے سینکڑوں دانے پیدا کرتا ہے۔ یہی صورت ہر
 کوشش کی ہے جو کسی نیک مقصد کے لئے کی جائے" ۱۹۴۷ء میں
 رہا ہونے کے بعد سے وہ خدائی خدمت گاروں کی نئی تنظیم اور تہذیب
 نفس میں لگے ہوئے تھے۔ اب انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بے نفس
 خدائی خدمت گاروں کی جماعتوں کو سارے صوبے میں دورے
 کے لئے بھیجیں تاکہ وہ بھٹکے ہوئے لوگوں کے ضمیر کو خدا کے اور انسانیت
 کے نام پر جگائیں اور انھیں ان کی غلطیوں کا احساس دلائیں۔
 انھوں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ خدا اس مقدس مشن میں میری
 مدد کرے گا، اور لوگ اس بات کو سمجھ جائیں گے کہ محبت سچائی اور
 عدم تشدد کی صفات ایک اچھی آزاد اور خوش حال سماج کی نشانی
 ہیں"

لیکن خدا کو انھیں ایک اور آزمائش میں ڈالنا منظور تھا
 برطانوی کینیٹ کا جو ڈپٹی گیشن ہندوستان آیا تھا اس نے اپنے
 ہارمی کے بیان میں اعلان کیا تھا کہ "صوبوں کے گروپ بنانا"

ان کی انتقال اختیارات کی اسکیم کا ایک لازمی جزو ہے اس اسکیم کے مطابق ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے صوبے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی الگ الگ گروپ بنائے گئے تھے اور یہ تجویز تھی کہ ہر ایک گروپ کے نمائندے ایک سیکشن میں جمع ہوں۔ یہ سیکشن گروپ کا آئین بنائے اور صوبوں کو یہ اختیار ہو کہ اگر چاہیں تو نئے آئین کے مطابق منتخب کئے ہوئے نمائندوں کی اکثریت سے اس گروپ سے الگ ہو جائیں۔ اس طرح صوبہ سرحد پنجاب، بلوچستان اور سندھ گروپ (دب) میں رکھے گئے تھے اور آسام اور بنگال گروپ (ج) میں۔ باقی سب صوبے گروپ (الف) میں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغرب اور مشرق میں مسلم اکثریت کے الگ علاقے بن جائیں تاکہ مسلم لیگ پاکستان کا مطالبہ عملی طور پر پورا ہو جائے۔ مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ اگرچہ کمیٹی مشن کی تجویز میں گروپ میں شامل ہونا اختیاری رکھا گیا تھا لیکن جو دفعہ گروپ بنانے کے بارے میں تھی اس کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا کہ صوبہ سرحد کو اپنے نمائندوں کی مرضی کے خلاف گروپ (دب) میں شامل ہونا پڑتا جس پر دو قوموں کے نظریے کے حامی چھلکے ہوئے تھے، حالانکہ خود صوبہ سرحد اس نظریے کو قطعی طور پر رد کر چکا تھا اور ہو سکتا تھا کہ یہ گروپ ایک ایسا آئین بناتا کہ کسی صوبے کے لئے آگے جل کر گروپ سے الگ ہوجانا ناممکن ہو جاتا، لیکن کانگریس نے یہ سمجھ کر کہ اگر کسی صوبے کے

لوگ یہ طے کر لیں کہ وہ ایک خاص گروپ میں شریک نہیں ہوں گے تو کوئی نہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ ۶۔ ارسنی کی تجویز کو منظور کر لیا تھا مگر وہ ان دفعات کی جو گروپ بنانے سے تعلق رکھتے تھے یہ تعبیر کرتی تھی کہ صوبہ سرحد کے لوگوں کو یہ آزاد ہے کہ وہ اپنی قیمت کا جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ خان بھائیوں کو گروپ بنانے کی تجویز کے سیاسی پہلو سے کوئی بحث نہ تھی۔ انھیں کسی ایسے گروپ میں شامل ہونے پر اعتراض نہ تھا جو پٹھانوں کو اپنی راہ پر چلنے کی پوری آزادی دے۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں بادشاہ خاں نے یہ کہہ دیا تھا مجھے پنجاب، سندھ اور بلوچستان والے گروپ میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ضرور کہتا ہوں کہ اس طرح کی شرکت سے پہلے ہمیں چاہئے کہ بھائیوں کی طرح سرحد کر بیٹھیں اور ایک دوسرے کے شکوک دور کر کے اس بات کا یقین دلائیں کہ گروپ میں شامل ہونے سے ہر صوبے کو فائدہ ہوگا۔ بعض لوگ اسے مذہبی رنگ دیتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ بھلا مذہب کو اس سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو ایک معاشی مسئلہ ہے یعنی فائدے اور نقصان کا سوال ہے۔ زیر دست سے کام نہیں چل سکتا۔ آج کل باپ بھی بیٹے کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ دوسرا اہم مسئلہ جو قابل توجہ ہے یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب ہم پنجاب، سندھ اور بلوچستان سے ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں، ہندوستان سے ملنا کیوں کر ممکن ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہی ہم اور اپنے ہمسائے کو نظر انداز کر دیں اور

اسے چھوڑ کر دوسروں سے مل جائیں۔ اگر ہم کبھی کوئی گروپ بنائیں گے تو وہ صرف پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے ساتھ مل کر بن سکتا ہے دوسرے صوبوں کے ساتھ نہیں، اس لئے کہ وہ سب صوبے جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہیں ہم سے سینکڑوں میل دور ہیں۔

لیکن کینیٹ ڈیلی گیشن کی تجویز ناکام رہی اور ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو سٹراٹھلی نے دارلعوام میں یہ اعلان کیا کہ اگر کینیٹ ڈیلی گیشن کی ۱۴ مئی والی تجویز کے مطابق اختیارات کو منتقل کرنے اور آئندہ آئین بنانے پر دونوں بڑی پارٹیاں متفق نہ ہوں تو برطانوی حکومت کو یہ سوچنا پڑے گا کہ جب وہ ہندوستان کو چھوڑے تو اختیارات کس کے سپرد کرے اور کیسے کرے؟ اشارتاً یہ بھی کہہ دیا گیا کہ جن صوبوں کی نمایندگی آئین ساز اسمبلی میں پوری طرح نہ ہوگی ممکن ہے کہ وہاں اختیارات اس حکومت کو منتقل کر دئے جائیں جو اس وقت موجود ہو۔ اس کے معنی یہ تھے کہ صوبہ سرحد میں اختیارات اس حکومت کی طرف منتقل ہوتے جس کے صدر ڈاکٹر خان صاحب تھے چنانچہ دو قوموں کے نظریے کے حامیوں نے اس حکومت کو ٹوٹنے میں اپنا سارا اور لگا دیا اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے سب آسان ترکیب یہ تھی کہ فرقہ دارانہ جذبات کو بھڑکایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ماوچ اور پھر اپریل میں ہزارہ اور صوبے کے بعض اور حصوں

میں پھر منہدوں اور سکھوں کے خلاف بڑے پیمانے پر فساد کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد آسام اور پنجاب کی طرح یہاں بھی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کے خلاف "ڈاکٹر کٹ ایکشن" شروع ہو گیا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں ملارڈ ویل کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہو کر ہندوستان پہنچے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں وہ صوبہ سرحد آئے۔ اس موقع پر مسلم لیگ کے والیسیروں کا ایک مظاہرہ کیا گیا اور گورنر انھیں اس جماعت کی ریلی دیکھنے کے لئے لے گئے۔ جو خود ان کے وزیروں کے خلاف شورش برپا کر کے قانون کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ ایک صوبے کے حاکم کے لئے ایسی حرکت کرنا ایک عجیب بات تھی۔

گورنر نے ایک اور عجیب حرکت کی انھوں نے وائسرائے کو اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ صوبہ سرحد میں دفعہ ۹۳ نافذ کر دیں اور نئے سرے سے انتخاب کرائیں۔ وہ اس پر بھی اُتر آئے کہ صوبے کے ایجنٹ کے ایک جلسے کی جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے قیام کے دوران میں ہوا تھا غلط اور مسخ کی ہوئی رپورٹ وائسرائے کو بھیجی اور وزیر اعظم کی سچی رپورٹ کو روک دیا۔ بعد میں یہ رپورٹ براہ راست دہلی بھیجی گئی۔

بات یہ ہے کہ صوبہ سرحد کے بڑے برطانوی افسر چاہتے تھے کہ اس طاقت میں سے جو ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی جتنی بھی بچ سکے بچالیں، اور اس کی صورت یہ تھی کہ اسے اپنی منظور نظر اور

اور تاریخی حلیف ”مسلم لیگ“ کے حوالے کر دیں جواب پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ادھر برطانوی کابینٹ کو بھی جو دل سے یہ چاہتی تھی کہ ہندوستان کو برطانیہ کے تسلط سے آزاد کر دے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہندوستان کی ایسی تقسیم کرے جو مسلم لیگ کے لئے قابل قبول ہو۔ اور اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ صوبہ سرحد طوعاً کرہاً مسلم لیگ کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ یہیں برطانیہ کے قلمرو میں کی توہین مقصود نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ برطانوی کابینٹ اور ستھائی برطانوی افسروں کے بیچ میں صوبہ سرحد مفت میں مارا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انصاف کو مصلحت پر قربان کر دیا گیا۔

اپنے بہاؤ کے قیام کے زمانے میں بادشاہ خاں سنجیدگی سے اس پر غور کر رہے تھے کہ وہ سیاست سے بالکل الگ ہو جائیں۔ یہاں میدان میں جو تنگ ظرفی اور خود غرضی نظر آئی تھی اس سے اُن کی طبیعت کو بہت کڑی تھی۔ لیکن صوبہ سرحد کے حالات نے انھیں اپنے فیصلے کو بدلنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے سوچا کہ ایسے وقت میں پبلک لائف سے ہٹا گویا بیٹھانوں کو مسجد ہار میں چھوڑ دینا ہو گا۔ ہندو قبیلے کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ”ہم نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ انگریز اور اُن کے پٹھو اس خیال سے پریشان ہیں کہ اُن کے ہاتھ سے طاقت نکلنے والی ہے لوگ انھیں اسلام کے نام سے گمراہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

کہ تمہیں آنے والے خطروں سے آگاہ کر دوں تاکہ میں قیامت کے دین
خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہوں مجھے کسی طرح چہن بہن
آتا: "گورنر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا" میں وہی گیا تھا اور
مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ وہی شخص جو جرگے میں تم سے ملتا
ہے اور تمہارے دوست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ تمہارے خلاف
رپورٹیں بھیجتا رہا ہے اور دہلی کی حکومت سے اصرار کرتا رہا ہے کہ وہ
بیمار ہوائی جہازوں کو تیار رکھے تاکہ وہ تم پر ہلاکت اور تباہی کی
بارش کریں۔ اب کے جو وہ جرگے میں آئیں تو ان سے پوچھنا
کہ وہ سچ ہے یا نہیں۔ اگر وہ انکار کریں تو انھیں میرا سامنا کرنے
والا اور میں اپنے الزام کا پورا ثبوت دوں گا

انھوں نے کہا کہ حال میں سراولف کیرو نے سرحد کے وزیر کو
کہا تھا یاد رکھو کہ تمہارے اور ہندوستان کے درمیان کوئی چیز
مشترک نہیں۔ اگر تم کانگریس کو چھوڑ دو تو میں پوری طرح
تمہارا ساتھ دوں گا۔

انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ آخر سراولف کیرو سرحد میں نئے
انتخابات کیوں چاہتے ہیں؟ سلیمان کے انتخابات میں جو خاصا کتا
کے مسئلے کی بنیاد پر لڑے گئے تھے، کانگریس نے وہ نشستوں
میں سے ۳۲ نشستیں جیت لی تھیں۔ ان میں ۳۸ مسلم نشستوں میں
سے ۲۱ اور ۹ کی ۹ ہندو نشستیں اور تین میں سے دو کھلم نشستیں

شامل تھیں۔ ان کے مخالفوں نے جو، اسلام نشین حاصل کی تھیں ان میں سے گیارہ ہزارہ ضلع کی تھیں جو پشتو بولنے والوں کا علاقہ نہیں ہے۔ "سر اولف کا خشار صاف ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ طاقت اپنے ٹوٹے ہوئے اور پٹھوؤں یعنی خانوں، نوابوں اور چند افسروں کے ہاتھ میں دے دیں جنہوں نے ان سب تحریکوں میں جو خدای خدمت گاروں نے برطانیہ کے خلاف چلائی تھیں، انگریزوں کی مدد کی ہے انتقال اختیارات کے وقت گورنر کیر و کوریہ فکر ہے کہ حکومت انہیں انگریزوں کے دستوں پر پڑ کر بس نئے انتخابات کے اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ ابھی سال بھر پہلے پٹھانوں نے انتخابات میں جو پاکستان کے مسئلے کی بنیاد پر ہوئے تھے۔ اپنی رائے صاف صاف ظاہر کر دی تھی۔ پٹھانوں نے بہت بڑی اکثریت کے ساتھ خدای خدمت گاروں کو منتخب کیا تھا۔"

یہ بددیانتی ہوگی کہ مسلم لیگ کی فرقہ دارانہ تحریک کو جس کے پیرو جراثیم کے مرتکب ہوئے ہیں، ایک سیاسی تحریک کی حیثیت دی جائے۔

یہ بات بادشاہ خاں نے اس لئے کہی کہ گورنر دلیل پیش کر رہا تھا کہ جو پرنسپل د مظاہرے سارے صوبوں میں ہوئے ہیں ان سے یہ مظاہرے موافق ہے کہ لوگوں کو وزارت پر اعتماد نہیں ہے۔ بادشاہ خاں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اگر گورنر اپنا فرض ادا کرتا تو وہ

خوں رینی کو روک سکتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں ایک سرچرے بٹھانے
ایک برطانوی افسر بر گولی چلائی تو وہ ۴ گھنٹے کے اندر مجرم گرفتار بھی
ہو گیا اور اسے پھانسی کی سزا بھی دے دی گئی۔ جب اس ہوئی ایس کو
اغوا کیا گیا تھا اور ان کو چھوڑا گیا تھا تو پوری پارٹی کے ایک ممتاز
اجنبانے لکھا کہ یہ واقعہ اس کی مثال ہے کہ ایک برطانوی عورت کی
عزت کی حفاظت کے لئے برطانوی سلطنت کے سارے وسائل سر
کام لیا جاتا ہے۔ جنگ کے دوران میں چھ سال تک جبکہ انگریز خود
مشکلی میں گرفتار تھے، قبائلی علاقے میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا، چونکہ
انگریز امن چاہتے تھے، اس لئے امن رہا، اور اب سینکڑوں
آدمی قتل کر دئے گئے۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے اور بہت سے گھر
اُجڑ گئے۔ مگر سرحد کے برطانوی حکام جب چاہا تا شہ دیکھتے
رہے، اور انھوں نے اس بد امنی کو روکنے کے لئے وہ سخت کارروائی
جہاں کے وزیر چاہتے تھے نہیں کی۔ بلکہ اس بد امنی کی بنا پر
انھوں نے ان وزیروں کو مٹا دینے کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ انھیں
رائے و مہندوں کی بہت بڑی اکثریت نے منتخب کیا تھا، اور اب تک
آئین ساز اسمبلی میں ان کی اکثریت تھی۔

باو شاہ خاں نے مسلم لیگیوں سے پرجوش اپیل کی کہ خدای
خدمت گاروں کے ساتھ ایک مشترک جرگہ کر کے ان مختلف مسائل
پر غور کریں جو انگریزوں کے ہندوستان سے جانے کے بعد پیدا ہوں

یہ پیش کش ٹھکرا دی گئی اور پاکستان بن گیا تقسیم کی تجویز میں یہ بھی شامل تھا کہ صوبہ سرحد میں اس مسئلے پر عام رائے شماری کی جائے کہ وہ کس کے ساتھ شامل ہوگا یہ نا انصافی کی بات تھی۔ بلوچستان میں تو عام رائے شماری کی جگہ عوام کے نمائندوں کی ایک جماعت گھڑ لی گئی اور سرحد میں جہاں عوامی نمائندوں کی جماعت پہلے سے موجود تھی۔ اس کے فیصلے سے بچنے کے لئے یہ چال کی گئی کہ ایک غلط سوال پر عام رائے شماری کی گئی۔ خان بھائیوں نے کہا کہ یہ سوال کہ سرحد ہندوستان میں شامل ہوگا یا پاکستان میں پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ اصولاً کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تقسیم کی تجویز مان لی ہے اور صوبہ سرحد جغرافیائی لحاظ سے باقی ہندوستان سے بالکل الگ ہے وہ عام رائے شماری سے نہیں ڈرتے تھے مگر یہ چاہتے تھے کہ وہ اس سوال پر ہو کہ کیا پٹھان اپنے علاقے میں خود مختار حکومت چاہتے ہیں۔ بادشاہ خان کہتے تھے کہ پٹھان یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کی ریاست کے اندر ایک خود مختار پٹھانستان ہو جس میں پٹھانوں کو اپنے معاملات خود طے کرنے کی آزادی ہو۔ پٹھان کچھلی تاریخ کی بنیاد پر اس کے سخت مخالف تھے کہ ان پر میدانی علاقے کے لوگوں کا تسلط ہو، اور بادشاہ خاں کا خیال تھا کہ پاکستان میں شامل ہونے سے پنجابی مسلمان سرمایہ دار پٹھانوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ انھوں نے ایک بیان میں جو اخباروں کو دیا تھا یہ کہا "ہمارے صوبے پر پنجابی چھا گئے ہیں

اور وہ پٹھانوں کو آپس میں لڑوانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے نوابوں اور بڑے سرمایہ داروں نے صوبے کی فرقہ واریت تقسیم کے بعد پنجاب کا ایک بڑا حصہ کھو دیا ہے، اور اس کی تلافی کے لئے وہ اب ہمارے صوبے پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں کہ پٹھانستان کا علاقہ اپنی معاشی ضرورتوں کو خود پورا نہیں کر سکے گا۔ انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا ”یہ غلط ہے کہ پٹھانستان ایک خسارے کی ریاست ہوگی۔ اس وقت ہمارا نظم و نسق سرمایہ داری طرز کا ہے جس میں حکام کو بہت بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اکیلے گورنر پر ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور برطانوی حکام ہیں جو ہمارے صوبے کی آمدنی کا ایک ایک بڑا حصہ لے جاتے ہیں۔ اگر ہم اس فضول خرچی کو ختم کر دیں اور جو رقم بچے اُسے ایسی اسکیموں پر صرف کریں جس سے پیداوار میں اضافہ ہو تو ہم یقیناً اپنا خرچ پورا کر لیں گے۔ اگر ہماری آزادی برقرار رہے تو ہم پھولس کی جھونپڑیوں پر اور سوکھی روٹی پر قناعت کریں گے اور اسے اس پر ترجیح دیں گے کہ غلام بن کر محلوں میں رہیں۔“

ایک اور موقع پر انھوں نے اعلان کیا ”ہم میں اور مسلم لیگ میں پاکستان اور آزاد پٹھانستان کے مسئلے پر رائے شماری کا مقابلہ ہو جائے۔ اگر عوام اس مقابلے میں پاکستان کے حق میں

رائے دیں تو میں پہلا آدمی ہوں گا جو پاکستان کی حمایت کرے گا۔
 ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ افغانستان کے ہاتھوں میں کھیل رہے
 ہیں۔ ایک ایسے شخص پر جس کی جان اپنی قوم کی آزادی میں اٹکی ہوئی
 تھی۔ یہ الزام صریحی طور پر غلط اور مضحکہ خیز تھا۔ خود گاندھی جی کو
 جنھوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی اس بے بنیاد پروپاگنڈا کی وجہ
 سے اس شخص کی حمایت میں مہر خاموشی توڑنی پڑی جس کے متعلق وہ
 جانتے تھے کہ سچائی اور ریاست داری کی جان ہے۔

انھوں نے تیسری جولائی کو جوآن کا ہفتے کا خاموشی اور مشاہدہ
 نفس کا دن تھا۔ پراختیا کے بعد ایک لکھے ہوئے پیام میں کہا "بادشاہ
 خاں اور ان کے رفیق کار سے پسند نہیں کرتے کہ ان سے ہندوستان
 اور پاکستان میں انتخاب کرنے کو کہا جائے جسے زبردستی ہندوؤں
 اور مسلمانوں میں انتخاب کرنے کے معنی پہنائے جاتے ہیں۔ اسی لئے
 خدائی خدمت گار اپنے ورثہ استعمال نہیں کریں گے۔ بادشاہ خاں
 پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ پٹھانستان کا لغو بالکل نیا ہے۔
 لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے کانگریس کی وزارت قائم ہونے
 سے بھی پہلے بادشاہ خاں کا یہ خیال تھا کہ پٹھانوں کو اندرونی معاملہ
 میں خود محتاجی حاصل ہو۔ وہ کوئی نئی ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے
 تھے۔ اگر انھیں اپنا مقامی آئین بنانے کا حق دیا جائے تو وہ خوشی
 سے دونوں ریاستوں میں سے ایک میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیں گے۔

پٹھانوں کی اس آزادی کی اُردو پر جماعت عرض کیا جاتا ہے اس کا سمجھنا میرے لئے مشکل ہے۔ ہاں اگر اس کا مقصد پٹھانوں کو ذلیل کرنا اور انہیں زیرِ رستی محکوم بنانا ہو تو اور بات ہے۔ اس سے زیادہ سنگین الزام یہ ہے کہ بادشاہِ خاں افغانستان کے ہاتھوں میں پھیل رہے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان میں تو اس قسم کی ریشہ دوانیوں کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ وہ اس کو ہرگز گوارا نہیں کریں گے کہ صوبہ سرحد افغانستان میں شامل ہو جائے۔

گاندھی جی نے آگے چل کر کہا "اُن کے دوست کی حیثیت سے اور دوست ہونے کی وجہ سے میں ان کی ایک کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں۔ انہیں برطانیہ کے وعدوں اور ارا دونوں کے بارے میں بہت شبہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ اس خامی کو جو صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے نظر انداز کر دیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان جیسے ملینڈ پایہ لیڈر کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ پھر بھی اگرچہ میں نے اسے خامی کہا ہے، اور ایک لحاظ سے ہے بھی، دوسرے لحاظ سے اسے خوبی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اگر کوشش بھی کریں تو اپنے دلی خیالات کو چھپا نہیں سکتے۔ یہ ان کی دیانت داری کی دلیل ہے۔"

چنانچہ رائے شماری ہوئی۔ جذباتی خدمت گاروں اور اُن کے

لے ہزارہ میں رائے شماری سے پہلے جواب دہوا "تھی اس کا اندازہ ایک دقیقہ اگلے صفحہ پر

حامیوں نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ رائے شماری کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ صوبہ سرحد پاکستان کا ایک حصہ ہے لیکن بادشاہ خان (بقیہ بسلسلہ صفحہ ۳۱۹) صاحب کے شائع کئے ہوئے بیان سے ہوگا جو ضلع ہزارہ کی طرف سے اسمبلی کے ممبر تھے :-

”میں وزارت کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی وزیر ضلع ہزارہ میں کانگریس کا پروپاگنڈا کرنے کے لئے آنے کی کوشش کرے گا تو وہ قتل کر دیا جائے گا۔“ یہ الفاظ ضلع ہزارہ کے ممبر اسمبلی خان جلال الدین نے ایسٹ آباد میں ایک جلسے میں کہے جو لوگوں کو پاکستان کی تائید پر آمادہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو ہندو اور سکھ ہزارہ میں واپس آنا چاہتے ہیں انھیں اگر اس ضلع میں چیں سے رہنا ہو تو یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ پاکستان کی پوری طرح تائید کریں گے اور اس اعلان کی ایک کاپی لیگ کے دفتر میں بھیج دینا چاہئے۔

ہندوستان ٹائمز ۳۰ جولائی ۱۹۴۷ء

رائے شماری کے نتیجے سے یہ ظاہر ہوا کہ ۵۷۶۷۸۸ ووٹوں میں سے مسلم لیگ

کو ۲۸۹۲۴۴ ووٹ ملے۔ اگر کل ووٹوں میں سے ۸۷۷۸۱ مسلمانوں کے ووٹ

سہا کر دئے جائیں جنھوں نے انتخاب میں حصہ نہیں لیا تو ۱۹۸۷۷۳ یعنی چالیس

فیصدی آدمی باقی رہ جاتے ہیں جنھوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ نہیں دیا

غیر بھٹیاں رائے دہندوں کو جن کی ضلع ہزارہ اور بعض شہروں میں اکثریت تھی

چھوڑ کر دیکھا جائے تو غالباً پاکستان کے حق میں رائے دینے والوں سے

کبھی زیادہ نکلیں گے۔

کے نزدیک لڑائی ہاری نہیں گئی تھی، وہ تو ابھی شروع ہوئی تھی اب تک تو ان کا مقابلہ انگریزوں سے تھا جو بدلی تھے۔ اب حکومت اُن کے بھائیوں کے ہاتھ میں تھی اگر وہ ان سے انصاف کی امید نہ کرتے تو اور کس سے کرتے؟ جو لڑائی وہ سالہا سال سے لڑ رہے تھے اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ایک جو اگر دن سے اتار کر دوسرا رکھ لیں۔ تقسیم کے بعد بھی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت قائم تھی یہ اتنی مضبوطی سے جمی ہوئی تھی کہ اسے ایسی طریقے سے اکھاڑنا ممکن تھا۔ اسی لئے ۲۱ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے اسے اپنے حکم سے برخاست کر دیا۔ تیسری اور چوتھی ستمبر کو سرحد یاب میں ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے جو صوبائی جرگوں پارلیمنٹری پارٹی، طلبہ پنجتوں، ڈوجوان پٹھانوں کی جماعت، خدائی خدمت گاروں اور قبائلی علاقوں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ خاں نے ایک بار اور اپنے پٹھانوں کے مطالبے کی تشریح کی اور اس کے معنی یہ بتائے کہ پٹھانوں کو پاکستان کے اندر اپنے اندرونی معاملات میں پوری آزادی ہو۔ اس جلسے میں جو زرو لیوشن پاس ہوئے ان میں سے ایک کے الفاظ یہ تھے "نیا ریاست صوبہ سرحد کے چھ ایٹمی اضلاع اور پٹھانوں کے ان متصل علاقوں پر مشتمل ہوگی جو اپنی خوشی سے اس میں شامل ہوں۔ یہ ریاست دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے بارے میں پاکستان کے ڈومنین سے معاہدہ کرے گی۔"

بادشاہ خاں نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا "میں ساری عمر
 پٹھانستان قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ خدائی خدمت گاروں
 کی تنظیم مسئلہ میں اسی غرض سے شروع کی گئی کہ پٹھانوں کو متحد کیا
 جائے۔ میرے اصول اب بھی وہی ہیں جو مسئلہ میں تھے۔ اسی
 لئے میرا راستہ بالکل صاف ہے۔ اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا
 چاہے میں دنیا میں اکیلا ہی کیوں نہ ہوں " لیکن خدائی خدمت
 گاروں کو بدنام کرنے اور مسئلے کی مہم جاری رہی۔ بادشاہ خاں
 رہے عامہ کو پٹھانستان کے نصب العین کی حمایت کے لئے تیار
 کرنے کی ان تھک کوشش کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۷۹ء میں گاندھی
 جی جوائنٹ سال سے اسنا کی راہ میں ان کی رہنمائی کر رہے تھے
 قاتل کی گولی کھا کر شہید ہو گئے اور سرحدی گاندھی پٹھانوں میں عدم
 کا خطرناک تجربہ کرنے کے لئے جواب تک دونوں مل کر کرتے رہے تھے
 لکھے رہ گئے۔ گاندھی جی کی شہادت کے بعد کے چند مہینوں میں
 بادشاہ خاں کی عظمت اور بلندی اس طرح ظاہر ہوئی جیسے پہلے کبھی
 نہیں ہوئی تھی۔

فروری میں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کراچی جا کر ڈومینین پارلیمنٹ
 کے جلسے میں شریک ہوں۔ خاص طور پر اس مقصد کے لئے کہ جو
 غلط فہمی اُن کے خلاف ایک منظم پروپاگنڈا کے ذریعے سے پاکستان
 کے مسلمانوں میں پیدا کی گئی ہے اُسے دور کریں۔ کئی پرزور بیانیوں میں

جو انھوں نے اخباروں میں شائع کئے، پٹھانستان کے بارے میں اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کر دئے۔

انھوں نے بتایا کہ پٹھانستان یا پختونستان، پاکستان کے آدھے ایک خود مختار علاقہ ہوگا۔ وہ پٹھانوں کے لئے ہوگا، جیسے سندھ سرحدوں کے لئے، پنجاب پنجابیوں کے لئے اور بنگال بنگالیوں کے لئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ، انگریزوں کا گھڑا ہوا نام ہے اور اسے اب باقی نہیں رہنا چاہئے۔

انھوں نے اس الزام کو بالکل بے بنیاد قرار دیا کہ وہ پٹھانستان کی ایک آزاد ریاست بنا کر پاکستان میں رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں خود یہ بات کہ وہ پاکستان کے دستگیر کی وفاداری کا حلف اٹھا رہے تھے اس الزام کی تردید کے لئے کافی تھی۔ انھوں نے اپنے مطالبے کی وجوہ سمجھاتے ہوئے کہا کہ سرحد کے لوگ سیاسی حیثیت سے پس ماندہ ہیں اور زیادہ تر غریب طبقے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سرمایہ داروں کا طبقہ نہیں ہے۔ درآں حالیکہ پاکستان میں دولت مند زمیندار، سرمایہ دار اور اونچے طبقے والے چھائے ہوئے ہیں، جو پالیسی پاکستان پٹھانوں کے بارے میں اختیار کر رہا ہے وہ انگریزوں کی "لٹاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی سے بھی بدتر ہے۔ انگریز حکمران پٹھانوں کے حوصلے کو اتنا پست نہیں کر سکے تھے جتنا کہ اب پاکستان نے حکام نے کر دیا ہے۔

انھوں نے اس سوال کا کہ آیا ان کی تنظیم کو فیرالی سے کوئی تعلق ہے۔ نفی میں جواب دیا۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ اس قسم کے سب بیانات بالکل غلط ہیں اور ان کے دشمنوں کے پھیلانے ہوئے ہیں۔

انھوں نے اس سے بھی انکار کیا کہ ان کی تنظیم پٹھانستان کے معاملے میں افغانستان سے کس قسم کا علاقہ رکھتی ہے۔ ان میں اور افغانستان کے لوگوں میں اس کے سوا کوئی تعلق نہیں کہ دونوں ایک نسل سے ہیں اور خون کے رشتے سے وابستہ ہیں۔ بادشاہ خاں نے یہ بھی کہا کہ افغانستان کی حکومت نے پٹھانوں کو حق خود اختیاری ملنے کے متعلق جو کچھ کیا ہو یا افغانستان اور پاکستان میں دوسرے مسئلوں کے بارے میں جو اختلاف ہو اس سے ان کو کوئی واسطہ ہے اور نہ انھیں اس کا علم ہے یہ دونوں حکومتوں کا اپنا معاملہ ہے۔

انھوں نے اس الزام کی پر زور تردید کی کہ پٹھانستان کا مطالبہ صوبہ دارتی جذبہ پر مبنی ہے اور اسلامی برادری کی روح کے منافی ہے۔ انھوں نے کہا "اسلام کا جو ہر مسادات ہے نہ کہ ایک کا دوسرے پر تسلط۔ ہم پٹھان لوگ نہ تو دوسروں کے حقوق چھین کرنا چاہتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے حقوق غصب کریں۔ پاکستان میں چار جماعتیں ہیں۔ پٹھان، ہنگالی،

پنجابی اور سندھی۔ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ان میں سے کوئی دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ سب کو کامل خود اختیاری حاصل ہو۔ اگر ایک دوسرے سے مدد چاہے تو اسے ضرور دینا چاہیے۔“

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس سے پاکستان کمزور نہیں ہو جائے گا تو انھوں نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ اس طرح مختلف حصے اپنی خوشی سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے قائد اعظم جناح سے درخواست کی کہ وہ پٹھانوں کو ایک مضبوط قوم بننے دیں تاکہ وہ اپنی حفاظت اور پاکستان کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکیں اور انسانیت کو فائدہ پہنچا سکیں۔ میں انسانیت کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔“

اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ پٹھانستان کے سوال پر رائے شماری چاہتے ہیں اور اگر ایسا ہے تو انھوں نے پچھلے رائے شماری کا بائیکاٹ کیوں کیا۔ بادشاہ خاں نے کہا کہ بائیکاٹ اس لئے کیا گیا کہ یہ رائے شماری غلط مسئلے پر کی گئی تھی اور اس کا طریقہ نامناسب تھا۔ اب رائے شماری کا کوئی سوال نہیں بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان سے براہ راست گفت و شنید کر کے معاملہ طے کر لیں۔

ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو یہ اندیشہ نہیں کہ گاندھی جی کی

وفات کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت بدتر ہو جائے گی۔ بادشاہ خاں نے اس کی سختی سے تردید کی اور کہا "جب تک ہندوستان میں وہ بڑے بڑے لیڈر زندہ ہیں جو گاندھی جی کے اصولوں کے پیرو ہیں جیسے پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد اور کئی حضرات، اس وقت تک ہندوستان مسلمانوں کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کی حالت ہرگز خراب نہیں ہوگی۔"

اس بات کی مثال کے طور پر کہ نہیں کس کس طرح ستایا گیا۔ انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ جنوری کے مہینے میں ایک نو عمر لڑکا جو خدائی خدمتگار تھا اکراں کے پاس ٹھہرا۔ اس کے پاس ایک پستول تھا تاکہ اس پر اپنی کے زلمے میں ضرورت کے وقت اپنی حفاظت کر سکے۔ پستول لڑکے کے چچا کا تھا اور ان دونوں نے یہ بیان دیا کہ بادشاہ خاں کو اس پستول سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ انھیں اس کا علم بھی نہیں۔ پھر بھی بادشاہ خاں مجرم قرار دئے گئے، اور ان کو یہ سزا دی گئی کہ یا تو دو روپے جرمانہ ادا کریں یا عدالت کے برخاست ہونے تک قید رہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کیا۔

آخر میں انھوں نے عدم تشدد پر کامل اور غیر مشروط یقین کا اظہار کیا۔ میں ایک عملی آدمی ہوں، اور ہر بات کا اندازہ اس کے نتائج سے کرتا ہوں۔ فی الحال میں انتظار کروں گا اور واقعات کی

رفتار کو دیکھتا رہوں گا۔ اپنے ہر عمل میں میں عدم تشدد کا پابند رہوں گا۔ جو میری زندگی کا لنگر ہے۔“

ہمارے سب سے بڑے دشمن کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں جب انھوں نے پاکستان کی ڈومینین پارلیمنٹ میں تحریک سچانستان کی تشریح کی اور بڑے جوش کے ساتھ یہ اپیل کی کہ رواداری سے اور اسلام کی تعلیم کے مطابق اخوت اور مسافات سے کام لیا جائے تاکہ پاکستان مضبوط اور خوش حال ہو۔

عام نظم و نسق کی بحث کے سلسلے میں احتجاج کے طور پر تحفیف کی تجویز پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا ”آزادی کے بعد چھ مہینے میں پاکستان کے نظم و نسق میں بدلیسی حکومت اور نوکر شاہی کا رنگ اس سے بھی زیادہ گہرا ہو گیا تھا جیسا کہ برطانوی حکومت کے بدترین زمانے میں تھا۔ اس میں اور ہندوستان کی حالت میں ایک نمایاں تضاد ہے۔ وہاں کم سے کم ہندوستانی گورنروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور تقریباً سارا نظم و نسق ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان کی حکومت کو عوام کی خدمت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہئے اور فنی ماہروں کے سوا بدلیسیوں کو بالکل نہیں رکھنا چاہئے۔“

یہ رائے ظاہر کرتے ہوئے کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد مسلم کا کام ختم ہو گیا ہے۔ بادشاہان نے یہ رائے دی کہ مسلم لیگ کو توڑ

دیا جائے، اور اس کی جگہ ایک خالص غیر فرقہ وارانہ جماعت بنائی جائے جو غریب اور بے بس لوگوں کی خدمت کے لئے وقف ہو۔ وزارت پارٹی کے اعتراض کے جواب میں انھوں نے کہا کہ جب سے سندھ ملک صوبہ بنا ہے۔ صوبہ واری جذبات کو اکٹھے کرنے کی ذمہ داری مسلم لیگیوں پر مخصوصاً پنجابیوں پر ہے۔ پٹھان بھی ویسی ہی خود مختاری چاہتے ہیں جیسی سندھ، پنجاب اور بنگال۔ میں نہ تو پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہوں اور نہ اُسے برباد کرتا۔

انھوں نے کہا "ہندوستان آزاد ہو گیا ہے، لیکن پاکستان جہاں برطانوی گورنروں کا راج ہے اور برطانوی افسروں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی ہے جتنی سالہا سال سے نہیں ہوئی تھی۔ استبداد کے پنجے میں پہلے سے بھی زیادہ گرفتار ہے۔ پاکستان کی حکومت اس طریقے سے راج کر رہی ہے جو انگریزوں نے ایجاد کیا تھا بلکہ سچ لے چھٹے نوٹس قاعدوں اور ضابطوں بدلی طرز معاشرت اور فضول خرچی کو دیکھتے ہوئے پہلے سے بدتر ہے۔ لوگ صوبہ واری جذبے کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ جذبہ مسلم لیگ کا اور پنجابیوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ میں یقیناً پٹھانستان چاہتا ہوں، مگر وہ پٹھانستان جو پاکستان کے اندر ہو، اسی طرح جیسے سندھ اور پنجابی چاہتے ہیں۔"

اُس کے چل کر انھوں نے کہا "مسلم لیگ کو جو اس وقت ایک

فرقہ دار جماعت کی حیثیت رکھتی ہے نئے سرے سے بنانا چاہئے اور اس میں پاکستان کے سب باشندوں کو شریک کرنا چاہئے، اسی میں ملک کا بھلا ہے۔ پاکستان امریکی اور برطانوی ماہرین فن کو صنعتی ترقی کے لئے ضرور رکھے۔ لیکن ان کو انتظامی عہدوں سے الگ کر دے۔ ورنہ پاکستانیوں کو اپنے ملک پر بھروسہ نہیں ہے گا۔“

اخباروں کو ایک بیان دیتے ہوئے انھوں نے ان سختیوں اور بدسلوکیوں کی ایک لمبی فہرست پیش کی جو خدائی خدمت گاروں کے ساتھ کی گئی تھیں۔ پاکستان کی حکومت کہتی ہے کہ اس نے ہمارے اخبار پختوں کی زبان بندی نہیں کی۔ صرف اتنا ہوا کہ جب اس کے پراسانے سپیشل نے استعفیٰ دے دیا تو حکومت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اسے آئندہ کے لئے ڈکلیئریشن دینے سے انکار کر دیا۔ اگر ڈکلیئریشن نامنظور کر دینا جس کی وجہ سے اخبار بند ہو گیا۔ زبان بندی نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟“

اب رہا ضلع مروان میں شہری آزادی کا سوال تو مجھے اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی کہ میں اپنے دوستوں سے ملوں۔ جب مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑا تو سارے علاقے میں دفعہ ۱۴۱ مضابطہ فوجداری نافذ کر دیا گیا۔ مرواس کے جشن کے موقع پر یہی دفعہ سارے ضلع مروان اور ضلع پشاور میں نافذ کر دی گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ صحیح

کرے گی ؟

انھوں نے کہا معلوم نہیں حکومت مخالف پارٹیوں کی خبروں کو دبانے کے لئے کیا ترکیب کرتی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سرخ پوشوں کے دواہم جلسے ہونے جن میں اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ لیکن ان کی خبر کسی جگہ کے کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اخبار کے نمائندوں نے اتنی زحمت خواہ مخواہ نہیں اٹھائی تھی، آخر میں انھوں نے کہا کہ یہ باتیں اس وقت تو سمجھ میں آتی تھیں جب ملک میں بدسیوں کی حکومت تھی۔ مگر اب جبکہ پاکستان آزاد ہو گیا ہے اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک عوامی اسلامی حکومت وجود میں آئی ہے تو یہ کسی طرح عقل میں نہیں آتا کہ آخر صوبے کی حکومت نے وہی بدسی سامراجیوں کے پرانے نوکر شاہی طریقے کیوں استعمال کئے۔

بادشاہ خاں کے آخری سفر کراچی کے موقع پر ان کے ساتھ کوئی تیس خدای خدمت گار تھے جو اپنے خرچ پر اُٹے تھے اور ان کے باڈی گارڈ کا کام کرتے تھے۔ یہ لوگ اُن کے اپنے گاؤں اتمان زئی میں اور دوسری جگہ مسلح ہو کر پہرہ دیتے تھے تاکہ اگر ان پر قاتلانہ حملہ کیا جائے تو اُن کی حفاظت کریں۔ دس سال پہلے جب گاندھی جی اتمان زئی میں بادشاہ خاں کے مہمان تھے تو یہ سوال اٹھا تھا کہ گاندھی جی کی حفاظت کے لئے رات کو مسلح پہرہ لگایا جائے۔ بادشاہ خاں کو وہ گفتگو یاد تھی جو اس موقع پر گاندھی جی سے ہوئی تھی "بادشاہ خاں نے اپنے ساتھیوں کو کئی بار اس بات پر جھڑکا کہ وہ ان کی حفاظت کے لئے مسلح ہو کر پہرہ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسے عدم تشدد کے اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اُسے اپنا فرض سمجھ کر اس سے باز نہیں آئے۔ انھیں اپنے محبوب لیڈر کی طرف سے بڑی فکر ہے، اور ان کی وفاداری کو دیکھ کر دل پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں..... لیکن وہ کبھی پہرے سے غافل نہیں ہوتے..... ایک منٹ کے لئے بھی نہیں

ایک پارٹی میں جو بادشاہ خاں کے اعزاز میں کراچی میں دی گئی، سندھ کے اقلیت کے ایک نمائندے نے کہا کہ مہاتما جی کی زندگی میں وہ اپنی مشکلوں کو حل کرنے کے لئے ہمیشہ اُن کے پاس جایا کرتے تھے لیکن اب ان کی وفات کے بعد ایسے موقعوں پر وہ بادشاہ خاں

کے پاس جایا کریں گے " جس کی وہ ہمتا جی کے بعد سب سے زیادہ عزت کرتے ہیں " انھوں نے یہ درخواست کی کہ اس مشکل زمانے میں وہ ان کی رہنمائی کریں۔ بادشاہ خاں نے اس کے جواب میں اپنے ولی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ زمانہ سب کے لئے آزمائش اور مصیبت کا ہے۔ خدائی خدمت گاروں نے صوبہ سرحد میں اپنی وزارت بنالی تھی۔ لیکن چند سال کے بعد وہ ختم ہو گئی۔ اس لئے کہ وزارت نے عوام کی اتنی خدمت نہیں کی جتنی اُسے کرنی چاہئے تھی۔ اس نے جو وعدہ عوام سے کیا تھا اُسے پوری طرح نہیں نبایا۔ انھوں نے کہا کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو صوبہ سرحد کی وزارت کی کڑی جتایا کرتے تھے، لیکن نہ تو ورکنگ کمیٹی نے اس صورت حال کی اصلاح کی اور نہ خود وزارت نے۔

بادشاہ خاں نے کہا " آخر کار دنیا میں حق اور انصاف کا بول بالا ہو گا اور ملک کی ترقی بے غرض اور مخلص لیڈروں ہی کے ہاتھ ہو گی نہ کہ خود غرض اور خود مطلب زمانہ سازوں سے۔ ہندوستان اور پاکستان کے سامنے ترقی اور بہبودی کی راہ اسی وقت کھلے گی جب اُن کے لیڈروں میں یہ صفات ظاہر ہوں "۔

گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے مغربی پاکستان میں اقلیتوں کی مصیبت کی داستان بہت غور سے سنی۔ خدا کی طرف سے ہمیشہ انسانوں کا امتحان ہوتا رہتا ہے

اور صرف وہی قومیں اور افراد جو ان آزمائشوں کا مقابلہ صبر، استقلال اور تہمت سے کرتے ہیں، آخر میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد سے شمال مغربی سرحدی صوبے میں حاصل آڈینس کی حکایت ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کا باعث دراصل آزادی کی وہ لڑائی ہے جو پٹھان اور دوسرے لوگ ایک مدت سے لڑ رہے ہیں۔ اگر وہ انگریزوں کی اختیارات کے منتقل کرنے پر مجبور نہ کر دیتے تو پاکستان کبھی نہ بن سکتا۔ لیکن ملک کو چھوڑتے وقت انگریز حکمرانوں نے اختیارات ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ڈے جو آزادی کے لئے لڑ رہے تھے، بلکہ ان کو سونے جینھوں نے اُس کے لئے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

باو شاہ خاں نے یہ دعوے کیا کہ وہ سچے امن پسند ہیں، اور ہمیشہ اُس پر اصرار کرتے رہے ہیں کہ خدمت کا جو عہد غریبوں سے خدا کے سامنے کیا گیا ہے اس پر عمل کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ اسی لئے ان لوگوں کو یہ مصیبت اٹھانی پڑی۔ اس آزمائش کے وقت لوگوں کو اپنے غصے کو قابو میں رکھنا چاہئے، ایک کرطے اخلاقی ضابطے اور نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر حال میں اس پر عمل کرنا چاہئے، اور اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہی اخلاقی ضابطہ حکومت کے نظم و نسق پر بھی عاید کیا جائے۔

پٹھانوں کے ایک مجمع کے سامنے جو زیادہ تر مزدوروں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ خاں نے اپنی صاف گوئی کو خطرناک حد تک پہنچا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جماعت کی حیثیت سے صرف پٹھان ہی ایسے ہیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی ہے، اور انھیں کی بدولت پاکستان بن سکا۔ وہ سرمایہ دار طبقہ جس کے ہاتھ میں پاکستان کی حکومت ہے پٹھانوں سے اس لئے ڈرتا ہے کہ وہ خود غرضی سے پاک ہیں اور ملک کی خاطر تکلیفیں اٹھانے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ ”وہ ہمیشہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف رہے اور اس خوف ریزی اور ناقابل بیان مصیبت کے بعد تقسیم کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو اٹھانی پٹی یہ ثابت کر دیا کہ ان کی رائے صحیح تھی۔ مگر پھر بھی جب سے پاکستان بنا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا فائدہ خود ان کا فائدہ اور پاکستان کا نقصان خود ان کا نقصان ہے۔“

آخر میں بادشاہ خاں نے کہا ”پٹھانوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں شبہ ہے اور وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ان کا مقام کیا ہو گا۔ اگر واقعی ان کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کرنے کی نیت ہے تو پاکستان کے طرز حکومت اور دوسرے معاملات کے متعلق ان کی رائے لی جانی چاہئے۔ ہندوستان

میں صوبوں کے گورنر کے انتخاب میں صوبائی وزارتوں سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ لیکن صوبہ سرحد میں ایک انگریز افسر جسے پٹھان پسند کرتے ہیں، اُن کے سر پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ پٹھان یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ان کی حیثیت کیا ہوگی، کیا ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا جائے گا؟

خدائی خدمت گار اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے کہ پاکستان کے عوام کی موجودہ غربت اور پس ماندگی کو دور کیا جائے اور اس کو ششماں وہ ہر حال میں عدم تشدد کے جو ساری عمران کا اصول رہا ہے پابند رہیں گے۔

۵ اپریل کو بادشاہ خاں کی ملاقات قائد اعظم جناح سے ہوئی قائد اعظم نے اُن سے پوچھا کہ کیا خدائی خدمت گار مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے، اور صوبہ سرحد کی وزارت کے ساتھ کونیشن کی صورت میں تعاون کریں گے؟ اس کے جواب میں بادشاہ خاں نے پھر سے پٹان کی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہونے اور سرحد کی وزارت کی کونیشن بنانے سے معذور ہیں۔ اس کے بعد قائد اعظم نے ایک بہت بڑے جلسے میں اعلان کیا کہ ان کے اور بادشاہ خاں کے درمیان گفت و شنید ناکام رہی۔ انھوں نے پٹھانوں کو تاکید کی کہ ”وہ ایسے لوگوں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں کہ جو پاکستان کی وفاداری کا بہانہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کی بنیاد کو کم زور

کرنا چاہتے ہیں۔“

۱۳ مئی کو بادشاہ خاں نے اعلان کیا کہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ خدائی خدمت گاروں کی تحریک کو پاکستان کے سب صوبوں میں پھیلا دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ یہ جماعت پاکستان کی عوامی پارٹی کے لئے جو اسی وقت بنی تھی اور جس نے انھیں اپنا پہلا عارضی صدر منتخب کیا تھا ایک وائٹنگ بورڈ کا کام دے گی۔ اس پارٹی کا منہجہ اور مقاصد کے ایک مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو ایک مضبوط اور مستحکم ریاست اور سوشلسٹ جمہوریتوں کا ایک یونین بنائیں جس کی بنیاد عوام کے ارادے اور مرضی پر ہو۔ جس میں سب صوبوں کو پوری آزادی حاصل ہو اور جو ہمارے ریاستوں خصوصاً انڈین یونین سے دوستانہ تہذیبی تعلقات رکھے۔“

اس پارٹی کی کانفرنس نے ختم ہونے سے پہلے کئی روزلیوٹیشن پاس کئے جن میں صوبہ سرحد کی استبدادی پالیسی پر ملامت کی گئی جس نے خدائی خدمت گاروں کو جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان کے فائدے کو مد نظر رکھ کر یہ پالیسی بدل دی جائے اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان کے نیشنلسٹ لیڈر عبدالصمد خاں کو رہا کر دیا جائے۔“

کانفرنس نے یہ اعلان کیا کہ عوامی پارٹی اس پارٹی سے جو برسر حکومت ہے تعاون کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہے

"آئین ساز مجلس کے اندر بھی اور باہر بھی ایک متفقہ پروگرام کی بنیاد پر جو نئی ریاست کی سلامتی استحکام اور فلاح و بہبود کے لئے بنایا جائے۔"

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ جب تک اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ ہو اس پارٹی کی پالیسی یہ ہوگی کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کا ساتھ دے۔ بہت جلد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ پاکستان کی حکومت نئی عوامی پارٹی کے قیام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ صوبہ سرحد کے وزیراعظم خان عبدالقیوم خاں نے بھرپور پورسوں کے لیڈر خان عبدالغفار خان کو ایک ایسا دشمن قرار دیا جو پاکستان کی حکومت کی جڑ کھودنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ اور اس حلف و فاداری کے متعلق جو انھوں نے اور ان کی پارٹی نے اٹھایا تھا یہ کہا کہ "یہ ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں" اسی کے ساتھ انھوں نے یہ معنی خیز جملہ کہا "جب کبھی ہم اپنے امن پسند شہریوں کی بھلائی کے لئے مناسب سمجھیں گے۔ ضروری تدبیریں اختیار کریں گے۔"

بادشاہ خاں پر انتشار پیدا کرنے کا الزام لگایا گیا مگر ان کو کہنا یہ تھا کہ میں بہت سوچتا ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے ارباب اختیار کدھر جا رہے ہیں۔ وہ اسلام کا نام لے کر ریاست کے قوت اور استحکام کی اپیل کرتے ہیں لیکن اسی کے

ساتھ وہ ان لوگوں سے جو پاکستان کی قوت اور خوش حالی کے بنیادی مسئلے میں ان سے متفق ہیں لیکن اس کے طریقے کے بارے میں ایمان داری کے ساتھ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تنگ دلی اور تنگ نظری سے پیش آتے ہیں۔

ہمارے ہمسایہ ڈومینین ہندوستان میں تقسیم سے پہلے ہندو مہاسبھا اور ڈاکٹر امبیڈکر کا اچھوٹوں کا فیڈریشن برابر ہر قدم پر کانگریس کی مخالفت کرتا تھا۔ لیکن جیسے ہی ہندوستان آزاد ہوا سب مخالف پارٹیاں مل گئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر شیاما پریو نگرہی اور امبیڈکر اب نیٹ نہرو اور سرواڑ پٹیل کے رفیق کار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی جماعتوں کو کانگریس پارٹی میں ضم نہیں کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے وہ بہت افسوسناک ہے اور اگر یہی صورت حال وہی تو نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں کو بلکہ خود قوم کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ میں نے بارہا ان بیانات میں جو اخباروں کو دئے جو ان تقریروں میں جو مجمع عام میں کہیں پاکستان کی وفاداری کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں باہم تفریق کی جاتی ہے اور میری پارٹی کے لوگوں کے ساتھ مخالفت بلکہ دشمنی کا برتاؤ ہو رہا ہے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا :- ہم آپ کے نظم و نسق میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ ہم کو حکومت کی ہوس نہیں۔ وزارت آپ کو

مبارک ہو، ہم تو صرف اس کی اجازت چاہتے ہیں کہ اپنے تعمیری طریقے سے اپنے بھائیوں کی خدمت کر سکیں۔ مگر اس پر بھی وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔“

..... بادشاہ خاں صوبہ سرحد میں واپس آئے تاکہ نئی جمعیتہ العوام کا پروگرام اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ انھوں نے ضلع مردان میں ایک بہت بڑے جلسے کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا ”میں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا تاشادیکھ لیا۔ پاکستان کے لیڈروں میں اور پرانے انگریز حکام میں کوئی مطلق فرق نہیں ہے۔ اس حکومت کی حمایت میں جو دلیل نظام سب سے زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے اور عموماً پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نئی ریاست ابھی ایک نوزائیدہ بچہ ہے۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کو دیکھو جس کے لیڈروں نے سخت طوفان کے باوجود ریاست کی کشتی کو کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے اپنا نیا آئین بنا لیا ہے۔ درآں حالیکہ پاکستان میں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔“

اس سے ہم صرف یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ لیڈر جمہوری نظام سے ڈرتے ہیں۔ یہ لیڈر جنھیں اپنے اپنے فائدے کی فکر ہے۔ پاکستان کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں، افسوس کی بات ہے کہ یہ سب مہاجرین ہیں اور پاکستان کے

اصلی باشندے نہیں ہیں۔

میں اس موقع پر تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی یا قرآنی قانون جس کے لئے تم اتنے دن سے چلا رہے ہو، اور جس کی خاطر تم نے اور تمہارے عزیزوں نے اپنی جانیں قربان کی ہیں، پاکستان میں کبھی نافذ نہیں ہوں گے۔

انھوں نے اپنی تقریر کو ان پر زور الفاظ پر ختم کیا "میرے افغان بھائیو! میں تمہیں یہ جتاننا چاہتا ہوں کہ تم پاکستان کی ریاست میں حصہ دار ہو، اس کا چوتھائی حصہ تمہارا حق ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم مل کر اٹھ کھڑے ہو، اور یہ عہد کرو کہ اپنا حق لے کر رہو گے۔ تم متحد ہو جاؤ اور مضبوط ارادے سے کام لے کر ان ریت کی دیواروں کو گرا دو جو پاکستان کے لیڈروں نے تمہارے گرد کھڑی کر دی ہیں۔ ہم موجودہ صورت حال کو اب برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنی کمریں کس لو اور اپنی منزل کی طرف بڑھے چلو۔ تمہاری منزل ان پٹھانوں کی آزادی ہے۔ جنھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ ہم اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک پٹھانستان یعنی پٹھانوں کی حکومت پٹھانوں کے ذریعے سے اور پٹھانوں کے لئے قائم نہ کر لیں۔" تین دن بعد وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے بیٹے عبدالولی خاں اور دو اور سرخ پوش لیڈر بھی پکڑ لئے گئے۔

بندہ داؤ شاہ کے چھوٹے سے کچھ ڈاک بنگلے میں جو بنوں کی بڑی سڑک پر واقع ہے۔ اُن کے مقدمے کی سرسری تحقیقات ہوئی۔ ان پر "بغاوت" کا اور پاکستان کے دشمن فقیر ایسی کے ساتھ تعاون کا ارادہ رکھنے" کا الزام لگایا گیا۔ کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے جس کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تھا اُن سے کہا کہ اپنی صفائی پیش کریں۔ انھوں نے ارتکابِ جرم سے انکار کیا۔ مگر اس کے سوا اور کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ اس پر مجسٹریٹ نے پوچھا کہ کیا آپ صوبہ سرحد کے ضابطہ فوجداری دفعہ ۴۰ کے مطابق تین سال کے لئے نیک چلنی کا پھلکہ دینے پر تیار ہیں۔ بادشاہ خان نے جواب دیا کہ "میں نے ایسے پھلکے نہ کبھی دئے ہیں اور نہ اب دوں گا۔ چنانچہ انھیں تین سال کی قید یا مشقت جو اس جرم کی کم سے کم سزا ہے دی گئی۔

بادشاہ خان کی گرفتاری کے فوراً بعد صوبہ سرحد کی حکومت نے اپنے اس اقدام کی توجیہ کے لئے ایک کمیونکے شائع کیا جس میں کہا گیا کہ باوجود اس کے کہ ہندوستان کی تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی رضا مندی سے ہوئی، عبدالغفار خان پاکستان کے قیام کے قطعاً مخالف ہیں "یہ بات صحیح نہیں تھی۔ عبدالغفار خاں ستمبر ہی میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ وہ پاکستان کو قبول کرتے ہیں البتہ وہ یہ چاہتے تھے کہ پشتو بولنے والے لوگوں کو بے وطن

میں جس کا نام انھوں نے پٹھانستان رکھا، وہی حیثیت اور حقوق حاصل ہوں جو سندھیوں کو سندھ میں، پنجابیوں کو پنجاب میں اور بنگالیوں کو بنگال میں ہیں۔ بہر حال اس کمیونکے میں یہ لکھا تھا "انھوں نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا کہ ۱۵ اگست کے جشن آزادی میں شرکت نہ کریں" اور پاکستان کی نئی ریاست کا حلف وفاداری نہ اٹھائیں۔ اسی لئے ان کے بھائی کی وزارت جو ان دنوں برسر حکومت تھی، پاکستان سے غدار کی بنا پر برخاست کر دی گئی تھی۔" ظاہر ہے کہ یہ الزام اسی وقت غلط ثابت ہو گیا جب بادشاہ خاں نے کراچی میں حلف وفاداری اٹھایا، اور صاف صاف الفاظ میں پاکستان کی ریاست سے سچی وفاداری کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو الزام ان پر لگایا گیا اُسے ان کے بھائی کی وزارت سے "جو ان دنوں برسر حکومت تھی" کیا تعلق ہے؟ کیا یہ وہی پرانا قصہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بھڑپے نے مہینے پر یہ الزام لگا کر کہ وہ اس کا پانی گدلا کر رہا ہے اُسے ہڑپ کر لیا تھا۔ اس کے بعد کمیونکے میں یہ الفاظ تھے "اسی کے ساتھ انھوں نے نام نہاد جمعیت العوام کو قائم کر کے اپنے دائرہ عمل کو وسیع کر لیا" کوئی پوچھے کہ یہ کون سا جرم تھا اور پاکستان کے پرانے کانگریسی عناصر کو اکٹھا کر لیا۔ ظاہر ہے جسے سزا دینا ہو، اس پر کچھ الزام تو لگانا ہی چاہئے "دوسری بار کراچی جانے کے بعد..... بادشاہ خاں

نے سوچ سمجھ کر اور پورا انتظام کر کے صوبے میں شورش کرنے کی
 کوشش کی۔ عین اس وقت جب ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت
 کچھ اشتہار دیا گیا تھا، صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی، اگر کوئی ایسی
 سازش تھی کہ بادشاہ خاں کی مفروضہ جدوجہد اسی وقت شروع ہو
 جب ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت کچھ اشتہار دیا گیا تھا،
 صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی، ”دور اصل یہ حملہ کیونکے مصنف
 کے ذہن کی پیداوار تھی، تو پاکستان کی حکومت بھی اسی سازش
 میں ضرور شریک رہی ہوگی، تبھی تو اس نے اُمن ساز اسمبلی کا جس میں
 بادشاہ خاں حلف وفاداری اٹھانے کے لئے گئے تھے ٹائم ٹیل
 ایسا بنا یا کہ وہ اس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ٹھیک وقت پر
 اپنے صوبے میں پہنچ سکیں۔“ گڑھی حبیب اللہ کی بم باری ”جو ہندوستان
 کی ہوائی فوج نے کھر کی وجہ سے غلطی سے کر دی تھی اور جس کے نتیجے
 میں ہندوستان کی حکومت نے فوراً علانیہ معافی مانگی تھی“ نے بادشاہ خاں
 کو اور گسایا۔ ”دیہ اس شخص کا ذکر ہے جس نے حال ہی میں گراچی میں کہا
 تھا کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد سے وہ پاکستان کے فائدے
 کو اپنا فائدہ اور اُس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا ہے“ اور
 وہ گاؤں گاؤں بھر کر لوگوں سے کہنے لگے کہ پاکستان ایک ریل کے
 پل کی طرح ہے جو ایک ہی دھکے میں بیٹھ جائے گا۔ ”یہ بات اُن کے
 الفاظ کو زبردستی توڑ مروڑ کر کہی گئی۔ حقیقت میں انھوں نے“

کہا تھا کہ پٹھانوں کو متحد ہو کر ان ریت کی دیواروں کو گرا دینا چاہیے جو پاکستان کے لیڈروں نے ان کے گرد کھڑی کر دی ہیں۔ "تاہم ان کے حقوق کو محدود کر دیں۔ کمیونیکے کے آخری الفاظ یہ تھے "اپنی تقریریں میں مجھ وہ آخری سے کر رہے ہیں وہ نہ صرف حکام کو برا بھلا کہتے ہیں بلکہ لوگوں کو واقعی ہکسا رہے ہیں کہ اس حکومت کے خلاف جو جائزہ طور پر قائم ہوئی ہے شورش برپا کریں۔ اب آپ ان الفاظ کا مقابلہ بادشاہ خاں کے اس بیان سے کیجئے جو انھوں نے صاف دلی سے ۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو کوئٹہ میں اپنی گرفتاری سے ایک مہینے پہلے دیا تھا "مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اس اپیل کے جو میں نے حال میں اپنے مخالف پارٹی کے دوستوں سے اخباروں اور تقریروں کے ذریعے سے کی تھی انھوں نے جمعیتہ انعام کے قیام کو سہاروی کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ وہ میری پارٹی والوں کی نیت پر بار بار شبہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ محض اس لئے کہ وہ ایک زمین میں ہندوستان کی نیشنل کانگریس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات اس وجہ سے اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے کہ اس جمعیت نے اپنے خاص رزولوشن میں جب وطن کے جذبے کے ساتھ غیر مشروط طور پر حکومت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ ہمارے حریفوں کے نزدیک ریاست سے وفاداری کا معیار یہ ہے کہ ایک پارٹی کی حکومت کے سامنے بے چون و چرا سر جھکا دیا جائے "دنیا سے یہ توقع کرنا بے جا ہے کہ وہ اس بات کو

مان لے گی کہ وہ شخص جس کو ساری عمر اپنی قوم کو تشدد سے باز رکھنے کی لگن رہی جو اسے اُن کے لئے ملک سمجھتا تھا جس نے خوفناک پٹھانوں کو عدم تشدد کا پابند بنا کر دنیا کو حیران کر دیا جس کے خلوص اور سچائی کی گاندھی جی نے اچھی طرح جانچ کرنے کے بعد شہادت دی تھی۔ اس جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ ہزار بار خالص عدم تشدد کا اور پاکستان کی وفاداری کا دعوے کرنے اور مجمع عام میں اس کی خیر خواہی کا اعتراف کرنے کے بعد ایک دم سے اپنے عقیدے سے پھر جائے گا اور ان اصولوں کو جن کا وہ عمر بھر پابند رہا چھوڑے گا راقم الحروف جسے بادشاہ خاں کی دوستی اور ہم طعامی کا فخر حاصل ہے اور جو گاندھی جی کے زیر سایہ اُن کے گھر میں خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے رہ چکا ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ آج ہندوستان یا پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بادشاہ خاں کی طرح گاندھی جی کے حق اور عدم تشدد کے اصولوں کا اور اُن کی گہری روحانیت کا مجسمہ ہو جو ان کی طرح خدا پر عقیدہ رکھتا ہو اس کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہو اور اس کے بندوں کی دل و جان سے خدمت کرتا ہو۔

ابھادو پوریا نے جو گاندھی جی اور بادشاہ خاں دونوں کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے جتنا کوئی اور نہیں جانتا ہوگا، لکھا تھا مجھے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو پاکبازی اور زہد و تقویٰ اور اسی کے ساتھ رقت قلب اور خدا پر سچا عقیدہ رکھنے میں بادشاہ خاں سے بڑھ کر بلکہ ان کے برابر بھی ہو۔

”وہ خدائی خدمت گار“ از جہادیو پوریا

خان بھائیوں کی مسلسل اسیری مہذب دنیا کے ضمیر کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اگر بے گناہوں کی جنموں نے اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ قربانی کی مثال دیکھنی ہو تو ان دلیا بھائیوں کو خصوصاً بادشاہ خاں کو دیکھئے۔ ان کے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی کا جذبہ نہیں بادشاہ خاں کی کوئی ذاتی غرض نہیں، کوئی شخصی حوصلہ نہیں "میں ساری عمر ایک سپاہی رہا ہوں اور مرتے وقت تک سپاہی رہنا چاہتا ہوں" ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں کانگریس کا صدر بننے سے انکار کیا تھا۔ انھوں نے اپنی خوشی سے ضبط نفس کے لئے ہر طرح کی جسمانی تکلیفیں اٹھانے کی عادت ڈالی۔ سفر کے زمانے میں وہ اپنا سامان خود اٹھاتے تھے اور تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملنے کے لئے بوسہ آئے تو ان کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا تھا "جب فاصلہ اتنا ہو جسے وہ پیدل طے کر سکیں تو کبھی سواری استعمال نہیں کرنے، لیکن جب اس کے بغیر کام نہ چل سکے تو وہ بے بسی سواری ڈھونڈتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے تعیشات سے پرہیز کرتے ہیں اور نہایت سادی غذا استعمال کرتے ہیں۔ انھیں لوگوں کی اطاعت اور سچی و فاداری حاصل ہے۔ اس لئے کہ وہ خود ان صفات کا مجسمہ ہے۔

خان بھائیوں کو پاکستان کی حکومت سے جو اختلاف بھی ہو

مگر ان کی دیانت داری شبہ سے بالاتر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تقسیم کے بعد جب میں آخری مرتبہ گاندھی جی کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۷ء اور جنوری ۱۹۴۸ء میں ٹھہرا تھا تو بادشاہ خاں نے گاندھی جی کو یہ پیام بھیجا تھا کہ آپ میری طرف سے یا ڈاکٹر خان صاحب کی طرف سے کوئی فکر نہ کیجئے۔ ہم آپ سے ملنے یا آپ کو خط لکھنے سے خاص کر کے پرہیز کرتے ہیں تاکہ پاکستان کے ساتھ ہماری وفاداری کے بارے میں کوئی شبہ نہ کیا جاسکے۔ ان دونوں کے ساتھ یہ بڑا ظلم ہوگا کہ ان پر دھوکے یا دوغلے پن کا شبہ کیا جائے۔ وہ اس قسم کی حرکتیں کر ہی نہیں سکتے۔ انھیں اپنے ملک سے اور اپنی قوم سے گہری اور دالہا نہ محبت ہے۔ بادشاہ خاں فطری طور پر سیدھے سادے اور کھڑے واقع ہوئے ہیں اور کبھی کبھی ایسے بھولے پن کی باتیں کرتے ہیں کہ دوسرا آدمی گھبرا جاتا ہے۔ ایسا شخص کبھی اس ریاست کا دشمن نہیں ہو سکتا جو اپنے آپ کو اسلامی ریاست کہتی ہے۔

خان بھائی اس مٹی کے بنے ہیں جس سے ہیرو اور شہید بنتے ہیں۔ وہ اس مقصد کی خاطر جس کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی گزار دی، خوشی سے جان دینے پر تیار ہو جائیں گے ”مجھے پوری طرح یقین ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ جب تک وہ مجھ سے جیل کے باہر کام لینا چاہتا تھا اس نے مجھے جیل سے باہر رکھا۔ اب اس کی مرضی یہ ہے کہ میں اندر رہ کر کام کروں میں اسی میں

خوش ہو جو اس کی خوشی ہو، یہ الفاظ بادشاہ خاں نے اس وقت کہے تھے جب وہ واروہا سے اس زمانے کی بھی حکومت کے حکم سے گرفتار کر کے لے جائے گئے تھے اور انھیں تین سال کی قید سخت کی سزا دی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی وہ یہی الفاظ دہراتے ہوں گے۔ اس لئے وہ جہاں ہیں اچھے ہیں۔ لیکن انصاف سے کہئے کہ کیا اسے خدائی خدمت گاروں سے اس سے بہتر کام نہیں لیا جاسکتا تھا کہ انھیں جیل کی دیواروں کے اندر زندہ دفن کر دیا جاتا کاش آج ہندوستان کا کوئی خدمت کرنے والا بادشاہ خاں کی طرح با خدا بے نفس، حق شناس اور سچی تنقید کرنے والا ہوتا جو حکومت کو تنبیہ کرتا رہتا اور اسے سیدھے راستے پر چلاتا جو ان کی سی کھری سیرت، بے لاگ دیانت رکھتا اور جسے حضرت مسیح کی طرح غریبوں اور بے کسوں سے محبت اور مہر دی ہوتی اور جو اپنی زندگی کے ہر سانس کو ان کی آزادی اور خدمت کے لئے وقف کر دیتا۔ اگر دونوں ملکوں میں ایسے دو آدمی ہوتے تو یہ ان دونوں بلکہ شاید سارے ایشیا اور پوری دنیا کے لئے امن اور سلامتی کی بہترین ضمانت ہوتی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بادشاہ خاں میں کوئی خامی یا کمزوری نہیں ہے۔ کون انسان اس سے خالی ہے؟ ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ انگریزوں کی بات پر شبہہ کرتے ہیں۔

کے بارے میں میں گاندھی جی کی رائے بیان کر چکا ہوں۔ بات یہ ہے کہ انسان ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا واقعات اس سے بناتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ سلسلہ اولیٰ میں گاندھی اردن معاہدے کے بعد گاندھی جی انھیں سرگرفیتھ سے ملنے کے لئے گئے۔ بادشاہ خاں بڑے فسرد سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سیدھا سا دارا آدمی ہوں اور ڈپلو میسی نہیں جانتا ہوں۔ گاندھی جی نے انھیں سمجھا بجھا کر راضی کیا۔ جب سرگرفیتھ سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ خاں نے اُن سے کہا ”میں ایک صاف آدمی ہوں اور صاف باتیں پسند کرتا ہوں۔ میرے ساتھ ڈپلو سی نہ برتیے گا“ انھوں نے جواب دیا ”خاں صاحب سیاست ایک شطرنج کا کھیل ہے جس میں دونوں طرف سے چالیں چلی جاتی ہیں۔ میں آپ کو مات دینے کی کوشش کرتا ہوں، آپ کو موقع ملے تو مجھے مات دیجئے“ بادشاہ خاں نے کہا ”تو پھر میں آپ کے ڈھب کا آدمی نہیں ہوں“ اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرگرفیتھ نے حکمت علی سے اپنا طرز بدل دیا۔ انھیں روک لیا اور ملاقات جاری رہی۔ اس کے کئی سال بعد بادشاہ خاں نے اس کے نتیجے کو بیان کیا ”میں نے اپنی تجویز اُن کے سامنے رکھی کہ قبائلیوں میں جا کر اور محبت کے ساتھ ان کی خدمت کریں ان کے دلوں کو ہاتھ میں لیا جائے..... مگر اس پر غور کرنے کے بجائے انھوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا“ وہ حد سے زیادہ

حساس ہیں اور کبھی کبھی اُن کے مزاج میں چڑچڑاہٹ آ جاتا ہے۔ وہ صاف گو اور منہ پھٹ ہیں، اور جب کبھی انہیں غصہ آ جاتا ہے تو اُن کے منہ سے گرم لاوا کی طرح الفاظ ابلنے لگتے ہیں اور مٹسنے والے کی روح کے اندر جھوٹ کی کھیتی جل جاتی ہے۔ لیکن اُن کے غصے میں عداوت نہیں ہوتی۔ انہیں غصہ برائی پر آتا ہے۔ برے آدمی پر نہیں آتا۔ پھر بھی ستیہ گرہ کے نقطہ نظر سے یہ ایک خامی ہے اس لئے کہ ستیہ گرہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ سچی بات جب محبت بھرے دل سے نکلے تو اس میں سختی نہیں ہوتی چاہئے۔ سارا معاملہ یہ ہے کہ انسان کو اس کا ڈھب آتا ہو۔ اسی طرح ان کی بعض اور کمزوریاں بھی گنائی جاسکتی ہیں۔ خدا اپنے سچے خدمت گزاروں کی غلطیوں کو درست کر دیتا ہے۔ مگر اُن سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ عدم تشدد کا قانون اُٹل ہے۔ اور اگر اس پر عمل کرنے میں ناخبرکاری سے کام لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ فوری مقصد میں ناکامی ہو، مگر یہ نام نہاد ناکامی عدم تشدد کی نہیں ہوتی بلکہ اس ناقص ذریعے کی ہوتی ہے جس سے وہ ظاہر کیا جائے۔ بجائے اس کے کہ اس سے انسان کا عقیدہ کمزور ہو یا اس پر بالورسی غلبہ ہو عدم تشدد کے پیرو کو چاہئے کہ توفیق الہی کے لئے۔ جس کے بغیر انسان کوئی چیز نہیں، اور زیادہ دعا کرے۔

”انسان کو اس سے زیادہ نہیں دیا گیا۔“

۳۷۱
www.Laibach.com
اس کی روح میں صرف اتنی ہی طاقت ہے
کہ جو آج سیکھے، اس پر کل عمل کرنے۔

اس کے لئے یہ کام کیا کم ہے
کہ صنّاع حقیقی کو کام کرتے ہوئے دیکھے
اور اس سے کاری گری کے حقیقی گُر

اور اوزاروں کا صحیح استعمال تھوڑا بہت سیکھ لے۔“

اب رہے خدائی خدمت گار تو جو خبریں اس کے بارے
میں مل رہی ہیں کہ بادشاہ خاں کی اسیری کے زمانے میں انھیں
اپنے سردار کی وفاداری کے جرم میں کیا کچھ جھگڑنا پڑ رہا ہے
اگر ان کا ایک شتمہ بھی صحیح ہے تو انھیں بڑی سخت آزمائش کا
سامنا کرنا ہے۔ انھیں گاندھی جی کے یہ الفاظ جن میں آئندہ کی
خبر دی گئی ہے، یاد رکھنے چاہئیں :-

”اگر آخری مقابلے میں خدائی خدمت گار اس عسیدے
میں سچے ثابت نہ ہوئے جس کی پابندی کا وہ دعوے کرتے
ہیں تو ظاہر ہوگا کہ دراصل عدم تشدد ان کے دل میں نہ تھا
یہ آزمائش کا موقع بہت جلد ملے گا۔ اگر وہ جو سن اور خلوص
سے تعمیری پروگرام پر عمل کرتے رہے تو ان کے لئے کوئی
خطرہ نہیں۔ وہ امتحان کے وقت دنیا کے سب سے زیادہ
بہادر آدمی ثابت ہوں گے۔“

”عدم تشدد کسی کی اجازت کا پابند نہیں۔ وہ آپ ہی اپنی
 مہر اور اپنی سند ہے۔ وہ بے گناہ قربانی اور ظاہری شکست
 کے ذریعے سے ہر معرکے کو سر کر لیتا ہے۔ وہ کبھی ناکام نہیں
 ہوتا۔“

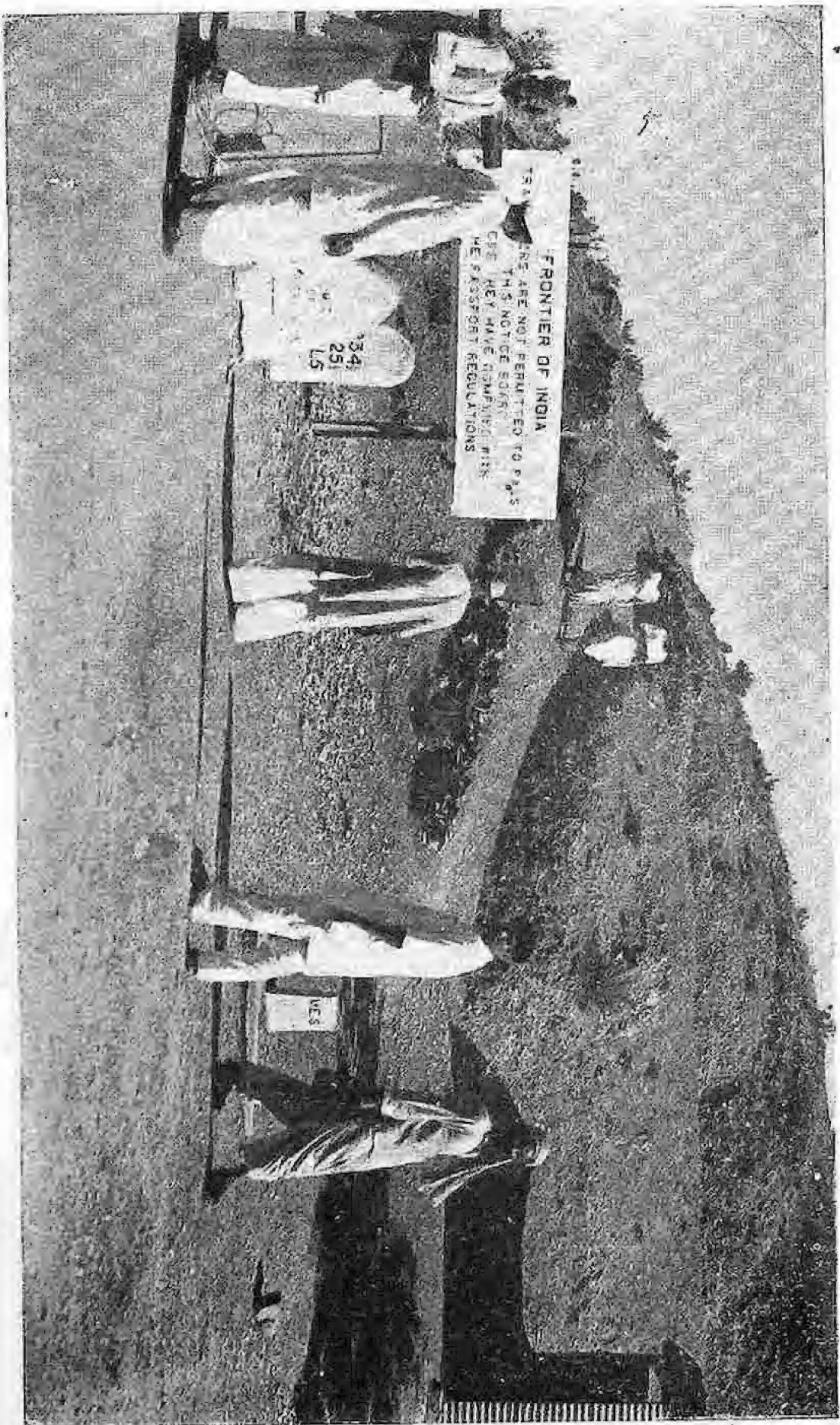
آپ لوگوں نے بنی نوع انسان کی ہمدردی کے لئے جو نیک کام شروع کیا ہے اس سے مجھے پورا پورا اتفاق ہے۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اس پاک مقصد میں کامیاب کرے۔

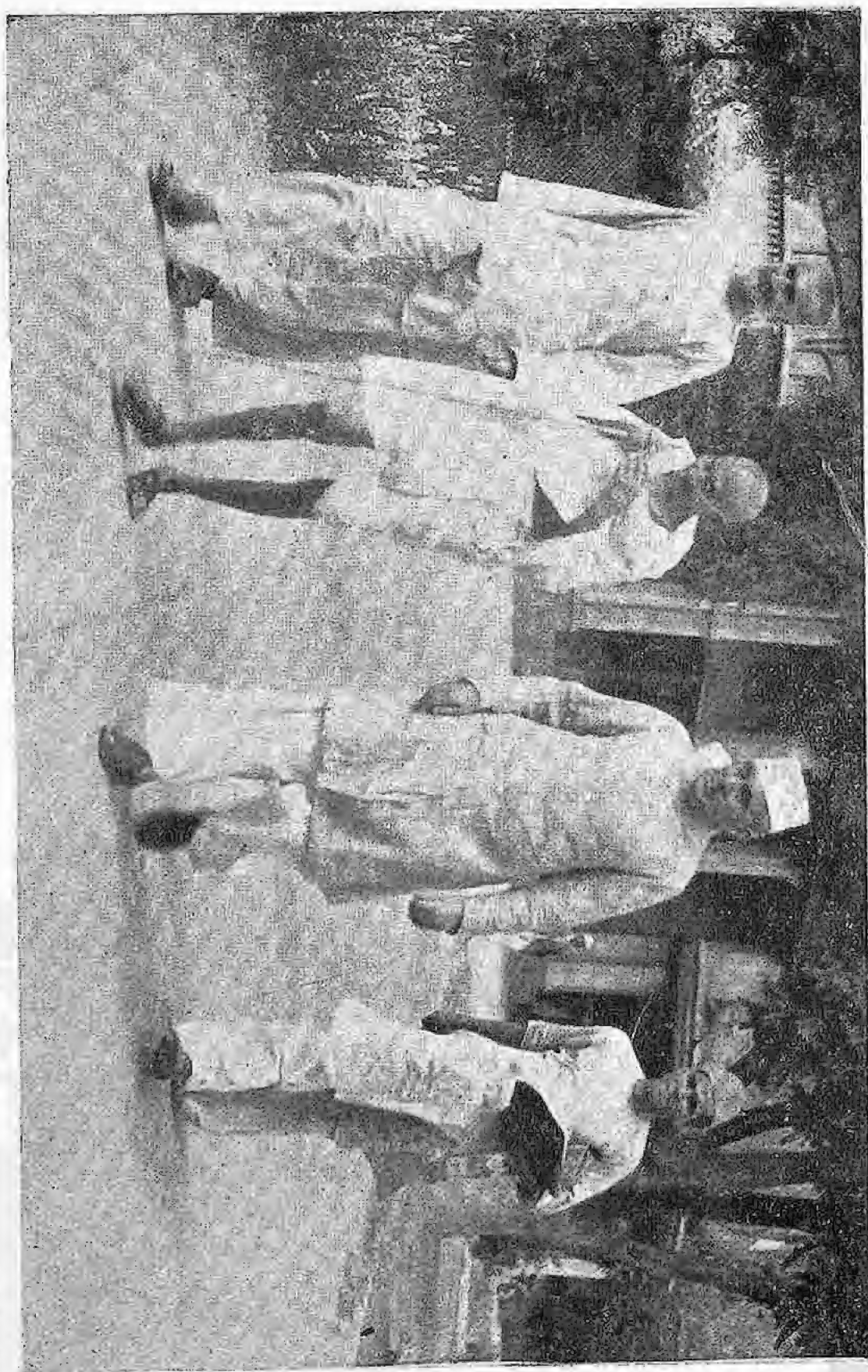
دستخط عبدالغفار

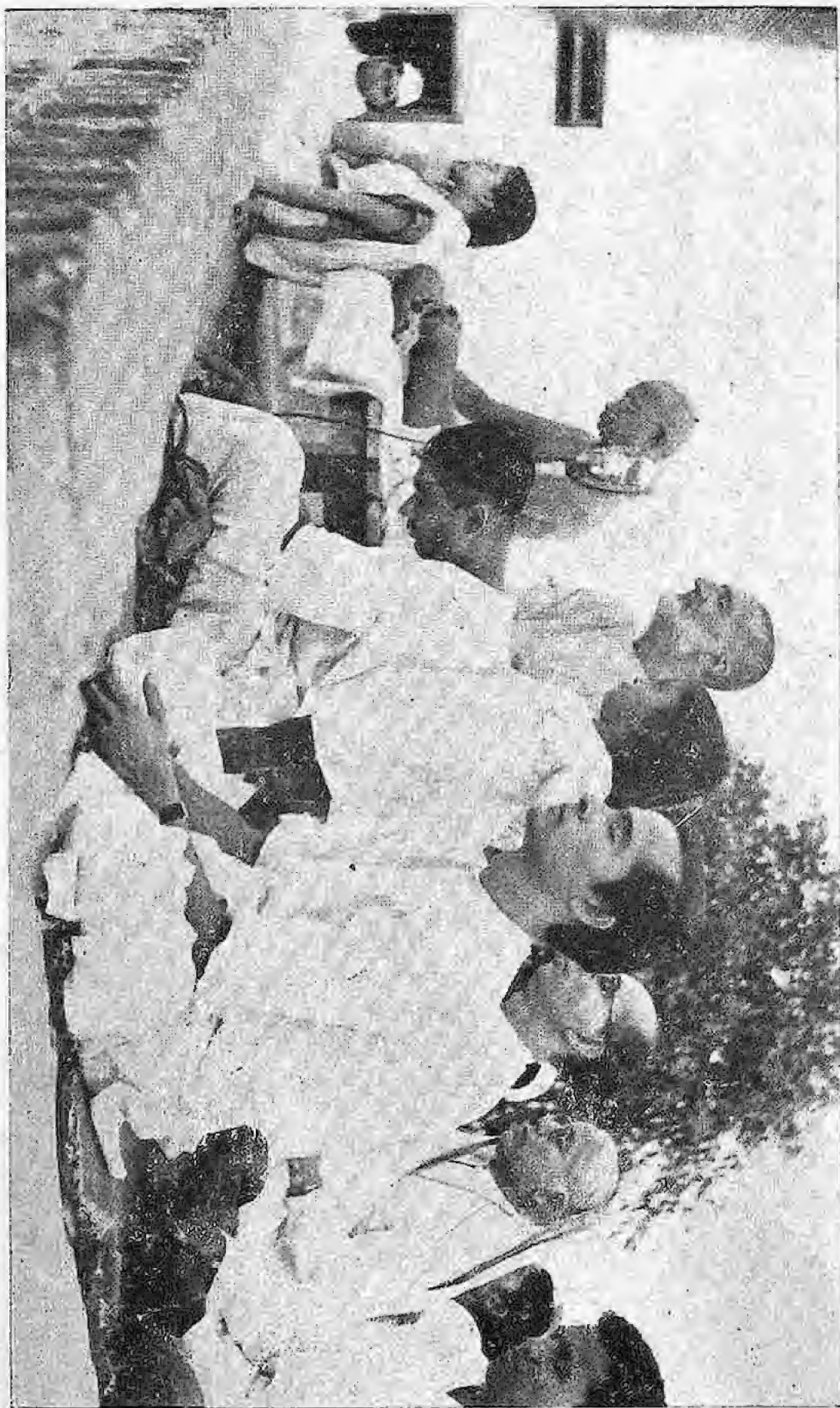
(قیدی)

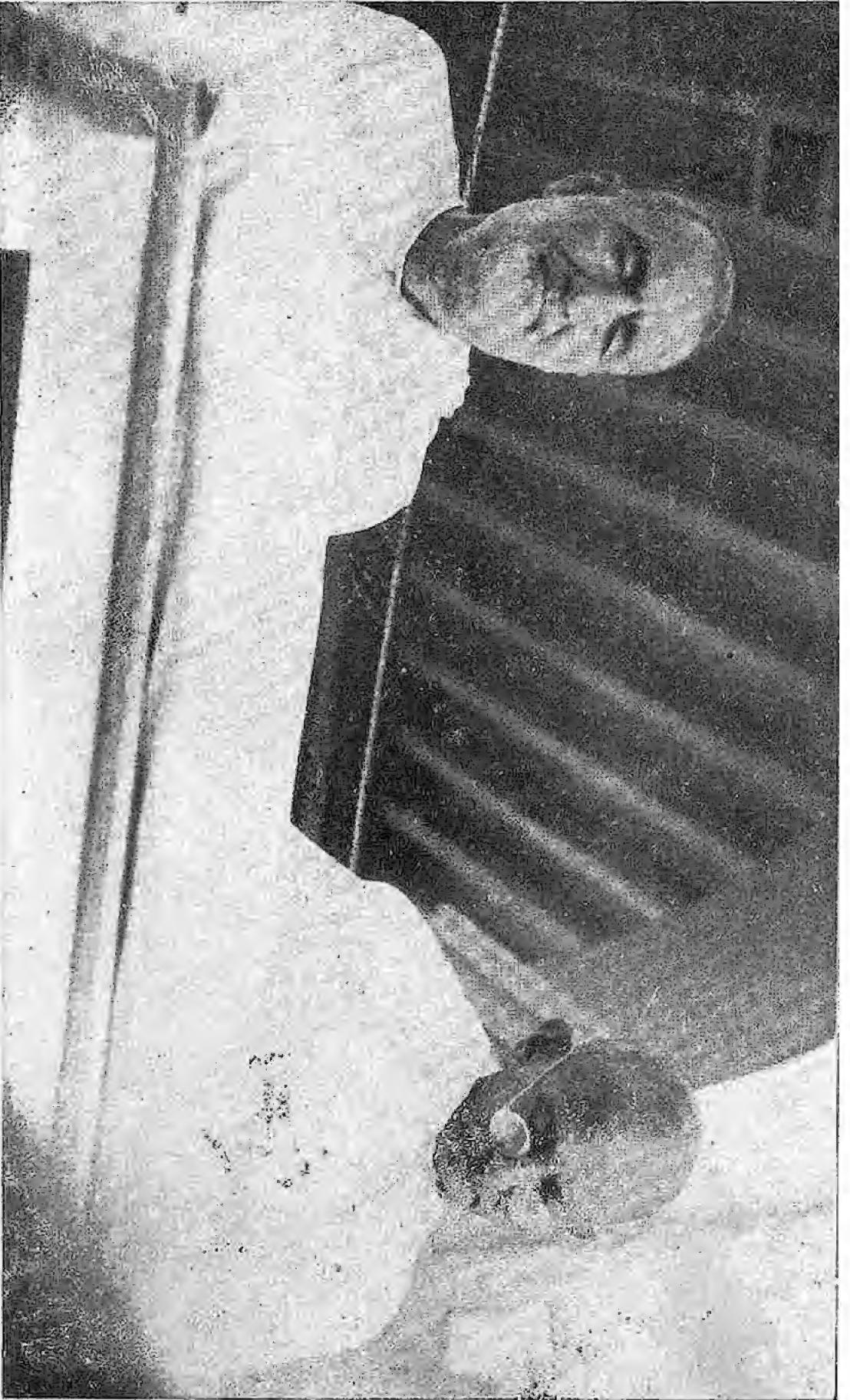
۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء

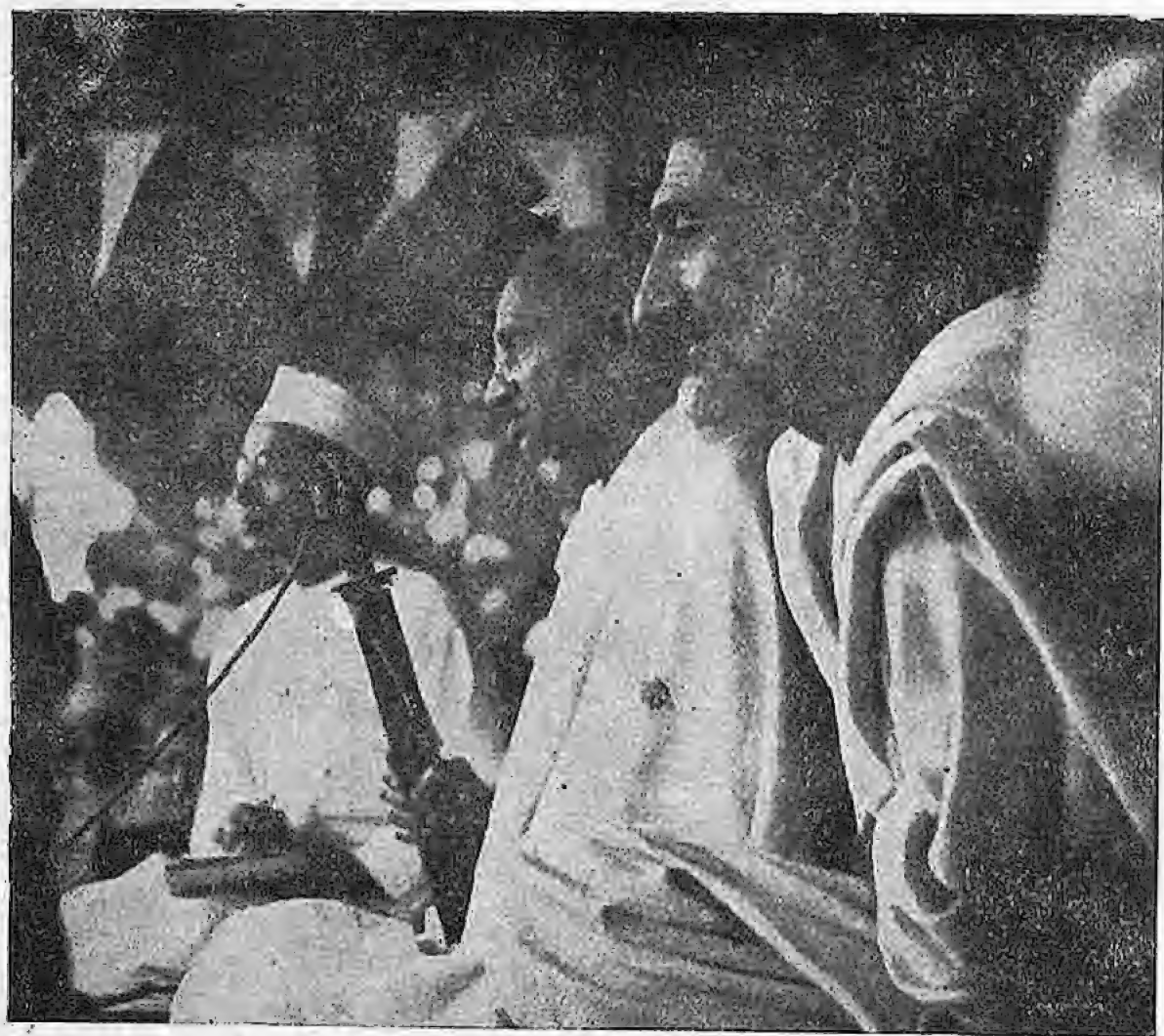


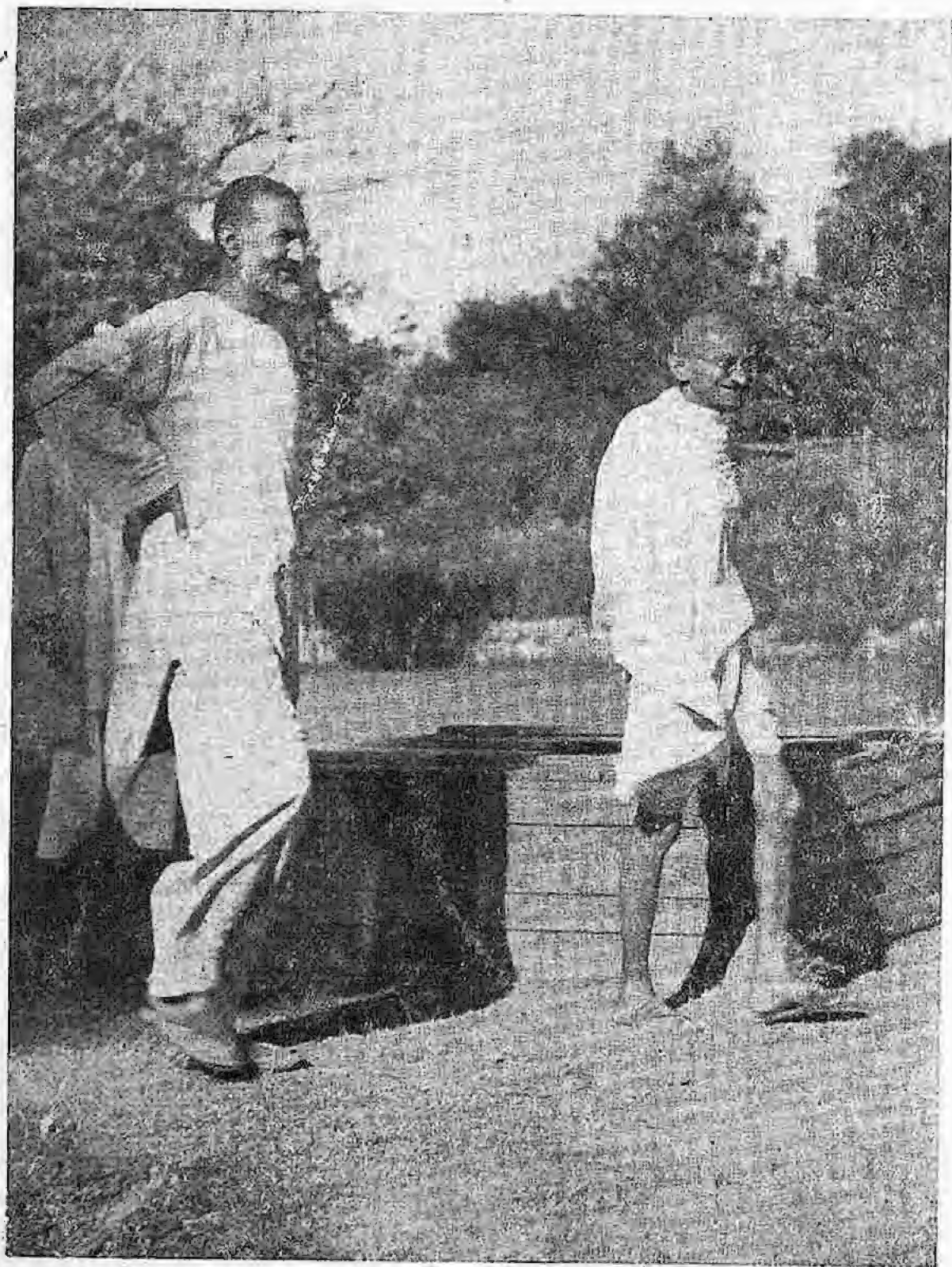


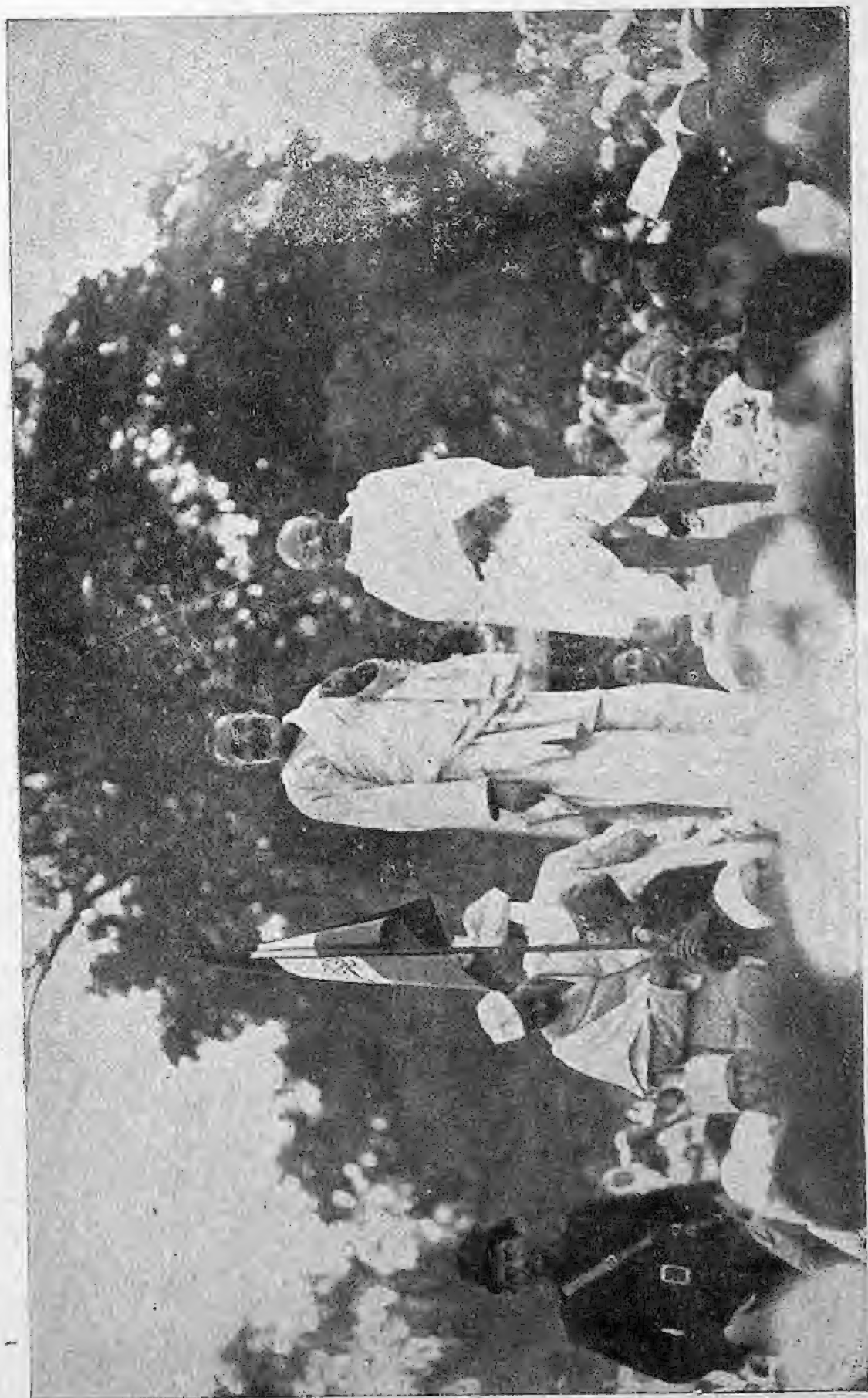


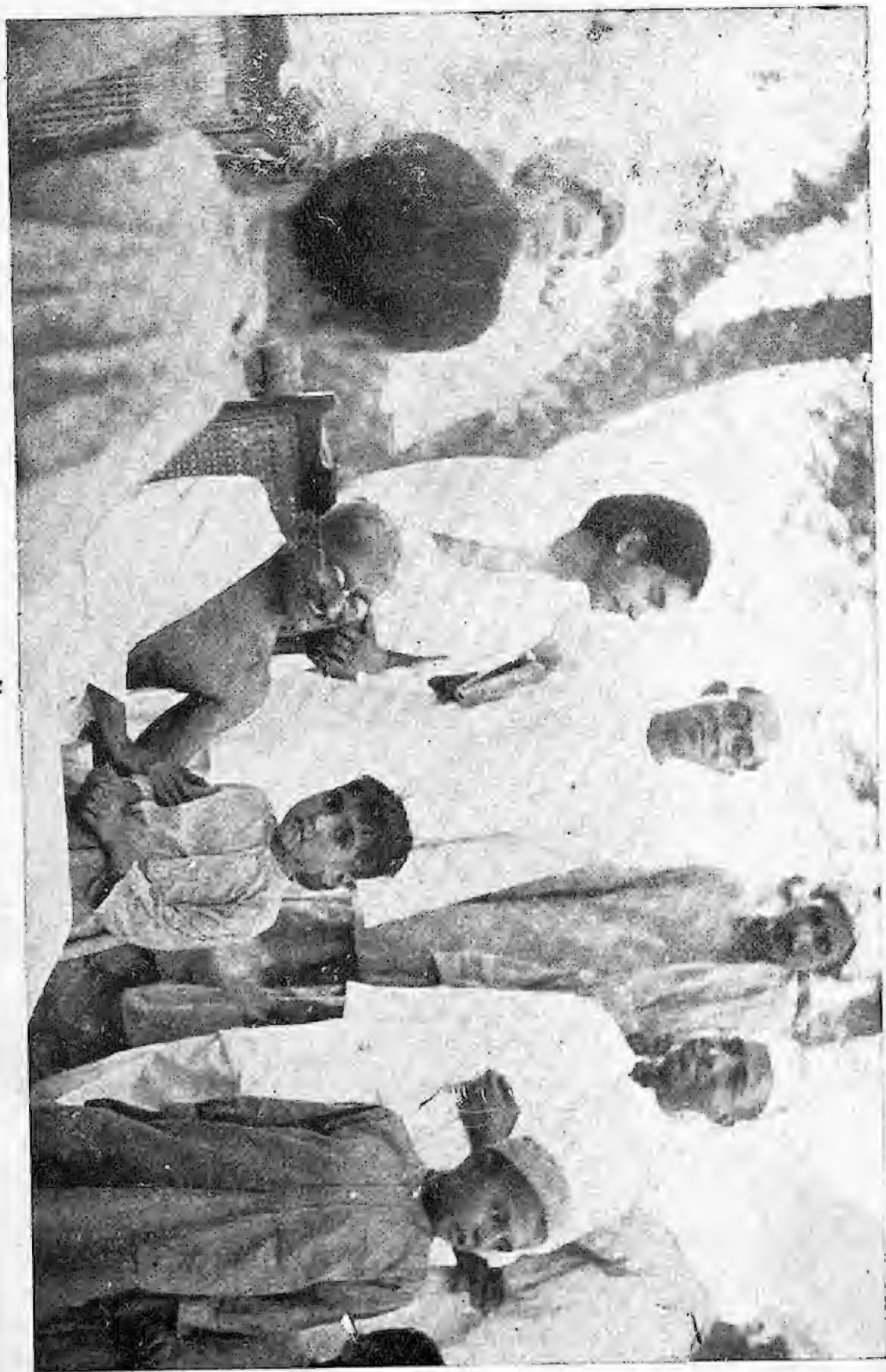


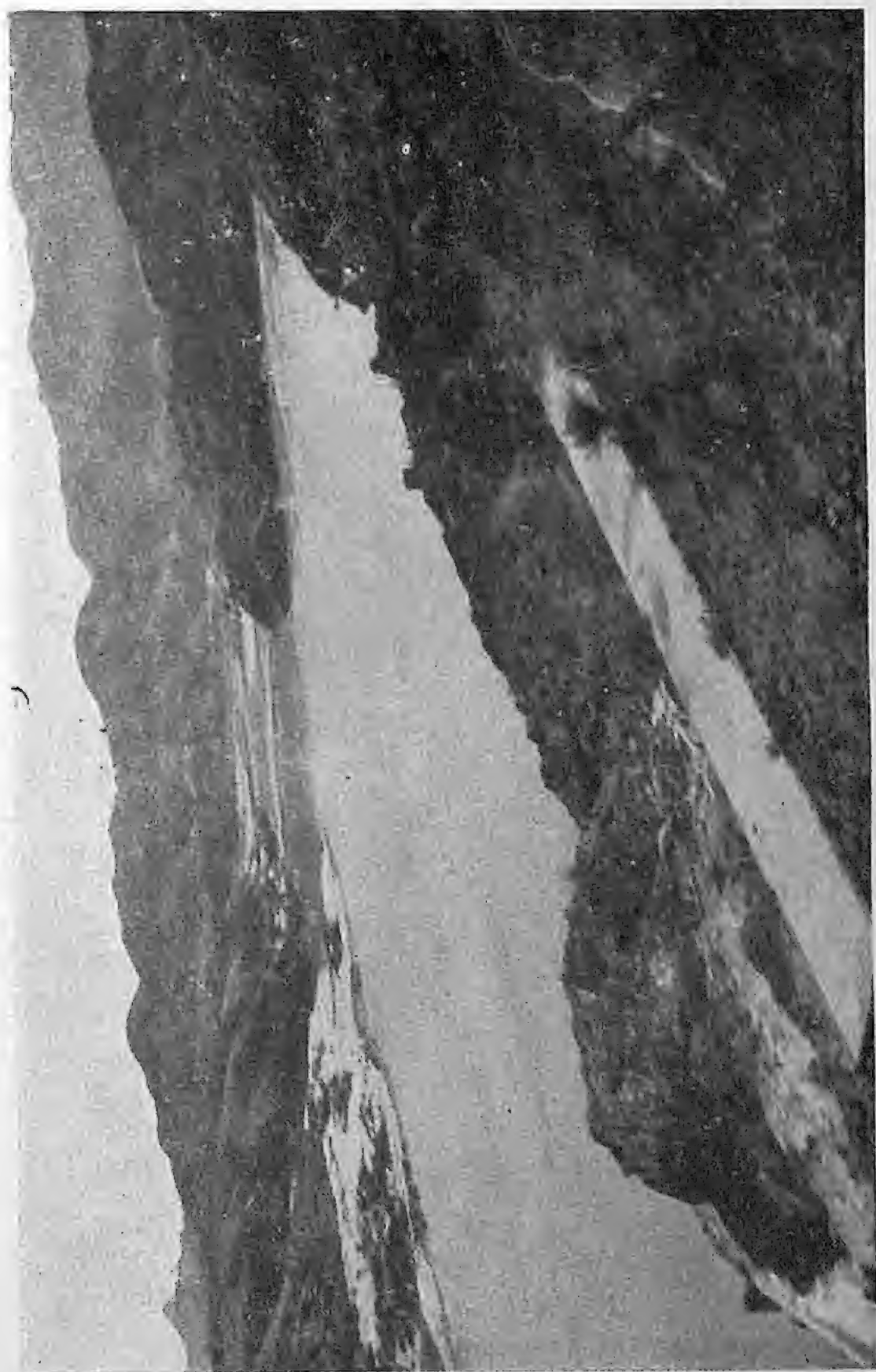


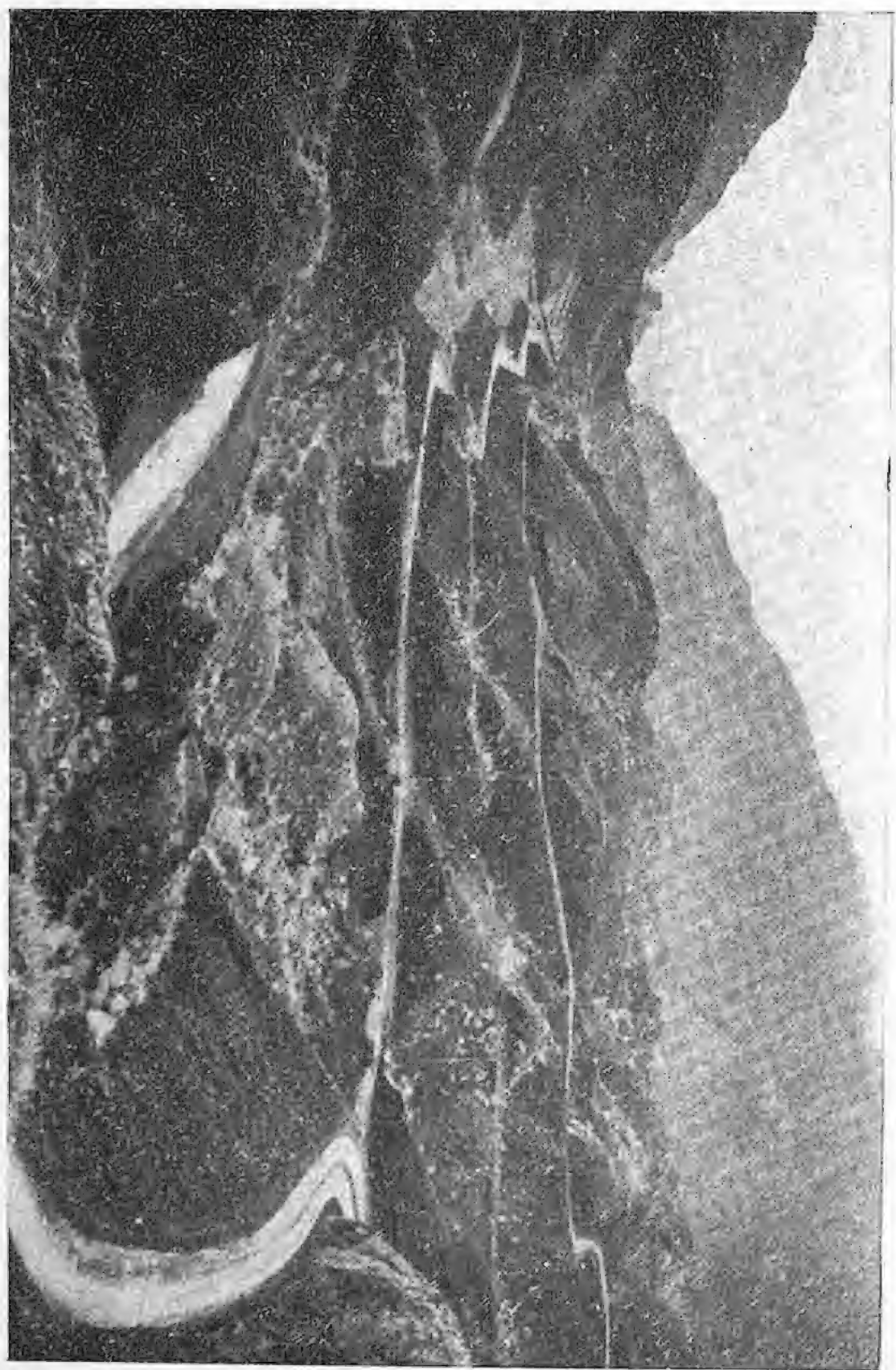


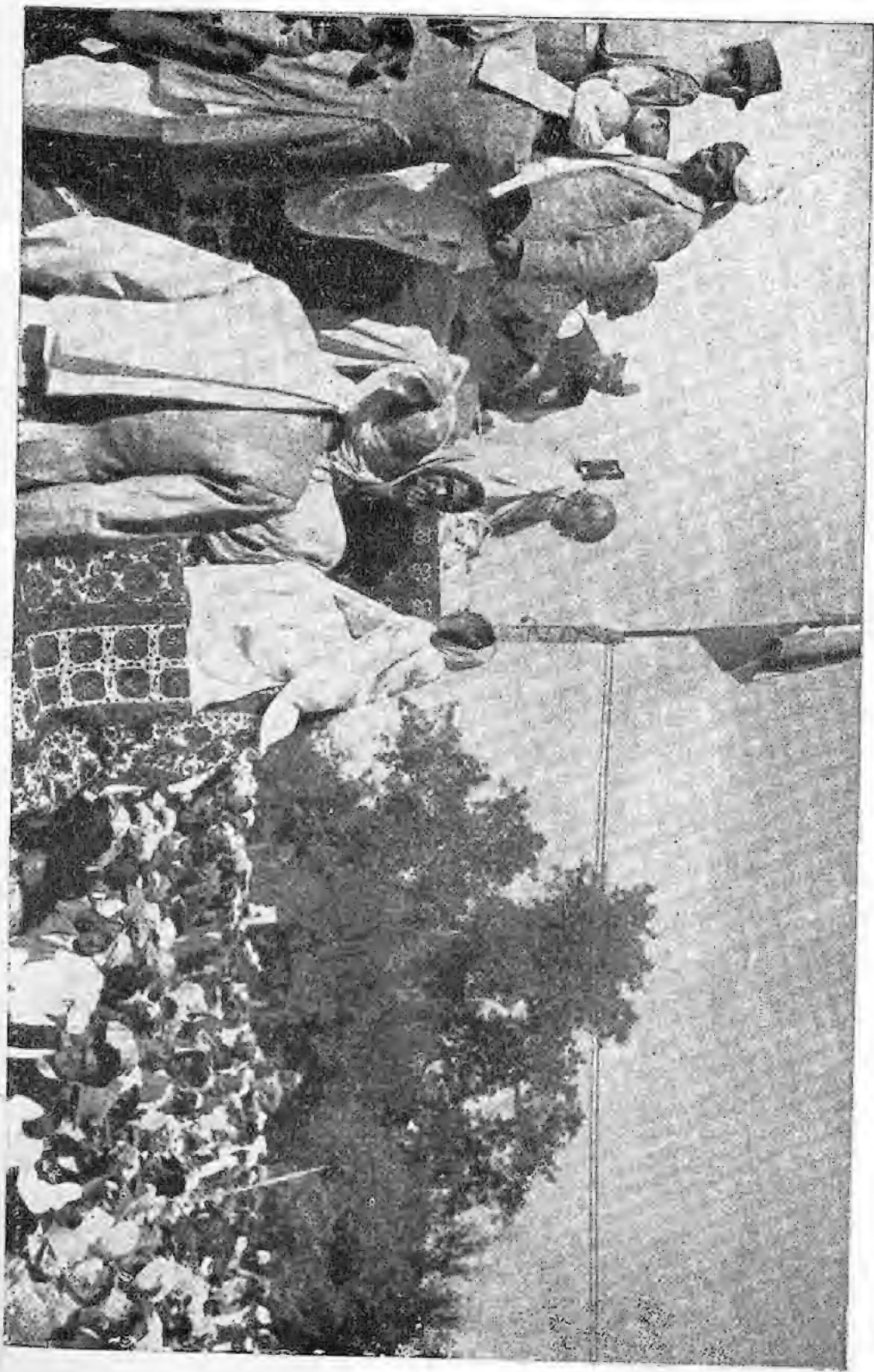


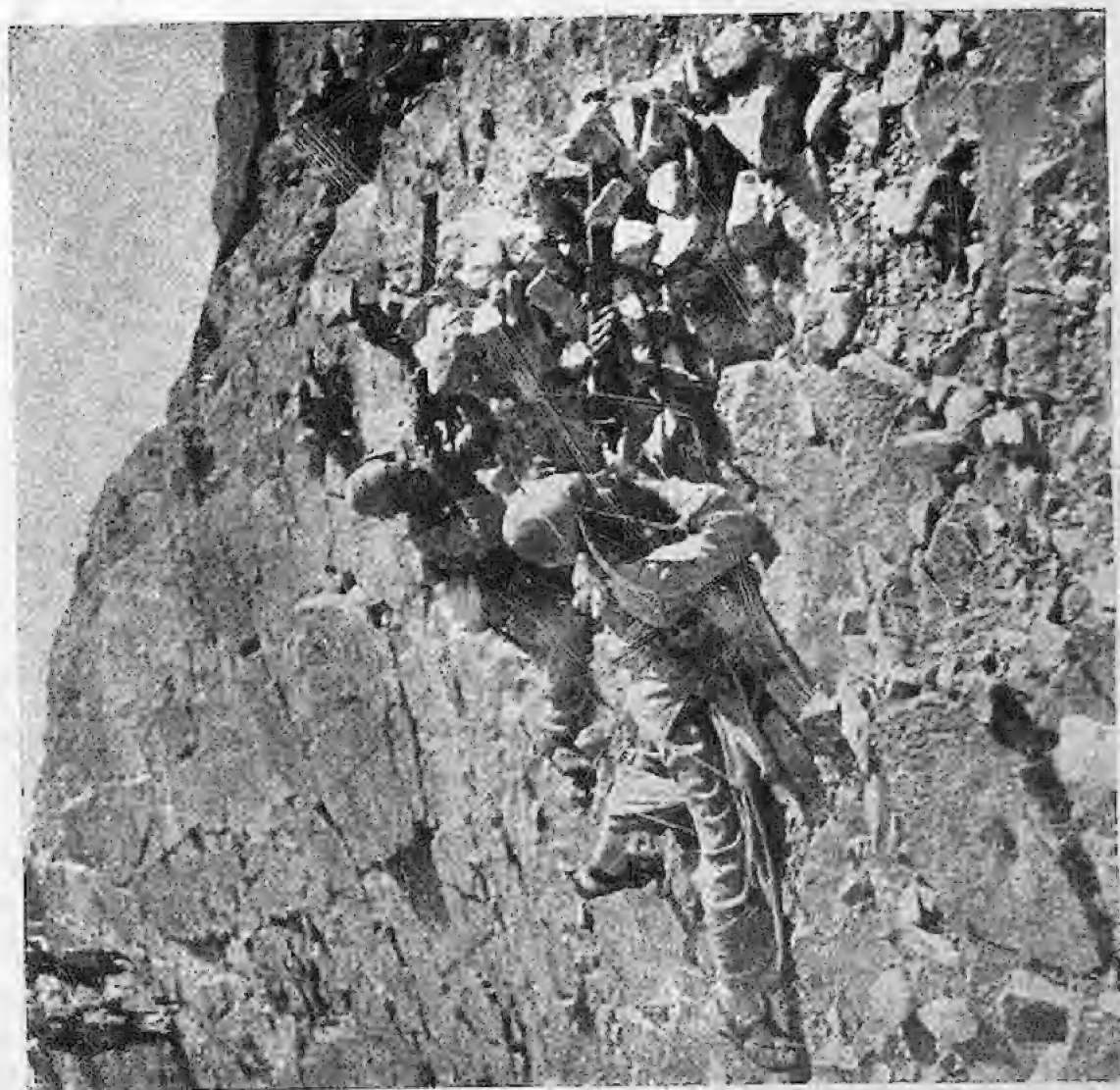


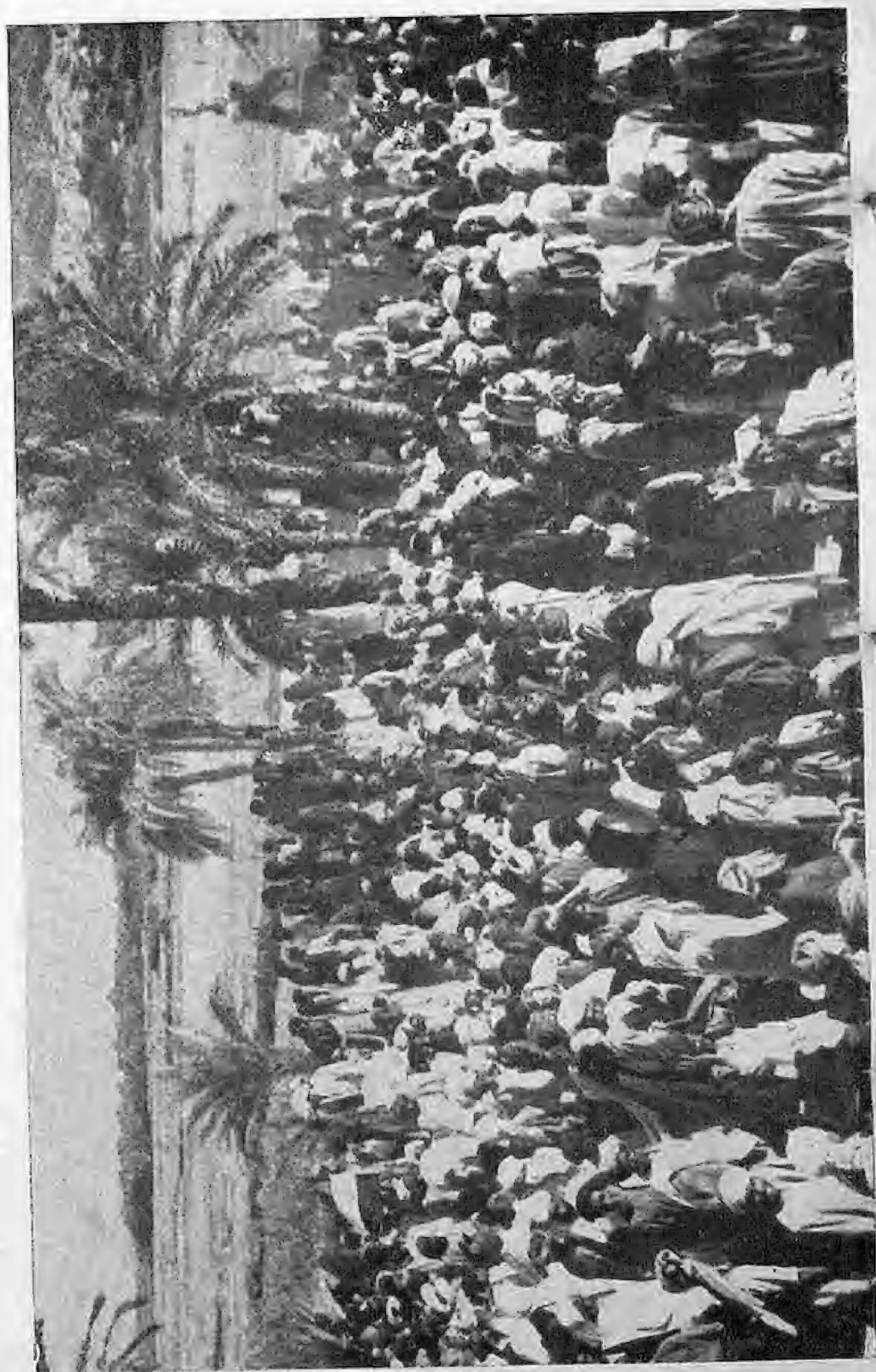










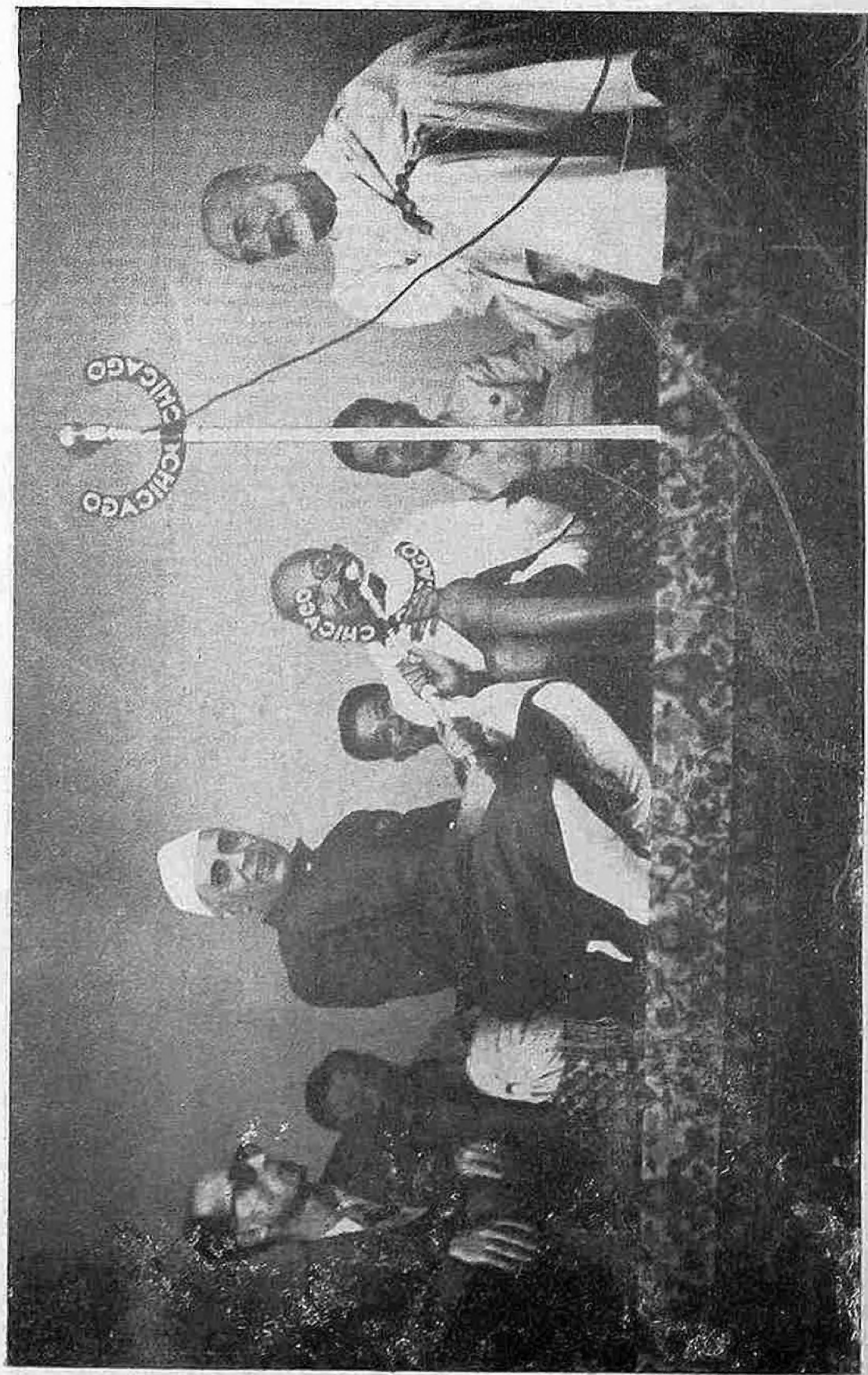












بادشاہ خاں کے اس خط کی عکسی تصویر جو موصوف نے امن
پسنلوونگی کانفرنس بمقام شانتی نکیتن و سیوا گرام (دسمبر سنہ
۱۹۴۹ء) کے دعوت نامہ کے جواب میں بھیجا تھا۔

Form No. 2
(One Part of the Punjab Criminal Justice Code 1943)
Name of Prisoner Hiralal Bhatta Montagu, Central Jail W. Punjab
Full name of address and relationship of addressee and of any other
mentioned in this letter Hiralal Bhatta, org. Secretary,
World Pacific Meeting, 1 Upper, Beach Street,
Calcutta-16, INDIA
To be completed here
ہیرا لال بھٹا
۱۹۴۹ء کا خط
۱۵ نومبر ۱۹۴۹ء کا خط
۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کا خط
۱۵ نومبر ۱۹۴۹ء کا خط
۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کا خط
Signature of reporting officer [Signature] Name of Prisoner Hiralal Bhatta
Censored and passed.
[Signature]
For Deputy Inspector General of Prisons,
P. E. C. D. W. Punjab
11/1/50

ہیرا لال جی، آپ کا ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۴۹ء کا خط مجھے ۸ دسمبر سنہ
۱۹۴۹ء کو ملا۔ شکریہ۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں قید ہوں اور آپ
لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنے سے معذور ہوں

